سوانح مفکر اسلام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

"کاروان زندگی" اور دوسرے مستند مآخذ
کی روشنی میں
امام العصر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ
کے سوانح حیات، امتیازات و کمالات اور صفات و اخلاق
کا ایک جامع اور مختصر مرقع

www.abulhasanalinadwi.org

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ناشر
سید احمد شہید اکیڈمی
دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

طبع دوم

محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

نام کتاب : سوانح مفکر اسلام (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

نام مرتب : بلال عبدالحی حسنی ندوی

کمپوزنگ : طارق اشرف (ایپروچ کمپیوٹرز، لکھنؤ) موبائل : ۹۴۱۵۵۷۹۰۲۶

صفحات : ۵۵۲

تعداد اشاعت : ۱۰۰۰

: ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بکڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

www.abulhasanalinadwi.org

فہرس

پیش لفظ ۱۵
حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی
مقدمہ ۲۱
حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب ندوی
عرض مرتب ۳۱

پہلا باب
اصلاح وتجدید کی مختصر تاریخ، مغربی تہذیب کی یلغار، اسکے دفاع کی ابتدائی کوششیں، حضرتؒ کا تجدیدی کارنامہ اور حضرتؒ کی سیرت کی تشکیل وتعمیر کے بنیادی عناصر
(۳۳ - ۴۴)

(۱) اصلاح وتجدید کی تاریخ پر ایک نگاہ ۳۳
(۲) عالم اسلام پر مغرب کی یلغار اور اس کے دفاع کی ابتدائی کوششیں ۳۶
(۳) حضرتؒ کا اصل تجدیدی کارنامہ ۳۸
(۴) عالم اسلام کیلئے مرکز اتصال ووحدت ۴۰
(۵) مقبولیت کا راز اور ظاہری طور پر اسکے تکوینی عناصر ۴۱

دوسرا باب
خاندان، جد امجد، والد ماجد، والدہ صاحبہ اور برادر معظم
(۴۵ - ۷۷)

(۱) سیرت سازی میں خاندان اور قریبی اجداد کی اہمیت ۴۵
(۲) خاندان ۴۶
(۳) جد امجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ ۵۰
(۴) جد مادری حضرت سید شاہ ضیاء النبیؒ ۵۲
(۵) والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ ۵۲
(۶) والدہ صاحبہ مرحومہ ۵۶
(۷) برادر اکبر مولانا حکیم سید عبد العلی حسنیؒ ۶۸

www.abulhasanalinadwi.org

تیسرا باب

ولادت وطفولیت اور ابتدائی تعلیم وتربیت

(۷۸ - ۹۸)

(۱) ولادت ۷۸

(۲) بچپن کے واقعات ۷۸

(۳) تعلیم کا آغاز ۸۴

(۴) باقاعدہ تعلیم ۸۵

(۵) کتابی شوق اور خاندانی ذوق...... ۸۶

(۶) والد صاحبؒ کی شفقت وتوجہ.... ۹۰

(۷) والد صاحبؒ کی وفات اور برادر معظم کی آغوش تربیت میں ۹۴

(۸) تکیہ کا عبوری قیام اور والدہ صاحبہ کی تربیت ۹۴

(۹) لکھنؤ میں نواب نورالحسن خاں صاحب کی کوٹھی پر قیام ۹۶

چوتھا باب

تعلیم کی تکمیل، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دیوبند ولاہور کا قیام، حضرت خلیفہ صاحب سے بیعت اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں تعلیم سلوک

(۹۹ - ۱۳۵)

(۱) عربی تعلیم کی ابتداء اور شیخ خلیل عرب کی خدمت میں ۹۹

(۲) شیخ خلیل عربؒ کے درس کی خصوصیات اور حضرتؒ سے ان کا تعلق خاطر ۱۰۱

(۳) استاذ کی عظمت ومحبت کی نادر مثال.. ۱۰۵

(۴) بعض دوسرے اساتذہ سے استفادہ ۱۰۷

(۵) اردو زبان وادب کا ذوق..... ۱۰۸

(۶) اس زمانہ کے بعض اہم واقعات اور دلچسپیاں ۱۱۰

(۷) ندوۃ العلماء کا اجلاس کانپور اور اس میں شرکت ۱۱۱

(۸) لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ اور اس کی بعض حکمتیں ۱۱۲

(۹) لاہور کا تاریخی سفر ۱۱۳

(۱۰) انگریزی تعلیم کا انہماک اور والدہ صاحبہؒ کی پریشانی............. ۱۱۴

(۱۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء میں.... ۱۱۶

(۱۲) حضرت مولانا حیدر حسن خاںؒ کے درس حدیث میں ۱۱۷

(۱۳) علامہ تقی الدین ہلالیؒ سے زبان و ادب کی تکمیل ۱۱۹

(۱۴) ڈاکٹر صاحبؒ کی تعلیم وتربیت کے انداز اور حضرتؒ کی مضمون نگاری.......... ۱۱۹

(۱۵) اصلاح باطنی اور تعلق مع اللہ ۱۲۳

www.abulhasanalinadwi.org

(۱۶) قدیم مکان میں دوبارہ قیام اور حضرت مدنیؒ سے تعارف واستفادہ ۱۲۵

(۱۷) حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے تعلق، استفادہ واسترشاد ۱۲۶

(۱۸) حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوریؒ سے بیعت ۱۳۰

(۱۹) دیوبند کا قیام ۱۳۰

(۲۰) لاہور کا سفر اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری صاحبؒ سے درس کی تکمیل ۱۳۲

(۲۱) لاہور کا دوبارہ سفر اور شاہی مسجد میں قیام ۱۳۴

پانچواں باب

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں باضابطہ تدریس کے دس سال، سیرت سیّد احمد شہید کی تصنیف، نصاب تعلیم کی ترتیب نو اور دیگر اہم حوادث وواقعات

(۱۳۶ - ۱۷۰)

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء سے باضابطہ تعلق ۱۳۶

(۲) ذہنی وفکری ہم آہنگی ۱۳۹

(۳) تدریس وتعلیم کا آغاز اور دارالعلوم میں قیام ۱۴۰

(۴) دارالعلوم کا ادبی وفکری رنگ ۱۴۱

(۵) رشتۂ ازدواج ۱۴۴

(۶) تعلیم وتدریس میں حضرت کی دل سوزی اور محنت ۱۴۵

(۷) سفر بمبئی اور ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوتِ اسلام ۱۴۶

(۸) دو اہم واقعات ۱۴۹

(۹) حضرت سید احمد شہیدؒ کی ذات سے شغف وتعلق اور سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف کا آغاز ۱۵۱

(۱۰) دارالعلوم میں مالی بحران اور اس کیلئے فکر اور بعض اسفار ۱۵۵

(۱۱) حضرت تھانویؒ کی لکھنؤ تشریف آوری اور انکی مجالس میں شرکت ۱۵۶

(۱۲) لاہور کا سفر اور علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات ۱۵۶

(۱۳) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیلئے دینیات کی ایک کتاب کی ترتیب اور وہاں کا قیام ۱۵۹

(۱۴) مسلم لیگ اور خاکسار تحریک کا زور اور حضرتؒ کا اس پر تنقیدی مضمون ۱۵۹

(۱۵) سیرت سید احمد شہیدؒ کی طباعت اور اس کی مقبولیت ۱۶۰

www.abulhasanalinadwi.org

(۱۶) سید صاحبؒ کی رفاقت میں ایک
تاریخی سفر ۱۶۲
(۱۷) رسالہ ''الندوۃ'' کا اجراء ۱۶۳
(۱۸) عربی زبان وادب کی نئی کتابوں کی
ترتیب ۱۶۴
(۱۹) مختارات..................... ۱۶۵
(۲۰) القراءۃ الراشدۃ اور قصص النبیین
۱۶۵...............................
(۲۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی
۱۶۷ ....

چھٹا باب

دعوتی واصلاحی کوششوں کا آغاز، دعوت فکر ونظر سے لیکر عملی جدوجہد تک

(۱۶۸ - ۱۹۰)

(۱) دعوتی واصلاحی فکر ۱۶۸
(۲) مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ سے
تعارف وارتباط اور پنجاب وبلوچستان
کا ایک تاریخی سفر ۱۷۱
(۳) دینی مرکزوں کا دورہ اور حضرت
رائپوری سے پہلی ملاقات... ۱۷۲
(۴) جماعت اسلامی میں شرکت اور اس
سے علاحدگی ۱۷۵
(۵) جامعہ ملیہ میں مذہب وتمدن پر مقالہ
۱۷۷ ....
(۶) خوددار ضمیر اور حساس دل پر ایک
چوٹ ۱۷۸
(۷) ادارۂ تعلیمات اسلام کا قیام اور درس
قرآن کا سلسلہ ۱۷۹
(۸) عربی زبان میں دعوتی وفکری مضامین
کا آغاز ۱۸۱
(۹) ایک انقلاب انگیز کتاب کی تالیف
۱۸۳ ....
(۱۰) تھانہ بھون کی حاضری........۱۸۸

ساتواں باب

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت سے تعلق وارتباط، تبلیغی مساعی اور حضرت مولانا کے بعد حضرت کا طرزِ فکر اور موقف

(۱۹۱ - ۲۱۸)

(۱) حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی
خدمت میں پہلی حاضری ۱۹۱
(۲) لکھنؤ میں کام کا آغاز اور اس کے
ثمرات ۱۹۴
(۳) حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی
دارالعلوم میں آمد........... ۱۹۵
(۴) حضرتؒ پر خصوصی شفقت وتوجہ
۱۹۶ ....
(۵) تبلیغ ودعوت میں انہماک.... ۱۹۸

www.abulhasanalinadwi.org

(۶) پشاور کا ایک تاریخی سفر...... ۲۰۰
(۷) صوبہ سرحد کا دورہ ۲۰۲
(۸) سفر پر سفر ۲۰۴
(۹) حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی علالت اور وفات ۲۰۵
(۱۰) حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرتؒ کا موقف، طریق فکر اور عملی جدوجہد..... ۲۰۷
(۱۱) ریاضت ومجاہدہ کا دور......... ۲۱۱
(۱۲) دوہری آزمائش ۲۱۳
(۱۳) ایک مبارک قافلہ کی دائرہ شاہ علم اللہ آمد ۲۱۴
(۱۴) حیدر آباد کا سفر اور مولانا گیلانیؒ سے ربط وتعلق ۲۱۴
(۱۵) رمضان میں نظام الدین کا قیام اور حضرت رائے پوریؒ کی خدمت میں ۲۱۵ ....
(۱۶) حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی طرف سے اجازت وخلافت اور خصوصی شفقت ومحبت ۲۱۶

آٹھواں باب

اسفار حج اور عربوں میں دعوت وتبلیغ کا باقاعدہ آغاز، اور اس کی کوششیں

(۲۱۹ - ۲۴۷)

(۱) إلىٰ ممثلي البلاد الاسلامية کی تصنیف ۲۱۹
(۲) پہلا سفر حج اور وہاں دعوتی کوششوں کا آغاز ۲۲۰
(۳) قیام حجاز میں پیام حجاز........۲۲۴
(۴) امیر سعود کے نام ایک تاریخی مکتوب ۲۲۶ ....
(۵) عربوں میں دعوت کا جذبہ وفکر اور اس کی کوششیں ۲۲۷
(۶) دوسرا سفر حج............. ۲۲۹
(۷) عز وشرف کا مبارک دن..... ۲۳۱
(۸) تعلیم یافتہ طبقہ پر خصوصی توجہ اور ان کا تاثر.......................۲۳۳
(۹) سفر مصر ۲۳۸
(۱۰) سوڈان میں.................. ۲۴۱
(۱۱) شام کا سفر ۲۴۳
(۱۲) حضرت مدنیؒ کا ایک تاریخی مکتوب ۲۴۶ ....

نواں باب

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی محبت وشفقت، خدمت واجازت، اندرون ملک دینی وملی خدمات اور اس کیلئے حضرت کا درد وسوز، دینی تعلیمی کونسل اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا قیام، ڈاکٹر عبدالعلی کی وفات، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے اہم حوادث وواقعات

(۲۴۶ - ۲۸۲)

www.abulhasanalinadwi.org

(۱) حضرت رائے پوریؒ کی غایت درجہ شفقت ومحبت اور حضرتؒ کو اجازت وخلافت ۲۴۸
(۲) حضرت رائے پوریؒ کے دو یادگار مکاتیب ۲۵۲
(۳) اندرون ملک ملی تحفظ کی فکر اور اس کی کوششیں........ ۲۵۲
(۴) ندوۃ العلماء کی رکنیت ومعتمدی، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی وفات اور دار العلوم میں ان پر سیمینار ... ۲۵۴
(۵) مخلوط اجتماعات ۲۵۵
(۶) دار العلوم دیوبند میں پہلی تقریر ۲۵۶
(۷) قیام پاکستان کے بعد دو سفر. ۲۵۹
(۸) تاریخ دعوت وعزیمت کی تصنیف ۲۶۰
(۹) دمشق یونیورسٹی میں محاضرات کا سلسلہ ۲۶۳
(۱۰) شیخ حارون العسل الحجار سے ملاقات ۲۶۶
(۱۱) لبنان وترکی کا سفر........ ۲۶۸
(۱۲) شام کے قیام کے آخری دن.. ۲۶۹
(۱۳) بغداد میں ۲۷۱
(۱۴) بخاری شریف کا درس ۲۷۲
(۱۵) القادیانی و القادیانیة کی تالیف ۲۷۲
(۱۶) ’’مجلس تحقیقات ونشریات اسلام‘‘ کا قیام...۲۷۴
(۱۷) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں حضرتؒ کا موقف اور اسکے کے تحفظ کی فکر وکوشش ۲۷۵
(۱۸) برما کا سفر ۲۷۸
(۱۹) دینی تعلیمی کونسل کا قیام...... ۲۷۹
(۲۰) برادر معظم مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کی وفات........ ۲۷۹
(۲۱) نظامت کے لئے انتخاب اور کویت کا ایک سفر ۲۸۰

دسواں باب

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا قیام، والدہ صاحبہ کی وفات، تحریک پیامِ انسانیت اور پرسنل لا بورڈ کی تاسیس، ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۵ء تک اہم اسفار وواقعات اور حوادث
(۲۸۳ - ۳۱۹)
(۱) جامعہ اسلامیہ اور رابطۂ عالم اسلامی کا قیام اور حضرت کا بحیثیت رکن تاسیسی کے انتخاب ۲۸۳
(۲) جامعہ اسلامیہ میں محاضرات کا سلسلہ.. ۲۸۴
(۳) دو عظیم حادثے ۲۸۶
(۴) یورپ کا پہلا سفر........ ۲۸۷
(۵) الہ آباد کا ایک سفر اور شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خصوصی عنایت ومحبت..........۲۸۹

www.abulhasanalinadwi.org

(٦) مسلم مجلس مشاورت کا قیام... ۲۹۰
(۷) حضرت کا ایثار وقربانی....... ۲۹۲
(۸) مختلف علاقوں کے دورے... ۲۹۳
(۹) حجاز مقدس کا سفر............ ۲۹۴
(۱۰) صبر وعزیمت کے دن ۲۹۴
(۱۱) بعض اہم کتابوں کی تصنیف.. ۲۹۵
(۱۲) والد مرحوم کی تصنیفات کی تکمیل و اشاعت ۲۹۲
(۱۳) قومیت عربیہ کا فتنہ اور اسکی سرکوبی ۲۹۹
(۱۴) بعض اہم بیرونی اسفار ۳۰۲
(۱۵) انگلستان کا ایک طویل سفر.... ۳۰۳
(۱۶) سفر حیدرآباد ۳۰۴
(۱۷) قدر جوہر شاہ داند ۳۰۵
(۱۸) والدہ صاحبہؒ کی وفات ۳۰۶
(۱۹) دارالعلوم میں قیام ۳۰۷
(۲۰) تحریک پیام انسانیت ۳۰۸
(۲۱) ہتھورا اور ناگور کا ایک سفر ۳۱۱
(۲۲) مشرقی پاکستان میں لسانی وتہذیبی تعصب کا طوفان اور حضرتؒ کی ایک اہم تقریر.................. ۳۱۱
(۲۳) مسلم پرسنل لا بورڈ کی تأسیس... ۳۱۲
(۲۴) افغانستان وایران کا ایک سفر.. ۳۱۳
(۲۵) لبنان میں ۳۱۵
(۲۶) عجیب واقعہ ۳۱۶
(۲۷) بغداد میں ۳۱۶
(۲۸) سفر کی آخری منزل ۳۱۷
(۲۹) زندگی کا ایک پراثر منظر ۳۱۸
(۳۰) خلیج کے دو سفر ۳۱۸
(۳۱) شاہ فیصلؒ کی شہادت اور حضرتؒ کا تأثر ۳۱۹

گیارہواں باب

دارالعلوم ندوۃ العلماء حضرتؒ کے چالیس سالہ دور نظامت میں اہم واقعات، تاریخی اجلاس اور ترقیات

(۳۲۰ - ۳۴۱)

(۱) نظامت سے پہلے.......... ۳۲۰
(۲) ابتدائی دور نظامت......... ۳۲۱
(۳) پچاسی سالہ جشن تعلیمی ۳۲۵
(۴) اجلاس کے قریبی اور فوری محرکات ۳۲۵
(۵) بعض دشواریاں ۳۲۷
(۶) چار روزہ اجلاس کی مختصر روداد ۳۲۸
(۷) امام حرم شیخ عبد العزیز کی آمد.. ۳۳۲
(۸) ادب اسلامی پر عالمی سیمینار.....۳۳۳
(۹) دارالعلوم میں رابطۂ ادب اسلامی کے اجلاس ۳۳۵
(۱۰) امام حرم اور رابطۂ عالم اسلامی کے

www.abulhasanalinadwi.org

جنرل سکریٹری کی آمد.........۳۳۷

(۱۱) دارالعلوم پر پولیس کا چھاپہ اور اس پر ردِّعمل ۳۳۷

(۱۲) ''ردقادیانیت'' پر ایک عالمی تاریخی اجلاس.................... ۳۳۹

بارہواں باب

۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک اہم حوادث و واقعات، اسفار و تقاریر

(۳۴۱ - ۳۷۷)

(۱) ملک میں ایمرجنسی اور ظلم و زیادتی ۳۴۲

(۲) وزیراعظم سے حضرتؒ کی ملاقات اور آگاہی اور صدر موریتانیہ سے ملاقات ۳۴۳

(۳) حضرتؒ کی قیام گاہ رائے بریلی میں اندرا گاندھی کی آمد.......... ۳۴۵

(۴) چندریشیکھر اور اٹل بہاری باجپئی کی دارالعلوم آمد اور حضرت سے ملاقات ۳۴۵

(۵) السیرة النبویة کی تالیف..۳۴۶

(۶) چند اہم وفیات............ ۳۴۸

(۷) مغرب اقصیٰ مراکش میں.... ۳۵۰

(۸) امریکہ کا پہلا سفر......... ۳۵۱

(۹) آنکھ کا آپریشن ۳۵۲

(۱۰) پاکستان کا سفر ۳۵۴

(۱۱) بعض اہم حادثات ۳۵۶

(۱۲) حکومت سعودی عرب کے ذمہ داروں کے نام ایک اہم تحریری یادداشت............... ۳۵۷

(۱۳) حرم میں ایک ناشدنی واقعہ ..۳۵۸

(۱۴) عالمی سیرت کانفرنس اور حضرتؒ کی الہامی تقریر............... ۳۵۹

(۱۵) فیصل ایوارڈ اور حضرتؒ کا زہد و استغناء ۳۶۰

(۱۶) دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس اور حضرت کی تاریخی تقریر... ۳۶۳

(۱۷) بارہ دری کا اجلاس پیام انسانیت ۳۶۴

(۱۸) حجاز کے دو سفر اور یاسر عرفات کے سامنے ایک اہم تقریر ۳۶۵

(۱۹) کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ایک علمی اعزاز............... ۳۶۷

(۲۰) اہم خاندانی حادثہ.......... ۳۶۹

(۲۱) دارالمصنّفین کا اسلام و مستشرقین پر سیمینار ۳۷۰

(۲۲) حضرت شیخ الحدیثؒ کا سانحۂ وفات ۳۷۰

(۲۳) الجزائر کا سفر ۳۷۲

(۲۴) سری لنکا کا سفر ۳۷۲

www.abulhasanalinadwi.org

(۲۵) بیروت کا المیہ ۳۷۳
(۲۶) حضرت کی صدارت میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کا قیام ۳۷۴
(۲۷) امارات وکویت کا دورہ ۳۷۵
(۲۸) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کیلئے انتخاب ۳۷۶

تیرہواں باب

۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۹ء تک اہم واقعات، اسفار، تحفظ ملت کی اہم کوششیں اور بعض اہم وفیات

(۳۷۸ - ۴۰۷)

(۱) بنگلہ دیش کا پہلا سفر ۳۷۸
(۲) شرق اردن کا سفر ۳۷۹
(۳) حضرتؒ کی صدارت میں رابطۂ ادب اسلامی کا قیام............. ۳۸۰
(۴) یمن میں ۳۸۱
(۵) ہندواحیائیت کا طوفان، اندرا گاندھی کے نام حضرتؒ کا تاریخی مکتوب اور ان کا قتل ۳۸۴
(۶) حجاز مقدس کا ایک سفر اور حضرتؒ کے اعزاز میں استقبالیہ ۳۸۵
(۷) یورپ کا سفر ۳۸۶
(۸) کلکتہ کا اجلاس پرسنل لا بورڈ . ۳۸۷
(۹) حضرت کی قیادت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاریخ ساز کامیابی ۳۸۷
(۱۰) ترکی میں رابطہ ادب اسلامی اجلاس ۳۹۱
(۱۱) لندن اور الجزائر کا ایک سفر.. ۳۹۲
(۱۲) مولانا محمد عمران خاں صاحبؒ کی وفات اور بھوپال کا تعزیتی سفر...... ۳۹۲
(۱۳) دہلی، ناگپور اور پونہ کے ڈائیلاگ ۳۹۳
(۱۴) رابطۂ ادب اسلامی سیمینار ۳۹۵
(۱۵) ملیشیا کا پہلا سفر ۳۹۵
(۱۶) دو متضاد تصویریں ۳۹۶
(۱۷) شدید علالت اور فضل الٰہی.... ۳۹۷
(۱۸) لندن اور کویت کا سفر ۳۹۸
(۱۹) سفر حجاز اور رابطہ کی عالم اسلامی کانفرنس میں شرکت.................. ۳۹۹
(۲۰) جامعہ سلفیہ بنارس کے سیمینار میں شرکت...................... ۴۰۰
(۲۱) ۱۹۸۸ء کے اہم واقعات ۴۰۰
(۲۲) حجاز مقدس اور خلیج کا سفر ۴۰۲
(۲۳) جلسۂ پیام انسانیت حیدرآباد و اجلاس مسلم پرسنل لا بورڈ کانپور ... ۴۰۳
(۲۴) ترکی اور انگلستان کا سفر ۴۰۳
(۲۵) تحفظ ملت کی فکر اور اس کی کوششیں ۴۰۵

www.abulhasanalinadwi.org

(۲۶) اہلیہ صاحبہؒ کی وفات......... ۴۰۶

چودھواں باب

۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک اہم واقعات، حوادث، اسفار اور ملی و دینی خدمات و اعزازات

(۴۰۸ - ۴۳۳)

(۱) حجاز مقدس کا سفر............ ۴۰۸
(۲) اندرون ملک بعض اہم جلسوں میں شرکت اور مدراس کا ایک سفر.. ۴۰۹
(۳) وزیر اعظم سے ملاقات ۴۱۰
(۴) بمبئی و بنگلور کا سفر........... ۴۱۱
(۵) جلسۂ پیام انسانیت لکھنؤ...... ۴۱۲
(۶) عراق کا کویت پر حملہ اور حضرتؒ کا موقف ۴۱۲
(۷) حجاز مقدس کا سفر ۴۱۴
(۸) رائے بریلی میں حمد و مناجات کے موضوع پر سیمینار، کڑہ کا سفر.. ۴۱۵
(۹) بابری مسجد کا مسئلہ اور ماہ دسمبر کے متفرق واقعات ۴۱۶
(۱۰) ۱۹۹۱ء کے اہم حوادث و واقعات ۴۱۸
(۱۱) حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ کا حادثۂ وفات ۴۲۰
(۱۲) بعض اہم اسفار و واقعات... ۴۲۰
(۱۳) پدم بھوشن کا اعزاز اور حضرتؒ کا استغناء ۴۲۱
(۱۴) انگلستان کا سفر............. ۴۲۲
(۱۵) ہندوستان کی تاریخ کا عظیم حادثہ ۴۲۲
(۱۶) عالمی سطح پر حضرت کی فکر و تشویش ۴۲۳
(۱۷) پٹنہ کا سفر.................. ۴۲۴
(۱۸) ایک طویل بیرونی سفر....... ۴۲۴
(۱۹) جے پور اور ٹونک کا سفر..... ۴۲۵
(۲۰) بخارا اور سمرقند کا سفر......... ۴۲۵
(۲۱) بنگلہ دیش کا سفر اور رابطۂ ادب اسلامی کے جلسہ میں شرکت......... ۴۲۷
(۲۱) ۱۹۹۴ء بعض اہم واقعات و اسفار ۴۲۷
(۲۲) بیرونی ممالک کا ایک سفر.... ۴۲۸
(۲۳) بعض جلسوں میں شرکت اور جنوبی ہند کے سفر............. ۴۲۹
(۲۴). قطر کا سفر.................. ۴۳۰
(۲۵) ''یکساں سول کوڈ'' کے نفاذ کا مطالبہ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کا احتجاجی جلسہ ۴۳۱
(۲۶) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا جلسۂ احمد آباد ۴۳۲

www.abulhasanalinadwi.org

پندرہواں باب

۱۹۹۶ء سے علالت تک اہم حالات،
حوادیث وواقعات اور اسفار
(۴۳۴ - ۴۵۶)

(۱) سفرحجاز ۴۳۴
(۲) ماہ مبارک اور دو اہم خاندانی حادثے ۴۳۵
(۳) جنوبی ہند کا سفر اور وزیر اعظم کی دار العلوم آمد ۴۳۶
(۴) ایک طویل بیرونی سفر اور ترکی میں حضرتؒ کے اعزاز میں ایک عالمی سیمینار ۴۳۷
(۵) اندرون ملک بعض اسفار..... ۴۳۹
(۶) سفر حجاز اور ایک عظیم شرف واعزاز ۴۳۹
(۷) اتحاد ملت کی فکر ۴۴۲
(۸) والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ کی شخصیت پر لکھنؤ میں ایک سیمینار..................... ۴۴۳
(۹) چند اہم وفیات.............. ۴۴۳
(۱۰) رابطۂ ادب اسلامی کے دو اہم اجلاس ۴۴۴
(۱۱) سفرحجاز..................... ۴۴۵
(۱۲) جنوبی ہند کا ایک طویل سفر ... ۴۴۷
(۱۳) عمان اور حرمین شریفین کا سفر. ۴۴۸
(۱۴) بعض اسفار اور اہم تقاریب اور جلسوں میں شرکت ۴۴۹
(۱۵) سرکاری اسکولوں میں ''وندے ماترم'' کا نفاذ اور حضرتؒ کی فکر وتشویش ۴۵۰
(۱۶) ایک الہامی بیان اور فتنہ کا سد باب ۴۵۱
(۱۷) حضرتؒ کے مکان پر چھاپہ اور ملک و بیرون ملک اس کا سخت رد عمل ۴۵۱
(۱۸) حضرتؒ کی زندگی کا آخری بیرونی سفر اور ایک عالمی اعزاز ۴۵۲
(۱۹) زندگی کا آخری سفر........ ۴۵۴

سولہواں باب

علالت سے وفات تک
(۴۵۷ - ۴۸۷)

(۱) علالت کا شدید حملہ اور حضرتؒ کی عزیمت ۴۵۷
(۲) علالت پر عمومی تأثر، دعاؤں کا اہتمام اور مرض میں تخفیف......... ۴۶۰
(۳) رجوعِ عام..................... ۴۶۱
(۴) تبلیغی اجتماع میں حضرتؒ کی آخری تقریر ۴۶۳

www.abulhasanalinadwi.org

(۵) ''کاروان زندگی'' کے سلسلہ کا اختتام اور اس کی آخری جلد کی تکمیل واشاعت ۴۶۴
(۶) دورانِ علالت اہم وفیات .. ۴۶۵
(۷) دارِ عرفات میں حضرتؒ کی آخری تقریر.................. ۴۶۷
(۸) سلطان برونائی ایوارڈ ۴۶۷
(۹) مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس بمبئی میں حضرتؒ کا آخری خطبۂ صدارت ۴۶۸
(۱۰) لقائے رب کا شوق ۴۷۰
(۱۱) رمضان المبارک میں دار العلوم کا قیام .... ۴۷[illegible]
(۱۲) دائرۂ شاہ علم اللہ کے دو دن .. ۴۷۳
(۱۳) جوارِ رحمت میں ۴۷۴
(۱۴) عالمی تأثر..................... ۴۷۸
(۱۵) عادات ومعمولات ۴۸۰
(۱۶) وفات کے بعد ۴۸۶

سترہواں باب

امتیازات وخصوصیات، اخلاق وصفات اور اصلاحی وتجدیدی کارناموں پر ایک نظر

(۴۸۸ - ۵۵۱)

(۱) مختلف علوم میں امتیازی شان. ۴۸۸
(۲) تفسیر ۴۸۸
(۳) حدیث ۴۹۲
(۴) ادب........................ ۴۹۴
(۵) تاریخ ۴۹۶
(۶) فقہی بصیرت اور وسعتِ قلب ونظر ۴۹۷
(۷) وسعتِ فکر اور ذہن کی آفاقیت ۵۰۰
(۸) اعتدال وتوازن.............. ۵۰۱
(۹) بصیرتِ ایمانی............... ۵۰۴
(۱۰) دردمندی ودل سوزی ۵۰۶
(۱۱) حمیت دینی اور جذبۂ جہاد ۵۰۹
(۱۲) طریقۂ دعوت ۵۱۱
(۱۳) طریقۂ تصنیف وتالیف ۵۱۴
(۱۴) تصوف وسلوک ۵۱۶
(۱۵) حسنِ اخلاق ۵۲۴
(۱۶) حسنِ سلوک اور صلہ رحمی ۵۲۸
(۱۷) دل آزاری سے حددرجہ اجتناب ۵۲۹
(۱۸) زہد واستغناء ۵۳۲
(۱۹) جرأت ایمانی................ ۵۳۸
(۲۰) جود وسخا.................... ۵۳۹
(۲۱) عزیمت وتوکل ۵۴۰
(۲۲) فنائیت وبے نفسی ۵۴۱
(۲۳) اخلاص وللّٰہیت ۵۴۴
(۲۴) جامعیت ۵۴۶
(۲۵) تجدیدی کارناموں پر ایک نظر..۵۴۸

www.abulhasanalinadwi.org

پیش لفظ

حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی رحمۃ اللہ علیہ
(سابق معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد لله الحكم العدل، العلي الكبير، اللطيف الخبير، السميع البصير، خالق الانسان، منزل القرآن و مجرى الفلك و مالك الملك، لهٗ الحمد علىٰ نعمائه السابقة الظاهرة و الباطنة.

والصلوٰة والسلام علىٰ رسوله محمد الرحمة المهداة و النعمة المسداة بعثهٗ الله بالآيات البيّنات و الخوارق النيّرات فقام بتبليغ الرسالة و نهض بتبيين الوحي، فدلّ الناس علىٰ سبيل النجاة و تركهم على المحجّة البيضاء، و رضي الله عن آلهٖ الأطهار الأخيار و أصحابه أساتذة البشريّة الأبرار رهبان الليل فرسان بالنهار حملوا الرسالة و أدّوا الأمانة علىٰ الوجه الأكمل و النهج الأشمل.

ورحم الله علىٰ أتباعهم الأوفياء الصادقين فى الوفاء و الولاء الذين ضحّوا بكُلِّ رخيص و غالٍ فى خدمة دين الله الحنيف، ذوي الغيرة علىٰ الحق، الدعاة إلىٰ الإسلام الأحياء و الأتقياء و قد جعلهٗ الله من عبادهٖ الذين ارتضاهم لحبِّهٖ و لحُبّ دينهٖ فوضع لهم القبول و

www.abulhasanalinadwi.org

الرضاء فی الأرض و السماء.

أمّا بعد :

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ خود اسکا وجود ہے، ورنہ دنیا کا کوئی مؤرخ جس کی نگاہ میں اقوام و مذاہب کا عروج وزوال ہے اور جس نے پرشین امپائر بازنطینی اور ساسانی شہنشاہیت کے عروج واقبال اور انحطاط وزوال کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کا آوازہ جس روز پہلی مرتبہ اٹھا اسی وقت سے اس کی دشمنی اور مخالفت شروع ہوگئی، اور کڑی آزمائشوں اور سخت جفا کشیوں کے بعد یہ چراغ روشن ہوا، مگر اس دین کو لانے والے خاتم النبییّن ﷺ کی آنکھ بند ہوتے ہی ارتداد کا ایک ''پلیگ'' وبائی شکل میں پھیل گیا اور پورے پورے علاقے بے دینی کا شکار ہوگئے، اس موقع پر ایک فرد فرید حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا جن سے ارتداد کے بادل چھٹ گئے، تاریخ گواہ ہے کہ اگر اس شخصیت کو اللہ نے نہ اٹھایا ہوتا تو اسلام قصہ ماضی بن چکا ہوتا۔ اس کے بعد منافقوں اور یہودیوں کی سازشیں صحابہ کرامؓ کی صف میں رخنہ انداز ہوئیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے خلفاء راشدین کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے عابد وزاہد انسان کو پیدا کیا، جنہوں نے خلفاء راشدین کے بعد اسلام کی صحیح روح کو قائم رکھنے میں ایسا کردار پیش کیا جس نے دین کی دیوار منہدم نہ ہونے دی۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک اس عالمگیر دین کو باقی رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد پیدا کئے جو ہر دور میں سامنے آتے رہے اور اپنی سیرت وکردار کا نقش دنیا کے لئے چھوڑ گئے، اور اسی کا نام معجزہ ہے، معجزہ کا مطلب یہ نہیں کہ آسمان سے فرشتے انسانوں کی شکل میں اتر آتے یا آسمان سے موتی برسنے لگتے، دشمنوں کے سر چیر دیئے جاتے، یہ سب کچھ نہ ہوا، معجزہ یہ ہے کہ اللہ کی صفت تکوینی میں کبھی فرق نہ آیا، جنگ احد میں حضور اکرم ﷺ کی پیشانی مبارک زخمی ہوئی، آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے،

www.abulhasanalinadwi.org

آپؐ کو فقر و فاقہ، مرض وقرض کی مشکلات سے اس طرح گذارا گیا جس طرح کسی ایک بشر کو گذارا جاتا ہے، اسی بنا پر رسول کریم ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ ''ما أنا إلا بشر مثلکم ''۔ درجات بشریت ہمارے تصور سے لاکھوں درجہ بلند سہی لیکن ''اسوۂ حسنہ'' اسی ذات کا قابل عمل ہوسکتا تھا جو انسانوں کے لئے قابل عمل ہو اور جس کی راہ پر انسان چل سکے، یہی فرق ہے ایک پیغمبر اسلام میں اور دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں میں، دیوتاؤں کی کوئی نقل نہیں کرسکتا، ان کی طرح فضا میں اڑ نہیں سکتا، بے آب و دانا برسہا برس زندہ نہیں رہ سکتا، اس کو ضرورت تھی کہ ایک ایسا نمونہ اس کے سامنے آئے جس کی وہ اقتداء کرسکے، خاتم النبیین ﷺ کے بعد آپؐ کے صحابہ وتابعین واولیاء دین اسی سنت کو باقی رکھنے اور دنیا کو اس کا نمونہ دکھلانے کے لئے پیدا ہوتے رہے، اور انشاء اللہ جب تک دنیا قائم ہے اس وقت تک ہر دور میں کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اس شان کا پیدا ہوگا جو کہ نبی نہیں ہوگا، رسالت کا مدعی نہیں ہوگا بلکہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوگا اور اپنے کردار سے ایسا نمونہ پیش کرے گا جو اللہ کے لاکھوں بندوں کے لئے ایک نمونہ چھوڑ جائے گا۔

میں اس ملک اور دوسرے ممالک میں پیدا ہونے والے بزرگان سلف کی عظمتوں سے واقف ہوں اور کسی کی غیرت وعزیمت میں ادنیٰ درجہ کی تنقیص گناہ سمجھتا ہوں اور نہ میری یہ حیثیت ہے کہ میں ان کے درمیان گروپ بندی کروں اور یہ کہوں کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور دوسرے حاملین شریعت میں کون بڑا تھا اور کون چھوٹا تھا۔ یہ بات بے ادبی کی بھی ہے اور بے عقلی کی بھی، بے عقلی کی اس لئے کہ وہی شخص ایک کو دوسرے سے افضل اور ممتاز بتا سکتا ہے جو ان دونوں سے یا ان سبھوں سے بلند ہو۔

ہمارے سامنے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک ایک صفحہ کھلا ہوا ہے، اللہ

www.abulhasanalinadwi.org

تعالیٰ کے یہاں کس بندے کا کیا درجہ تھا اس کا فیصلہ ہم میں سے کوئی نہیں کرسکتا لیکن اس صدی کے ایک نادر فرد کو جانتا ہوں جس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے اور برملا کہا جاسکتا ہے کہ ''**یعرفه البیت و الحل و الحرم** ''اور جس سے اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کا کام لیا ہے جس طرح ان کے پیش روسلف صالحین سے لیا تھا، وہ شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جن کے لئے ہم بڑے بڑے القاب تجویز کرسکتے ہیں، مگر یہ ہماری زبان نہیں ہے۔ مولانا کی زندگی میں ان کی سیرت پر عربی اور دوسری زبانوں میں اتنے مضامین شائع ہوئے ہیں جنکو یکجا کرنے کیلئے خاصا وقت درکار ہے اور متعدد سوانح عربی اور اردو میں شائع ہوچکی ہیں۔ خود آپ نے اپنے قلم سے خودنوشت سوانح سات جلدوں میں تحریر فرمائی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ سوانح کا اطلاق جس کتاب پر ہوسکتا ہے وہ ''کاروان زندگی'' کا پہلا حصہ ہے، بقیہ حصوں میں اسلامیان ہند، عرب ممالک کی شخصیات اور پیدا ہونے والے حوادثات اور اہم مواقع پر آپ کے محاضرات نیز آپ کے ذریعہ مختلف ناموں سے جو تحریکیں اٹھیں یا آپ نے جن کی مدد کی ان کو کمال انکساری کے ساتھ بغیر کسی تعلّی و ادّعاء کے آپ نے لکھ دیا جس سے نہ صرف آپ کی ذات بلکہ متعدد وسائل کے خلاصے اور تحریکات کے رخ کا پتہ چلتا ہے۔

آپ کی وفات کے بعد عربی میں دو(۱) اور اردو میں متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں، عربی میں ڈاکٹر محسن عثمانی کی کتاب ''**یحدثونک عن أبی الحسن الندوي** ''اور ڈاکٹر محمد اجتباء ندوی کی کتاب ''**ابو الحسن علی الحسنی الندوي الداعية الحكيم و المربی الجليل** ''اردو میں جناب محمد حسن انصاری کی کتاب ''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی - حیات اور کارنامے'' اور ڈاکٹر محمد

---

(۱) ان دو کتابوں کے علاوہ عربی میں متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں علامہ یوسف القرضاوی کی کتاب ''الشیخ أبو الحسن الندوی کما عرفتہ'' خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

نفیس دہلوی کی کتاب ''میری تمام سرگذشت'' اورسلمان علی خاں صاحب کی کتاب ''حضرت مولانا سیدابوالحسن علی حسنی ندوی'' شائع ہوچکی ہے، ''**رابطة الادب الاسلامی**'' کے موجودہ صدرڈاکٹرعبدالقدوس ابوصالح نے''**عام الحزن**'' کے عنوان سے بہت سے عربی قصائدومضامین کا ذکرکیا ہے،تقریباً ۴۸قصیدے عربی میں مرثیہ کے لکھے جاچکے ہیں، جن میں بعض قصائد ۴۰ شعروں کے ہیں جیسے علامہ عبد الرحمٰن بن حسن الحبنکہ المیدانی کاقصیدہ ہے۔ریاض سے نکلنے والے''**رابطة الادب الاسلامی**'' کے خاص نمبرمیں پچیس قصیدے ہیں جن کوانہوں نے ایک جگہ جمع کرکےاسکانام''**باب المراثی**'' رکھاہے۔خیر یہ سلسلہ ابھی چل رہاہےاور بہتیرے خاص نمبرنکل چکے ہیں اورنکل رہے ہیں۔

پیش نظرکتاب حضرتؒ کی مکمل سوانح ہے جس میں دل کوچھو جانے والے اور احساس وشعورکومتاثرکرنے والے جزئیات میں مزید وہ کلیات بھی ہیں جوکاروان زندگی میں آچکے ہیں۔

اس کومرتب کرنے والے بلال میاں سلّمہٗ اللہ تعالیٰ ہیں جن کومیں اس مختصرگھریلو نام سے یادکررہاہوں کیونکہ میں ان سے پہلے پیداہواہوں اوران کےوالد(مولانا محمد الحسنیؒ) کی نوعمری بھی دیکھ چکا ہوں، ورنہ مجھے لکھنا چاہئے تھا مولانا .... دامت برکاتہم ،جسکے وہ ابھی سے مستحق ہیں اورانشاء اللہ اس میں پختگی اور بڑھے گی۔ اگرحضرت مولاناسیدابوالحسن علی ندویؒ کواللہ تعالیٰ نے صلبی اولاددی ہوتی توان میں یہ بلال میاں بھی ہوتے جن کی شکل وصورت دیکھ کربےساختہ وہ حدیث یادآتی ہےجس میں فرمایاگیاہے **سبعة یظلّهم الله فی ظلّهٖ یوم لا ظلَّ إلا ظلُّه إمام عادلٌ و شابٌ نشأ فی طاعة الله إلیٰ آخره** اللہ کی طاعت پہ پروان چڑھنےوالےاس نوخیزعالم دین کےاندرتواضع ،چھوٹے بڑے کالحاظ اس درجہ موجودہےجس سے بڑی

www.abulhasanalinadwi.org

توقعات قائم ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ ہمارے حضرت دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں مگر ان کا سایہ صاف اور گہرا، روشن وتابناک موجود ہے۔

خاکسار
عبداللہ عباس ندوی
ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بروز جمعہ ۹؍صفر المظفر ۱۴۲۲ھ

www.abulhasanalinadwi.org

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم علمی و دینی شخصیت تھے، ایک طرف خود ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہوا، اور دوسری طرف ان کو دین وملت کی تقویت ومدد کے لئے کام کی توفیق عطا فرما کر اللہ تعالیٰ نے پوری امت مسلمہ کے لئے اور خاص طور پر برصغیر ہندوستان و بلاد عرب کے لئے ان کو اپنا فضل خاص بنایا۔ ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت کی تشکیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات اور اسباب مہیا فرمائے جن سے ان کی یہ علمی شخصیت بنی، یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر فضل خاص ہوا، پھر شخصیت کی خصوصی تشکیل اور افادیت سے بھرپور صلاحیت ملنے کے بعد مولاناؒ نے اپنی پوری زندگی دینی تعلیم کو مؤثر اور زیادہ سے زیادہ سودمند بنانے اور دعوتِ حق اور فکرِ اسلامی کو تقویت دینے اور نشر واشاعت کرنے میں صرف کی، مسلمانوں کے آپسی افتراق و گروہ بندی سے اپنے کو بلند رکھا اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور گروہوں کے ساتھ یکساں خیر خواہانہ تعلق رکھا، ایسا خیر خواہانہ تعلق ومحبت کہ اس میں ایک طرف تواضع اور کسر نفسی کی شان تھی، اور دوسری طرف حوصلہ مندی اور حق بات جرأت اور حکمت سے کہنے کا سلیقہ تھا، چنانچہ انہوں نے امت کے اہم موقعوں پر اپنے مخاطبین سے اور جاہ وسلطنت کے مالک ذمہ داروں سے نتیجہ خیز گفتگو اور خطاب کیا، اور چونکہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بات دلنواز اور مؤثر ہوتی تھی، لہٰذا مولانا رحمۃ اللہ

www.abulhasanalinadwi.org

علیہ کے مشورہ کی اور مولانا کی تشخیص مرض کی ان کی طرف سے عموماً قدر بھی ہوتی رہی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو استغناء وحق پسندی کا جو مزاج ملا تھا، اور انہوں نے گروہی اور ذاتی مفادات وجذبات سے بلند ہو کر دعوت وخدمت ملت کا جو بیڑا اٹھایا تھا، اسکو انہوں نے تاحیات نبھایا، ملت کے تمام سنجیدہ افراد میں اس بات نے مولانا کو بلند مقام عطا کیا جس کا صاف ظہور آپ کی وفات پر رائے بریلی میں لوگوں کا بے تحاشا ہجوم اور دنیا کے مختلف اطراف کی مساجد میں اور خاص طور پر حرمین شریفین میں سال بھر کے سب سے زیادہ نمازیوں کے جمع ہو جانے کی شب میں نماز جنازہ ادا کئے جانے سے ہوا، پھر دنیا کے گوشے گوشے میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اعلیٰ پیمانہ کے سیمینار منعقد کئے گئے اور ان کے نام سے چند در چند رفاہی وتعلیمی ودعوتی ادارے قائم ہوئے، **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم**، یہ باتیں اس چیز کی علامت ہیں کہ امت کو مولانا کی خدمات اور خیر خواہی کا جو فائدہ حاصل ہوا وہ امت پر اللہ کا فضل خاص تھا۔

اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندہ پر اس طرح کا فضل فرماتا ہے اور اس کو اپنے بندوں کے درمیان شمس وقمر جیسا مقام عطا فرماتا ہے تو اس کے لئے شروع سے ایسے اسباب مہیا فرماتا ہے جن سے یہ نتیجہ برآمد ہو، چنانچہ حضرت مولانا کو عہدِ طفولیت سے ہی ایسے اسباب سے سابقہ پڑا، ماں کی گود اور اس کی خصوصی دلچسپی بچہ کے لئے سب سے پہلی اور سب سے زیادہ کارگر تربیت گاہ ہوتی ہے، اس میں بچہ کے اخلاق وسیرت کی اصلی بنیاد پڑتی ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ایسی ماں ملیں جو اپنے خاندان اور ماحول میں سب سے زیادہ دیندار اور سمجھدار تھیں اور علم وادب کی صلاحیت بھی رکھتی تھیں، انہوں نے مولانا کے عہد طفولیت میں جبکہ مولانا ان کے عزیز ترین بیٹے تھے اور ان کو اپنے ان بیٹے سے بے حد لگاؤ اور تعلق تھا کبھی بیجا شفقت ورعایت سے کام نہیں لیا، بلکہ غریبوں کی ہمدردی اور کمزوروں کی رعایت اور لغو کھیلوں اور بے فائدہ راحتوں سے اجتناب کی ہمیشہ تلقین کی، اور حوصلہ مندی کے کاموں سے کبھی نہیں روکا، چنانچہ مولانا

www.abulhasanalinadwi.org

رحمۃ اللہ علیہ اپنی آغاز جوانی سے قبل تک مفید کھیلوں سے دلچسپی لیتے رہے مثلاً ہاکی، والی بال وغیرہ، اس کے سوا پیراکی اور بندوق سے شکار جیسی مشقوں کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہم عمر اور نوعمروں کے ساتھ اختیار کیا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ نے ان کو ان سے نہیں روکا۔ لیکن بے فائدہ اور لغو کاموں سے اور بے جا احساس برتری اور دوسرے کے ساتھ زیادتی وحق تلفی سے ہمیشہ بچایا، چنانچہ شروع ہی سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ کی اعلیٰ صفات کے حامل ہو گئے مثلاً ایک مرتبہ بچپنے میں گھر کے اپنے ہم عمر ایک بچہ کو جو گھر کی خادمہ کا تھا مولانا نے کسی بات سے ناخوش ہو کر مار دیا، اس کی ماں نے اس بات کی شکایت مولانا کی والدہ سے کی، مولانا کی والدہ نے ان کو طلب کیا اور تنبیہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ خادمہ کا بچہ انتقاماً مولانا کو مارے، خادمہ نے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرا یہ معمولی بچہ اس معزز بچہ کو مارے لیکن مولانا کی والدہ نے اپنی بات پر اصرار کیا اور جب خادمہ نے نہیں مانا تو مولانا کی والدہ نے خادمہ کے بچہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ہاتھ سے مولانا کو مارا۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل مولانا کے لئے ایسی تنبیہ بنا کہ پھر زندگی بھر کے لئے کسی کمزور وغریب کے ساتھ سختی کرنا مولانا کے مزاج سے خارج ہو گیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ معاشرہ میں ایک بڑے اور معزز فرد کے بیٹے اور معزز دادا کے پوتے تھے، مولانا کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ ایک عالم دین اور کامیاب حکیم تھے بلکہ تعلیمی ودینی کاموں میں آگے آگے رہنے والوں میں اور اہم شخصیت کے مالک تھے، اور مولانا کے دادا مولانا حکیم فخر الدین صاحب حسنیؒ کہنہ مشق شاعر ومصنف اور سربرآوردہ شخصیت تھے اور مولانا کے نانا صاحب حضرت شاہ سید ضیاء النبی حسنیؒ ایک صاحب نسبت محترم بزرگ تھے جن سے دینی فیض حاصل کرنے دور دور سے لوگ آتے تھے، اور صلاح وتقویٰ کا توشہ لے کر جاتے تھے اور انہی کا خاص اثر تھا جو مولانا کی والدہ ماجدہ میں خاص طور پر آیا تھا جو ان کی چھوٹی صاحبزادی تھیں، اور یہی وہ اثر تھا جو مولانا کی تربیت میں ان کی ان صاحب

www.abulhasanalinadwi.org

خصوصیات والدہ کی فکر وتوجہ سے ظاہر ہوا، اور یہ وہ سہ گوشہ جہات سے ملنے والی وراثتی خصوصیات تھیں جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں منتقل ہوئیں۔

ماحول کے دینی ہونے کے ساتھ علمی وادبی ہونے نے بھی مولانا پر خصوصی اثر ڈالا، مولانا کو بچپنے سے ہی مطالعہ کا اور کتاب جمع کرنے کا شوق ہوا، اور یہ انکی اس عمر میں ہی شروع ہوگیا جو کہ کچی تھی اور بطور خاص علمی کتب کے لائق نہیں تھی، لیکن مولانا کا مطالعہ کا شوق اس سے بلند تھا، اور کوئی بھی پڑھی جانے کے لائق کتاب کا مطالعہ مولانا کا شوق بن گیا تھا، کسی اخبار میں رحمۃ للعالمین مصنفہ مولانا سلیمان منصور پوری کا اشتہار دیکھا وی۔ پی (V.P.) طلب کرلیا، جب ڈاکیہ کتاب لے کر آیا تو وی۔ پی چھڑانے کے پیسے نہیں تھے تو ماں سے اس کے لئے اصرار کیا، ماں اس وقت اس حال میں نہ تھیں لیکن مولانا کے بیقرار ہونے اور رونے سے مجبور ہوکر قرض لے کر وی پی چھڑانے کے لئے دے دیئے اور مولانا نے وہ کتاب حاصل کرلی، اور بہت جی لگا کر پڑھی، وہ زندگی بھر اس کتاب کی اثر پذیری اور اپنے اوپر اس کے اثر کا ذکر کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بچپنے کے زمانہ ہی سے اپنے گھر کے ماحول سے بطور خاص دینی جذبہ ابھارنے والے عوامل ملے، ان میں سے ایک تو یہ کہ والدہ صاحبہؒ قرآن مجید کی جید حافظ تھیں اور لکھنے پڑھنے کا دینی اور ستھرا ذوق رکھتی تھیں حتی کہ شعر گوئی کی صلاحیت بھی ان کو حاصل تھی، انہوں نے اپنے اشعار مناجات اور دعاؤں کا ذریعہ بنائے، والدہ صاحبہ کے علاوہ خاندان کی دیگر متعدد خواتین بھی حافظ تھیں، ان کے ذریعہ گھر کے اندر کی زندگی میں تلاوت کا ذوق اور قرآن مجید سے تعلق کی فضا بن گئی تھی، یہ وہ عہد تھا کہ انگریزی اقتدار کی چیرہ دستیوں کا عمل زیادہ تر مسلمانوں پر تھا، اس کے اثر سے مسلمانوں میں اپنے ماضی کی سربلندی اور عزت کی طلب بڑھ گئی تھی، خاندان ہی کے ایک بزرگ مولانا عبدالرزاق کلامی نے ''فتوح الشام'' کو اردو شعر کا جامہ پہنایا تھا، جو جہاد اور مسلمانوں کی سربلندی کی داستانوں پر مشتمل تھا، اس شاہنامہ کو خاندان کی عورتیں اپنی مخصوص مجالس میں جن میں بچے شریک ہوتے اور اثر

www.abulhasanalinadwi.org

لیتے مل کر پڑھنے کا رواج تھا، خاص طور پر خاندان میں پیش آنے والے حوادث کے موقع پر ایسا ہوا کرتا تھا، ان کیفیات کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ذہن وقلب میں جذب کیا، پھر ذرا ہوش سنبھالنے پر حضرت سید احمد شہیدؒ کے جو خاندان ہی کے اسلاف میں تھے جہاد کے واقعات اور اصلاح وتربیت کے حالات سے واقفیت ہوئی، اس سے دینی جذبہ اور دین کی سربلندی کے لئے کچھ کر سکنے کا احساس بڑھا۔

اسی دوران جبکہ مولانا کی عمر مشکل سے ۹ رسال کی ہوگی مولانا کے والد کے اچانک انتقال کر جانے سے مولانا کو بڑے صدمہ اور دشواری سے سابقہ پڑ گیا۔ ایک تو یتیمی کا داغ لگا جو اس کم عمر کے دل کو توڑنے والی بات تھی، دوسرے مولانا کے خاندان کا معاشی دارومدار مولانا کے والد کی طبابت ہی پر تھا وہ دارومدار ختم ہوگیا، مولانا کے بڑے بھائی کی تعلیم کی ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی، ان دونوں باتوں نے جن میں سے ایک نفسیاتی، دوسری اقتصادی تھی خاندان پر اثر ڈالا، مولانا کی والدہ بڑی حوصلہ منداور باہمت تھیں ان کے اپنے والدین کی طرف سے جائداد میں جو قدرے قلیل حصہ ملا تھا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے پوری اولوالعزمی سے مولانا کی تعلیم وتربیت پر توجہ دی، بڑے بھائی نے بھی اولوالعزمی اور وسعت قلبی سے اپنے اس چھوٹے بھائی کے ساتھ شفقت وتربیت کا اہتمام کیا، اور علم وادب کی ضروری شاخوں میں ان کے الگ الگ ماہرین سے تعلیم دلانے کا اہتمام کیا، چنانچہ عربی زبان وادب میں وقت کے ممتاز ترین عالم شیخ خلیل بن محمد یمانیؒ سے، حدیث شریف میں ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ سے اور بطور مزید دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے، اور علم تفسیر میں نیز تربیت باطنی میں لاہور کے مولانا احمد علی لاہوریؒ جیسے اہل علم واہل درس سے استفادہ کا انتظام کیا، اس وقت کے ہندوستان میں اس سے بہتر انتظام نہیں ہوسکتا تھا، مولانا کے برادر معظم نے مزید یہ توجہ کی کہ اسلامی فکر کے عظیم حاملین جیسے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیمؒ، امام غزالیؒ جیسے عظمائے اسلام کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف متوجہ کیا جن سے مولانا نے بہت فیض اٹھایا۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے اپنی تعلیم ونشو ونما کا تقریباً پورا زمانہ اپنے والد محترم جناب مولانا حکیم عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں ہی گزارا تھا، انہوں نے علوم دینیہ وشرعیہ کی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند دونوں جگہ رہ کر مکمل کی تھی اور اپنے اس عہد میں جبکہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے انگریزی تعلیم سے بالکل دور رہتے تھے انہوں نے انگریزی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی تھی اور سائنس کی پھر میڈیکل تعلیم کی تکمیل کی تھی، اس طرح انہوں نے علوم دینیہ میں کمال اور انگریزی زبان اور عصری مضامین میں اچھی دسترس حاصل کی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ اپنی عملی زندگی میں اپنے والد کی زیر سرپرستی صلاح وتقویٰ کی صفت کے پوری طرح پابند رہے۔ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج کی تعلیم میں ایک عالم دین کی مکمل وضع قطع کے ساتھ رہے، اور اپنی دینی وعملی زندگی میں اس عہد کی فیشن پسندی کا کوئی اثر نہیں لیا، ان کے والد موصوف ندوۃ العلماء کی جامع تعلیمی تحریک کے قائدین میں تھے، اس کے اثر سے ان کے صاحبزادہ کی زندگی میں اس کا پورا عملی عکس آ گیا تھا، جس کے نتیجہ میں وہ ایک جامع علم وفکر کا عملی پیکر بنے، ادھر ان کے برادر خورد مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ابھی پختگی کے درجہ میں نہیں پہونچی تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا، اس کے نتیجہ میں اس نوعمر بھائی کی تعلیم وتربیت کی وسیع ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آ گئی۔ ان میں سے ایک کی عمر اس وقت صرف ۹ سال کی تھی، جبکہ دوسرے کی عمر ۳۱ سال کی ہوچکی تھی، اس طرح ایک طرح سے وہ ان کے صرف بڑے بھائی ہی نہ تھے بلکہ والد کے قائم مقام ہوگئے تھے، چنانچہ انہوں نے مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو علوم دینیہ کی تکمیل کے ساتھ ان مضامین میں بھی صاحب بصیرت اور صاحب صلاحیت بنانے کی طرف توجہ دی جن سے قدیم وجدید کے ٹکراؤ کے اس دور میں ایک تعلیم یافتہ مسلمان کو سابقہ پڑتا ہے، ساتھ ساتھ عملی زندگی میں صلاح وتقوی کی صفت کے پہلو کو بھی مدنظر رکھا، اس طرح مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک طرف اپنے علمی وعملی اوصاف کے حامل بھائی کی سرپرستی، دوسری

www.abulhasanalinadwi.org

طرف اپنے عہد کے بہترین اساتذہ کے ذریعہ تکمیل علم اور اپنے وقت کے اہل صلاح و تقویٰ بزرگوں سے وابستگی سے سہ طرفہ وسیع اور متنوع فائدہ حاصل ہوا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل خاص سے ایک متعدد الجہات علمی دینی اور عملی شخصیت بنے، یہ تھا اللہ تعالیٰ کا وہ فضل وکرم جو خود ان کی ذات کو حاصل ہوا۔

اس مذکورہ پس منظر کے ساتھ مولانا موصوف جب عملی زندگی کے میدان میں داخل ہوئے تو ان کے سامنے ایک طرف مغربی علم وتمدن کی یلغار اور اسکے مقابلہ میں مغرب کی استعماری طاقت کے سامنے شکست خوردہ اور پس ماندہ مشرق تھا، اور اس کے تناظر میں مسلمانوں کی بدحالی اور شکست خوردگی اور بے عملی تھی۔ دوسری طرف ان کے سامنے مسلمانوں کے ماضی کی تاریخ میں ان کی سیاسی وتمدنی سربلندی اور علم وتحقیق کی عظیم سرپرستی کا منظرنامہ تھا، اور اسی منظرنامہ کے ذیل میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مجددانہ کارنامہ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فکری وتعلیمی مصلحانہ کام اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی دینی وعملی سربلندی کی تحریک کی تاریخ کے کھلے ہوئے صفحات تھے، اسلام کے ماضی بعید کے شکوہ وعظمت اور ماضی قریب کے ان زرّیں صفحات اور پھر موجودہ بدحالی اور پستی کا المیہ ان پہلوؤں نے مولانا کے قلب ودماغ کو جھنجھوڑ دیا اور انہوں نے اپنی عملی زندگی کو اپنے علم ودانش کی روشنی میں اس راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی جس سے وہ ایسی تبدیلی لاسکیں جس کے ذریعہ مسلمانوں کا عظیم ماضی ان کے پس ماندہ حال پر اثرانداز ہوسکے۔

تاریخ کا موضوع مولانا کا خاندانی موضوع تھا، یہ موضوع قوموں کے عروج و زوال اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے میں بڑا ممد ومعاون ہوتا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طرف اس سے فائدہ اٹھایا، دوسری طرف اپنی علمی وادبی صلاحیت اور دعوتی فکر وجذبہ سے کام لیا جس کو ہم حضرت مولانا کے چھوڑے ہوئے تصنیفی وفکری سرمایہ میں نمایاں طریقہ سے دیکھ سکتے ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فکری ودعوتی جدوجہد میں عہد حاضر کی فن کارانہ او

www.abulhasanalinadwi.org

مختلف الجہات زندگی کی نفسیات کو بھی سامنے رکھا اور اس کے لئے موزوں حکمت عملی اختیار کی، مولانا نے اصحاب اقتدار وسطوت سے مخاطبت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا طریقہ اپنانے کی کوشش کی، تعلیم وتربیت کے محاذ پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تفہیم وتشریح کا اسلوب اختیار کیا، اور فکر ودانش کے میدان میں مذکورہ بالا دونوں مجددین کے طریق فکر کے ساتھ قدماء میں سے ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور ابن جوزیؒ کے طریقہ تحقیق وتفہیم کو اختیار کرنے کی کوشش کی، اور امت کی اصلاح اور اس کو سربلندی کی راہ اختیار کرانے کے لئے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت مصلحین کے اسلوب اصلاح کو اسوہ بنایا، مولانا نے اپنے عہد کے مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اختیار کردہ طریقہ دعوت واصلاح کو قدر کی نظر سے دیکھا۔ اور اس کے ساتھ وابستگی بھی اختیار کی نیز اپنے عہد کے دوسری کوششوں کے مفید پہلوؤں کو بھی سراہا۔ اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے امت کی اصلاح وترقی کے لئے ہمہ جہت فکر وعمل کو اختیار کیا، اور اس بات کی کوشش کی کہ جبکہ امت کی احیاء وترقی کا مقصد پوری امت کا مشترکہ مقصد ہے تو امت کے تمام گروہوں اور جماعتوں کو اس کے حصول کے لئے اپنے فروعی اختلافات سے بالا ہوکر کام کرنا چاہئے۔ مولانا نے اس کے لئے سب سے یکساں ربط وتعلق رکھتے ہوئے کم ازکم اپنی ذات سے اس کا بہترین نمونہ پیش کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی ذات پر گروہی وجماعتی اختلافات سے بالا ہوکر سب نے علی العموم اتفاق کیا اور امت کے متعدد مشترکہ مقاصد میں مولانا کو سب نے اپنا سرگروہ بنایا اور پھر ان کی وفات پر پوری امت کا خسارہ اور نقصان ہونے کے احساس کا اظہار کیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غیر معمولی خصوصیت ان کی عربی زبان کی قابلیت تھی جس کی بنا پر عرب دانشور طبقہ کو انہوں نے نہ صرف متاثر کیا بلکہ اپنا گرویدہ بنالیا تھا چنانچہ برصغیر ہندوپاک کے ساتھ ساتھ ممالک عربیہ میں بھی مولانا کی وفات کو ایک بڑا خسارہ سمجھا گیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کی شخصیت اور کارناموں پر متعدد اہل

www.abulhasanalinadwi.org

علم نے کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں اپنی اپنی معلومات اور اندازوں کے مطابق مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے کمالات پر روشنی ڈالی ہے اور وہ سب قابل استفادہ ہیں۔ان تمام کتابوں کی قدر و منزلت تسلیم کرتے ہوئے زیر نظر کتاب جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے جو مولانا کے نامور بھتیجے سید محمد الحسنی کے چھوٹے صاحبزادہ ہیں مولوی بلال حسنی ندوی سلّمہٗ نے ترتیب دی ہے یہ اپنی ایک الگ خصوصیت کی حامل قرار دی جانے کے قابل ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عمر کے آخری برسوں میں مولوی بلال حسنی سلّمہٗ بہت ہی قرب و تعلق کے ساتھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ رہے، اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو اپنی شفقت و نظر عنایت سے نوازا۔

عزیز موصوف کو اللہ تعالیٰ نے علم و صلاح اور عاقلانہ نظر کی دولت عطا فرمائی ہے، عزیز موصوف نے اپنی انہی خصوصیات کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی حیات مبارکہ کا ایک مؤثر اور جامع مرقع تیار کیا ہے جو قارئین کے سامنے آرہا ہے، اس میں عزیز موصوف نے صحت معلومات، سہولت بیانی اور شگفتہ اسلوب کا پورا اہتمام کیا ہے، اور وہ اس میں کامیاب رہے ہیں۔اس کے ذریعہ انشاء اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دلنواز اور عظیم شخصیت کو سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔

والسلام

محمد رابع حسنی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں
رائے بریلی

سنیچر ۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۲ھ
۱۲؍مئی ۲۰۰۱ء

www.abulhasanalinadwi.org

عرضِ مرتب

زمانہ کچھ زیادہ نہیں گذرا، سال ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ جب ملت اسلامیہ کا عظیم سپوت اس دنیا سے رخصت ہوا، تاریخ اصلاح وتجدید کا ایک سنہرا ورق الٹ گیا، دعوت وعزیمت کا ایک باب بند ہوگیا، بیسویں صدی کے غروب آفتاب کے ساتھ رشد و ہدایت کا آفتاب بھی غروب ہوگیا، ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء مطابق ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے وفات پائی، اس حادثہ کی چوٹ عرب وعجم میں محسوس کی گئی؛ اسکے بعد سے آج تک نہ جانے کتنے تعزیتی جلسے ہوئے، کتنے رسالوں کے خصوصی شمارے شائع کئے گئے اور نہ جانے کہاں کہاں ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے سیمینار ہوئے؟!!

مفکر اسلام امام العصر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی بے پایاں خدمات سے اصلاح وتجدید کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا تھا، اپنی منفرد خصوصیات اور امتیازی کمالات کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں ان کو جو محبوبیت ملی تھی وہ خاصان بارگاہ الٰہی کا خاصہ ہے۔

ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

حضرت مولاناؒ کی اصلاحی و دعوتی سرگرمیوں اور تجدیدی کارناموں کا سلسلہ ایک طرف زمانی اعتبار سے بیسویں صدی کے بڑے حصہ پر محیط ہے تو دوسری طرف اس کا مکانی رقبہ عالم اسلام کے اکثر حصوں پر مشتمل ہے۔ ان کو تفصیل کے ساتھ کسی ایک جلد میں سمیٹنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، اس کے لئے کئی جلدوں کی ضرورت ہے اور یہ کام کسی ایک آدمی کا نہیں بلکہ مستقل اکیڈمی کا کام ہے، لیکن فوری طور پر کسی ایسی کتاب

www.abulhasanalinadwi.org

کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں اجمالی طور پر حضرتؒ کی سوانح حیات اور خصوصیات وامتیازات کو پیش کردیا گیا ہوتا کہ ایک ایسا مرقعہ تیار ہوجائے جس میں بڑی حد تک حالات زندگی کا احاطہ ہوجائے؛ پیش نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے مرتب کی گئی ہے۔

راقم نے اس کتاب میں حضرتؒ کی خودنوشت سوانح حیات ''کاروان زندگی'' کی ساتوں جلدوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے کہ وہی حضرتؒ کے حالات کا سب سے بڑا اور مستند مآخذ ہے، اسکے علاوہ بھی بعض وہ واقعات اور حقائق پیش کردیئے ہیں جن کا حضرتؒ نے ازراہ تواضع ذکر نہیں فرمایا، وفات اور وفات کے بعد کا حال جو اس ناکارہ کی گنہگار آنکھوں نے خود دیکھا چشم دید گواہی کے طور پر شامل کتاب ہے۔ کتاب کے آخری باب میں حضرتؒ کی خصوصیات، امتیازات وکمالات اور خاص طور پر انکے بلند اخلاق کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ عمل کرنے والوں کیلئے ایک تحفہ ہے۔

حضرتؒ کی سوانح مرتب کرنے کا سب سے زیادہ حق حضرتؒ کے خواہرزادۂ اکبر مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کو تھا کہ وہ ایک صاحب نظر مؤرخ وسوانح نگار، صاحب ذوق ادیب اور خاندانی روایات کے امین تھے، طویل عرصہ انہوں نے حضرتؒ کے ساتھ گذارا تھا اور ابتدائی دور کے سفروں میں ساتھ رہے تھے۔ ان کے بعد یہ کام سب سے بہتر طریقہ پر حضرتؒ کے برادرزادہ مولانا سید محمد الحسنیؒ انجام دے سکتے تھے جن کو سوانح نگاری کا اچھا ذوق تھا، اپنی فکر وتحریر میں وہ حضرت کا مثنیٰ تھے، مگر یہ دونوں حضرات حضرتؒ کے سامنے اس عالم فانی سے رخصت ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ حضرتؒ کے درجات بلند فرمائے کہ حضرتؒ نے خود ہی اپنی سرگذشت حیات قلمبند فرمادی جس میں حضرتؒ نے عالم اسلام کے حالات، اپنی معاصر تحریکات وشخصیات پر تبصرہ فرمایا ہے، اس سے اس دور کی اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب محفوظ ہوگیا، اور بہت سے وہ حقائق بین السطور آگئے ہیں جو عام طور پر تاریخ و سوانح کی بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتے، اس میں دعوت بھی ہے اور پیغام بھی۔ اپنی

www.abulhasanalinadwi.org

شخصیت سے زیادہ اس میں حضرتؒ نے اپنی فکر پیش فرمائی ہے۔ بلاشبہ یہ اسلامی دعوت و عزیمت کی تاریخ کا ایک ایسا اہم باب ہے جس کو کوئی داعی و مؤرخ نظرانداز نہیں کرسکتا، پیش نظر کتاب میں ضروری اضافوں کے ساتھ اسی ''کاروان زندگی'' کے سوانحی حصوں کو یکجا کردیا گیا ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ اس عمل کو قبول فرماکر راقم کیلئے باعث نجات ومغفرت بنادے۔

عم مخدوم ومعظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی نے مقدمہ تحریر فرماکر راقم کی ہمت افزائی فرمائی۔ مخدومی مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی مدظلہ (۱) العالی کے پیش لفظ نے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔ عم مخدوم مولانا واضح رشید ندوی نے پوری کتاب ملاحظہ فرمائی اور بیش قیمت اصلاحات فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کے سایہ کو تادیر سلامت رکھے۔

اخیر میں ان سب حضرات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنہوں نے کتاب کی اشاعت و طباعت میں مدد کی؛ ان میں خاص طور پر محبّ گرامی مولوی دوست محمد صاحب ندوی اور رفیق مکرم مولوی محمد حسن صاحب ندوی (مدرسین مدرسہ ضیاء العلوم) شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے مسودہ کے بڑے حصہ کی تبییض کی، عزیز القدر محمد نفیس خاں رائے بریلوی سلّمہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے کتاب کی طباعت کے لئے تگ و دو کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو بہترین صلہ عطا فرمائے اور اس عمل کو خالص ومقبول فرمائے۔

و ما توفيقي إلا بالله عليه توكلت و إليه أنيب.

بلال عبدالحی حسنی ندوی

گوشۂ مفکر اسلام دار عرفات

رائے بریلی

۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۲ھ

---

(۱) مولانا موصوف نے یکم جنوری ۲۰۰۶ء کو حجاز مقدس میں وفات پائی اور جنۃ المعلاۃ میں مدفون ہوئے۔ رحمه الله رحمة واسعة

www.abulhasanalinadwi.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

اصلاح وتجدید کی مختصر تاریخ، مغربی تہذیب کی یلغار، اسکے دفاع کی ابتدائی کوششیں، حضرتؒ کا تجدیدی کارنامہ اور حضرتؒ کی سیرت کی تشکیل وتعمیر کے بنیادی عناصر

اصلاح وتجدید کی تاریخ پر ایک نگاہ

یہ اسلام کا نمایاں امتیاز، اس کی بنیادی خصوصیت بلکہ اس کی ابدیت وحقانیت کی ایک دلیل ہے کہ اس کا سدابہار درخت (شجرہ طیبہ) ہمیشہ برگ و بار لاتا رہا ہے۔ اسلامی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ضرورت کے مطابق کوئی مصلح ومجدد نہ پیدا ہوا ہو، یہ اسلام کی تاریخ کا ایسا زریں باب ہے کہ جس میں کوئی دوسرا دین اس کا سہیم وشریک نہیں۔

شروع ہی سے اسلام کے قلب وجگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے کہ کوئی دوسرا مذہب اس کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ دنیا کے دوسرے مذاہب جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہار نہ سکے اور انھوں نے اپنی ہستی کو گم کردیا۔ لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا، تاریخ اسلام کے ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے تحریفات وتاویلات کا پردہ چاک کیا اور حقیقت اسلام اور ''دین خالص'' کو اجاگر کیا، بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پرزور حمایت کی، عقائد باطلہ

www.abulhasanalinadwi.org

کی بے باکانہ تردید کی اور مشرکانہ اعمال ورسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا۔

خلافت راشدہ کے دور کے بعد جب قدیم جاہلی رجحانات نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھرنے لگے، تعیش وترفہ کا دور دورہ ہوا اور عجمی اثرات اسلامی سوسائٹی پر پڑنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو پیدا فرمایا جنھوں نے حکومت کے رخ کو بدل دیا، لوگوں کے رجحانات بدل گئے اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ ان کا دوسرا تجدیدی کارنامہ سنت وحدیث کی تدوین کا ہے، ان ہی کی فکر وتوجہ سے حدیث کے بڑے بڑے مجموعے مرتب ہوئے اور باقاعدہ اس کو مدون کیا گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد ان کے جانشین (جن کو سلیمان نامزد کر گیا تھا) حکومت کو پھر اسی چول پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے دور میں تھی، پھر تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہوا، نفاق کے جراثیم پھیلنے لگے اور اسلامی معاشرہ خطرہ میں پڑ گیا تو حضرت حسن بصریؒ کی شخصیت وجود میں آئی جنھوں نے اپنی قوت ایمانی، سوز دروں، صحبت وتربیت، وعظ ونصیحت اور دعوت وتلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان میں تنکے کی طرح بہنے سے بچالیا۔ اس تجدیدی عمل میں ان کے شریک حضرت سعید بن جبیر، محمد بن سیرین اور امام شعبی (رحمہم اللہ) بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جب حدیث وفقہ کی تدوین کا مسئلہ سامنے آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایسے اذکیاء اور محیر العقول حافظہ رکھنے والے ممتاز افراد پیدا فرمائے جنھوں نے کتب صحاح مرتب کیں اور اپنے استنباط واجتہاد سے امت کے لئے دین پر عمل کو آسان کردیا۔

فتنہ خلق قرآن نے جب سر اٹھایا تو حضرت امام احمد بن حنبلؒ اس کے لئے سینہ سپر ہوگئے، یہاں تک کہ حکومت کو جھکنا پڑا اور امام صاحبؒ کی شخصیت اہل حق کی علامت بن گئی۔ جب اعتزال کا فتنہ اٹھا تو امام ابوالحسن اشعریؒ سامنے آئے اور انھوں نے اپنی زبان وقلم سے اعتزال کے قلب وجگر پر وہ تیشے چلائے کہ اس کو پیچھے ہٹنا پڑا

www.abulhasanalinadwi.org

اور اپنا وجود باقی رکھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ پھر جب فلسفہ و باطنیت کا فروغ ہوا تو امام غزالیؒ جیسا متکلمِ اسلام پیدا ہوا جنھوں نے اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا نہ صرف یہ کہ مقابلہ کیا بلکہ اس کی بنیادوں پر حملہ کیا۔ ان کا دوسرا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ لیا، اور اس پر کھل کر تنقید کی اور اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کو پیدا فرمایا جن کی ذات سے دین کو بڑا نفع پہنچا اور انھوں نے مسلمانوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، اللہ نے ان کو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ اسلامی تاریخ میں کم لوگ اس صفت میں ان کے شریک ہوں گے۔ اسی زمانہ میں امام ابن جوزیؒ نے اپنے انقلاب انگیز مواعظ اور مجالس درس سے اصلاح امت کا فریضہ انجام دیا۔ صلیبی حملوں نے جب اسلام کے لیے خطرہ پیدا کر دیا تو صلاح الدین ایوبیؒ اور نور الدین زنگیؒ نے اس کے چھکے چھڑا دئے، بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ذریعہ سے ''بیت المقدس'' صلیبیوں کے تسلط سے آزاد ہوا۔

جب تاتاریوں نے سر اٹھایا اور لگتا تھا کہ اب شاید دنیا میں اسلام کا کلمہ پڑھنے والے نہ رہیں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں محافظین اسلام پیدا فرما دیئے۔ حاصل یہ کہ جب جب کوئی یورش سامنے آئی یا کسی فتنہ نے سر اٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ کے لئے کسی ایک شخصیت یا افراد کو کھڑا کر دیا جنھوں نے مردانہ وار اس کا مقابلہ کیا۔ شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام (م ٦٦٠ھ)، مولانا جلال الدین رومی (م ٦٧٢ھ)، شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م ٧٢٨ھ)، علامہ ابن قیم (م ٧٥١ھ)، علامہ ابن رجب حنبلی (م ٧٩٥ھ)، پھر ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی (م ٦٢٧ھ)، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (م ٧٢٥ھ)، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (م ٧٨٦ھ)، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (م ١٠٣٤ھ)، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ١١٧٦ھ) اور ان کے صاحبزادگان عالی مرتبت، حضرت سید احمد شہید (م ١٢٤٦ھ) اور ان کے خلفاء (رحمهم الله) سب اسی سلسلۂ اصلاح و تجدید کی

www.abulhasanalinadwi.org

کڑیاں ہیں جن سے اسلامی دعوت وعزیمت کی تاریخ روشن وتابناک ہے۔

امام العصر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات والا صفات بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اصلاح وتجدید کی تاریخ رقم کرنے والا کوئی مورخ ان کی شخصیت اور اصلاحی وتجدیدی خدمات کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔

عالم اسلام پر مغرب کی یلغار اور اسکے دفاع کی ابتدائی کوششیں

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں عالم اسلام پر مغرب کی یلغار ہوئی۔ صدیوں پہلے صلیبی جنگوں کا جو زخم کاری عیسائیوں کو لگا تھا وہ اس کا بدلہ لینے کی تاک میں تھے، ان کو موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے اس کے لئے اپنی ساری توانائی صرف کردی۔ دوسری طرف اسلامی ممالک اپنی اخلاقی بدحالی اور باہمی انتشار وافتراق سے زار ونزار ہورہے تھے۔ ترکی بھی (جس کو ایک طویل عرصہ تک خلافت اسلامیہ کا مستقر ہونے کا شرف حاصل رہا تھا) مرور زمانہ کے ساتھ خودشناسی وخوداعتمادی کا جوہر کھو چکا تھا۔ اس کے بالمقابل مغربی تہذیب نئی زندگی نئی قوت سے معمور اور نئے جوش اور نئی امنگوں سے مخمور تھی، وہ اپنے ساتھ ایسا صنعتی، علمی وفکری انقلاب لائی تھی جس کے حدود روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتے جارہے تھے، بالآخر اس نے اسلام کے قلب وجگر حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب میں پنجے گاڑنے شروع کردیئے تھے۔ یہ صورت حال اسلام اور مسلمانوں کے لیے بڑی تشویشناک تھی اور اس کی شدید ضرورت تھی کہ اس کا بھرپور مقابلہ کیا جائے اور دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کے بجائے اس کے قلب وجگر پر حملے کئے جائیں اور اس کا پوری طرح تجزیہ کرکے اس کے اچھے اور برے پہلوؤں کے درمیان حد فاصل کھینچ دی جائے۔ اس کے لئے بڑی وسعت فکر، دقت نظر اور قوت و جرأت کی ضرورت تھی اس وقت کے قائدین ومفکرین اور علماء نے اس سلسلہ میں کوششیں ضرور کیں لیکن اس کام کے لئے جو مطلوبہ صفات اور ضروری صلاحیت ہونی

www.abulhasanalinadwi.org

چاہئے تھی اس کے اس درجہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کو اس میں پوری کامیابی نہ مل سکی۔

اس سلسلہ میں جن علماء و مفکرین نے فکر وسعی کی ان میں ایک نمایاں نام سید جمال الدین افغانیؒ کا ہے۔ مگر وہ اپنی طاقتور شخصیت اور غیر معمولی ذہانت اور زور خطابت کے باوجود اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے، اور ان کی کوششوں پر سیاسی رنگ غالب رہا، ان کی زیادہ تر توجہ عالم اسلام کی سیاسی و تنظیمی ترقی اور مختلف مسلم ملکوں پر غیر مسلم اقتدار اور برطانوی استعمار کے خاتمہ پر صرف ہوئی، انکے شاگرد مفتی محمد عبدہؒ نے سیاسی کے بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کی اور سر سید احمد خاںؒ کی طرح اسلام کے بعض مسلمہ عقائد کی ایسی تاویلیں کیں جن کو علماء اہل حق کبھی قبول نہیں کر سکتے تھے۔

تحریک "الاخوان المسلمون" سے اس سلسلہ میں بڑی امیدیں وابستہ تھیں، اگر وہ اپنی صحیح اور طبعی رفتار سے چلتی رہتی تو یہ یقین کیا جا سکتا تھا کہ وہ کم از کم مشرق وسطیٰ میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا کام کر سکے گی لیکن ایک طرف اس تحریک کے رہنماؤں کی عملی سیاست میں ذرا قبل از وقت شرکت کی وجہ سے دوسری طرف عرب نیشنلزم اور سوشلزم کے علمبرداروں کے برسر اقتدار آ جانے اور اس تحریک کو پوری قوت کے ساتھ کچل دینے کی بنا پر عالم اسلام اس طاقتور اور وسیع تحریک سے محروم ہو گیا۔

برصغیر ہند و پاک میں جن لوگوں نے مغربی تہذیب پر نکتہ چینی کی ان میں اکبر الہ آبادی مرحوم کا نام بھی آتا ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص و معروف مزاحیہ انداز اور بلیغ و طاقتور اسلوب میں اس پر نشتر زنی کی اور اس کو اپنے دور میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی، لیکن وہ اس تیز دھارے کو روک نہیں سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس ادب اور اصلاح کی بنیاد طنز و تعریض پر ہوتی ہے، اس کی عمر اور اثرات محدود ہوتے ہیں۔ برصغیر میں اس سلسلہ کا سب سے نمایاں نام ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا ہے جن کو جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا جا سکتا ہے، انھوں نے مغربی تہذیب و افکار کا بھرپور مطالعہ کیا اور پوری جرأت و قوت کے ساتھ اس پر تنقید کی۔ جدید تعلیم یافتہ نسل نے اس کا گہرا اثر قبول کیا، لیکن بہرحال ان کی یہ کوشش برصغیر کی حد تک محدود رہی۔

www.abulhasanalinadwi.org

طبقہ علماء میں سب سے پہلے جس شخصیت نے مدافعانہ اور معذرت آمیز لہجہ اختیار کرنے کے بجائے مغربی تہذیب و افکار پر تنقید کی اور اسلام کو رائج زبان اور طاقتور اسلوب میں پیش کیا وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ذات ہے، ان کی تحریریں اعتماد و قوت سے پر ہوتی تھیں۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں اسلامی مسائل اور متکلمانہ و سیاسی مباحث پر جو پرزور مضامین و رسائل لکھے انھوں نے ہندوستان کے اسلام پسند حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی، اگر وہ اسی طریقہ پر گامزن رہتے تو شاید معاملہ کچھ اور ہوتا، مگر انھوں نے بعد میں دین کی جدید تفہیم و تشریح کرکے اور وہ نئی تعبیرات اختیار کرکے جن میں وہ حدود سے تجاوز کر گئے تھے صورت حال بدل ڈالی اور خود ان کو اس سلسلہ میں ہدف ملامت بننا پڑا۔ علماء دیوبند نے جو برصغیر میں اہل حق کی شناخت سمجھے جاتے ہیں برملا ان پر نقد و احتساب کیا۔

ایسی صورت حال میں عالم اسلام ایسی شخصیت کا منتظر تھا جو ایک طرف اپنی بالغ نظری وسعت مطالعہ، وسعت فکر، توازن و اعتدال، پھر دلسوزی و دردمندی میں اعلیٰ مقام پر فائز ہو۔ عربی زبان پر اس کو پوری طرح قدرت حاصل ہو جو عالم اسلام کی سرکاری زبان ہے تو دوسری طرف وہ اخلاص وللہیت اور زہد و اتقاء میں نمونۂ سلف ہو۔ ان صفات کا امتزاج اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات میں پیدا فرمایا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اصل تجدیدی کارنامہ

حضرت کا اصل تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کا نگاہ بصیرت سے مطالعہ کیا، سادہ دل مشرق اور شاطر و ہوشیار مغرب کی کشاکش کو دیکھا اور سمجھا، اور زمانہ کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا۔

مغرب کی فکری، تہذیبی و تمدنی یلغار کا پورا عالم اسلام شکار ہو رہا تھا اور جزیرۃ العرب بھی اس کے حملوں سے چور چور تھا، اس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ

www.abulhasanalinadwi.org

کوئی کھل کر اس کی خامیوں کی نشاندہی کرنے والا ہو۔

برطانوی سامراج اور مغربی استعمار جس نے تقریباً پورے عالم اسلام کو اپنے شکنجہ میں جکڑ رکھا تھا، اس کے اثرات اتنے وسیع اور عمیق پڑ رہے تھے کہ گذشتہ صدیوں اور بیسویں صدی میں اتنا بڑا فرق نظر آتا ہے کہ درمیان میں برسوں نہیں بلکہ صدیوں کی مسافت معلوم ہوتی ہے۔ حضرتؒ نے عالم اسلام کے مختلف ملکوں کے حالات کا جائزہ لیا، اور عالمی سطح پر اپنی پرزور تحریروں سے ایک ایک ملک کے مسلمانوں کو مخاطب فرمایا، ان ممالک کی خصوصیات کا اعتراف بھی کیا، اس کے ساتھ مغربی تہذیب کے جو مضر اور دین دشمن اثرات وہاں پڑ رہے تھے پوری قوت و جرأت کے ساتھ ان کی نشاندہی فرمائی اور ان کو ان ہی کی زبان میں ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر خطاب کیا، ان کے دھڑکتے ہوئے دلوں پر دستک دی اور ان کی خودی کو للکارا اور ان خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی سعی کی جو اس تہذیب کے ظاہری شکوہ وسطوت میں دب کر رہ گئی تھیں۔ حضرتؒ کی آواز ان حالات میں اگرچہ نامانوس تھی لیکن یہ ان کے دل کی آواز اور ضمیر کی للکار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی ملکوں میں خاص طور پر عرب ممالک میں جو مغرب کے دست نگر بنے ہوئے تھے اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اور ہر طبقہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ چیز ان میں اسلامی بیداری کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، لوگوں کا طرز فکر بدلنے لگا، مغربی تہذیب کے بادل چھٹنے لگے اور خود اہل مغرب کو محسوس ہونے لگا کہ اگر اس فکر کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو یہ مغربی تہذیب کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ اسی لئے برطانیہ کے بعض ماہرین فکر و ماہرین تعلیم نے وہاں حضرتؒ کی بعض کتابوں پر پابندی کا بھی مطالبہ کیا۔

حضرتؒ کے اس انداز خطاب نے پورے عالم اسلام پر اثر ڈالا، اسلام کا حقیقی چہرہ لوگوں کے سامنے آیا، اس کی روشنی و تابناکی سے مسلمانوں کے قلوب منور ہوئے اور یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ دنیا کے خانہ میں مسلمان ایک موثر عامل (Factor) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ترقی میں دنیا کی ترقی مضمر ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات

www.abulhasanalinadwi.org

یکسر فراموش کردی گئیں تو یہ دنیا اخلاقی انارکی اور انسانی قدروں کی پامالی میں اس حد تک جاسکتی ہے کہ اس کا دیوالیہ پن ظاہر ہو جائے۔(۱)

حضرت کی اس فکر و دعوت نے خود اعتمادی کی فضا قائم کی۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت پیدا ہوئی اور حضرتؒ کی ذات کو عالم اسلام میں وہ مقبولیت و محبوبیت عطا ہوئی جو قریبی زمانہ میں شاید ہی کسی کے حصہ میں آئی ہو۔

عالم اسلام کے لئے مرکز اتصال و وحدت

عالم اسلام میں حضرتؒ کی مقبولیت و محبوبیت میں بنیادی حصہ اگر چہ حضرتؒ کے اسی تجدیدی کارنامہ کو ہے کہ وہ فکر پورے عالم اسلام کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی حضرتؒ کی جامعیت، اصابت فکر، زہد و استغنا اور اس اسلامی و ایمانی زندگی کو بھی اس میں بڑا دخل ہے جو حضرتؒ کو دوسرے معاصر مفکرین و علماء سے ممتاز کرتی ہے۔ حضرتؒ نے ہر طبقہ کے لوگوں کو مخاطب فرمایا، غریبوں کے دروازوں کو بھی کھٹکھٹایا، امراء کے دلوں پر بھی دستک دی اور خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کیا۔

حضرتؒ نے وہ کریمانہ اخلاق اپنائے جن کو اخلاق نبوی (**علی صاحبها الصلاۃ و السلام**) کا پرتو کہا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ طبیعت کی نرمی، تواضع و انکسار، قوم و ملت کے لئے خیر خواہی و خیر طلبی، دلسوزی و دردمندی، حصول مقصد کے لئے لگن اور قربانی، والہانہ جذبہ عمل، فہم و فراست اور مقصد کی بلندی جیسی ممتاز صفات ان کی خصوصیات ہیں۔ دوسروں کے لئے وسعت قلبی کا حال یہ تھا کہ دین و ملت کی تعمیر میں حصہ لینے والے ہر ہر فرد اور جماعت کے لئے آپ کے دل میں جگہ تھی۔ اسی طرح کسی کی دل آزاری کرنا تو گویا آپ کے یہاں کفر تھا۔

---

(۱) حضرتؒ کے اس امتیازی وصف اور تجدیدی کارنامے کو تفصیل کے ساتھ واضح کرنے کے لئے مستقل تصنیف درکار ہے، جس کے لئے کسی ایسے وسیع المطالعہ اور صاحب بصیرت مصنف کی ضرورت ہے، جس کو حضرت کے ساتھ طویل رفاقت کا شرف حاصل رہا ہو، خدا کرے یہ کام بھی انجام پائے اور دعوت و عمل کے میدان میں اس سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

www.abulhasanalinadwi.org

وسعت فکر ونظر کے باوجود اس میں پورے طور پر سلامت روی اور دین میں پورا تصلب کہ طریقہ سلف سے ذرا بھی انحراف وشذوذ نہ ہو آپ کا امتیازی وصف ہے۔ آپ نے دین کو اس کی اصل شکل میں زمانہ اور حالات کی رعایت کرتے ہوئے اس طرح پیش فرمایا کہ اس کی ابدیت وحقانیت پر اعتماد بحال ہوا، یہ ایسی وسیع و ہمہ گیر اور بنیادی فکر تھی کہ پورے عالم اسلام پر اس کی چھاپ پڑی۔

اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ ہوا کہ پورے عالم اسلام میں آپ کی حیثیت ایک مرکز اتصال و وحدت کی ہوگئی۔ ہر صحیح الفکر جماعت تنظیم اور ادارے میں آپ کی شرکت اور سرپرستی کو اس کے لئے قابل فخر سمجھا جانے لگا، وہ علمی اکیڈمیاں ہوں، دعوتی وفکری تحریکات ہوں یا علمی یقہائے تصوف وارشاد ہوں، ان کا تعلق عرب سے ہو یا عجم سے ہر جگہ حضرتؒ کی ذات صرف رکن رکین ہی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر صدر نشین نظر آتی ہے۔

مقبولیت کا راز اور ظاہری طور پر اسکے تکوینی عناصر

مجددین و مصلحین کی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور ان کی زندگیوں کا جائزہ لینے سے صاف نظر آتا ہے کہ تین اوصاف ان کے اندر مشترک ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ یہی اوصاف اللہ کی طرف سے "انتخاب واصطفاء" کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان میں پہلی چیز آبائی خصوصیات بالاخص ان کا تقویٰ واحتیاط اور حرام بلکہ مشتبہ مال سے بھی حد درجہ اجتناب ہے اس کا نسل پر اثر پڑنا ایک قدرتی امر ہے۔ دوسری چیز اصلاح وتربیت کے لئے مناسب ماحول کا ملنا اور ایسے تربیت کرنے والے معلمین واساتذہ کا میسر آنا ہے جو خود بھی صاحب درد وفکر ہوں۔ تیسری چیز ذاتی محنت اور وہ طلب وذوق ہے جو ایک قوت محرکہ کی حیثیت رکھتا ہو۔

حضرتؒ کی زندگی ان تینوں چیزوں کی آئینہ دار نظر آتی ہے۔ آپ کے خاندان میں علم کے ساتھ ہمیشہ زہد واتقاء اور تربیت نفس کا اہتمام رہا، خاص طور پر آپ کی جدی شاخ اس صفت میں ممتاز تھی۔ والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنیؒ نے دو

www.abulhasanalinadwi.org

چیزوں کا غایت درجہ خیال رکھا؛ ایک دل آزاری سے اجتناب آخری درجہ میں تھا، دوسرے اس کا شدت کے ساتھ اہتمام تھا کہ مشتبہ ومشکوک مال کا ایک حبہ بھی گھر میں داخل نہ ہونے پائے۔ جد مادری حضرت شاہ ضیاء النبیؒ اپنے زمانے کے عارف کامل اور اپنے دور میں عظمت و بزرگی کی علامت تھے، خاندان میں ان کے اخلاص و استقامت کے چرچے تھے، حضرتؒ کے دل ودماغ پر قدرتی طور پر اس کا بھی اثر پڑا۔ اس کے علاوہ خاندان کی نمایاں شخصیات کی امتیازی صفات وخصوصیات جن کا چرچا ہونا ایک قدرتی امر ہے، نسلی طور پر حضرتؒ میں منتقل ہوئیں، خاص طور پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی ذات والا صفات نے ذہنی وفکری طور پر متاثر کیا، حضرتؒ نے اصلاح و تجدید کی جو کوششیں فرمائیں ان پر سید صاحبؒ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

دوسری چیز جو کسی بھی شخصیت کی تشکیل میں موثر کردار ادا کرتی ہے وہ سازگار ماحول کا ملنا اور صاحب ذوق وصاحب فکر معلم ومربی کا فراہم ہونا ہے۔ حضرتؒ کے والد ماجد کی اس وقت وفات ہوئی کہ حضرتؒ کی عمر صرف نو سال کی تھی مگر برادر معظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ نے آپ کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو تعلیم وتربیت کا بڑا حکیمانہ ذوق عطا فرمایا تھا، ان کی نگاہ بڑی دوررس اور فکر بڑی وسیع تھی، پورا عالم اسلام گویا ان کی نگاہ میں تھا، کسی ملک میں اگر کسی مسلمان پر بحیثیت مسلم کے ضرب آتی تو وہ اس کی چوٹ اپنے دل پر محسوس کرتے تھے، وہ زمانہ کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر اور اس کے نبض شناس تھے۔ دوسری طرف ان کو اشاعت اسلام کی ہمیشہ فکر رہا کرتی تھی۔ انھوں نے حضرتؒ کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا کہ وہ عالمی سطح پر اصلاح وتجدید کا فریضہ انجام دے سکیں، ان کے اندر وہ استعداد پیدا ہو کہ ہر طبقہ کے لوگوں سے آنکھیں ملا کر بات کرسکیں، ان میں فکر ونظر کی وسعت اور دعوت کی ایسی لگن اور اصلاح امت کا ایسا جذبہ اور درد پیدا ہو جو انبیاء کرام خاص طور پر نبی آخر الزماں ﷺ کی میراث ہے، اور ان کی زندگی خود نمونۂ سلف اور لائق تقلید واتباع بن سکے۔

www.abulhasanalinadwi.org

ڈاکٹر صاحبؒ نے ذاتی طور پر تربیت اور ذہنی وفکری تشکیل کے علاوہ حضرتؒ کو اپنے اپنے فن کے ماہرین کے پاس بھیجا، عربی تعلیم کے لئے شیخ خلیل عرب صاحبؒ کا انتخاب کیا جو اس فن میں نادرہ روزگار تھے۔ حدیث کی تعلیم کے لئے علامہ حیدر حسن خاں صاحبؒ کے درس میں شریک کیا جو امام المحدثین شیخ حسین یمانیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ تعلیم سلوک اور تربیت وتزکیہ کے لئے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں لاہور بھیجا۔ ضروری انگریزی تعلیم بھی دلوائی۔ دعوت وتبلیغ کے میدان میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی رفاقت اوران کے ساتھ شرکت کو پسند فرمایا۔ پھر عالمی سطح پر دعوت وارشاد کے لئے حضرت کو ذہنی وفکری غذا فراہم کرتے رہے اور ابتدائی دعوتی سفروں میں خطوط کے ذریعہ رہنمائی فرماتے رہے۔ حضرتؒ کی سیرت سازی میں بنیادی حصہ ڈاکٹر صاحبؒ کی اسی تعلیم وتربیت اور فکر وتوجہ کا ہے۔

تیسری صفت جو شخصیت کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ ذاتی محنت اور شوق وطلب ہے، حضرتؒ کی پوری زندگی اس کی اعلیٰ مثال ہے، آپ نے کسی مقام پر پہنچ کر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے والہانہ جذبہ عمل اور لگن سے آگے بڑھتے رہے، درمیان میں بڑی دشوار گزار گھاٹیاں بھی آئیں، غیروں نے بھی ملامت کی۔ اپنوں نے بھی ساتھ چھوڑا لیکن مسافر کا سفر جاری رہا اور اپنی زندگی کے اخیر لمحہ تک اس میں کبھی توقف نہیں ہوا۔

ان تین بنیادی صفات وخصوصیات کے علاوہ ایک مزید نعمت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عطا ہوئی اور اس کا آپ کی زندگی پر گہرا اثر پڑا وہ والدہ ماجدہ کی وہ دعائیں ہیں جو انھوں نے آپ کے لئے دل کی گہرائیوں سے کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صاحب دعا بنایا تھا، دعا ان کی دوا بھی تھی اور غذا بھی، اوران کی ساری دعا حضرتؒ کے لئے تھی۔ دعا میں ان کے ناز وانداز اور گریہ واضطراب کا ذکر ان کے تذکرہ میں تفصیل سے آئے گا۔ لیکن بہرحال حضرت کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں اس عنصر کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

یہ چار وہ عناصر ہیں جو حضرت کی سیرت کی تشکیل وتعمیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور انتخاب کا نتیجہ ہے، جب وہ اپنے کسی بندہ کو کسی کام کے لئے منتخب کر لیتا ہے تو اس کے لئے وہی ضروری اسباب اور سازگار ماحول بھی پیدا فرماتا ہے۔ **وذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم.** (۱)

www.abulhasanalinadwi.org

(۱) خود حضرتؒ نے مجلس میں متعدد مرتبہ یہ بات فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ توفیق دی وہ سب والد کے اخلاص وصلاح، والدہ کی دعائیں، بھائی صاحب کی تربیت اور اساتذہ ومشائخ کی محبت وشفقت کا فیض ہے۔

دوسرا باب

خاندان، جدامجد، والد ماجد، والدہ صاحبہ اور برادر معظم

سیرت سازی میں خاندان اور قریبی اجداد کی اہمیت

''انسان کے مزاج و مذاق کی تشکیل، اسکے فطری جوہر چمکانے اور اکثر اوقات زندگی کا رخ متعین کرنے میں اسکے خاندان اور قریبی اجداد کا اثر علم الحیات اور علم النفس کی ایک مسلمہ حقیقت ہے جسکی تصدیق گذشتہ تاریخ نیز پے در پے مشاہدات و تجربات سے ہوتی رہتی ہے جسکا انکار ایک امر بدیہی کا انکار ہے۔
یہ اثر انسان پر دو راستوں سے ہوتا ہے؛ ایک نسلی طور پر کہ یہ خصائص (کمالات و کمزوریاں) باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ دوسرے ذہنی و فکری طور پر خاندانی روایات اور آباء و اجداد کے قابل فخر کارناموں کا تذکرہ، ان کے اصولِ زندگی عقائد و مسلمات اور ان کے معیار و اقدار کا چرچا جن کو وہ ہمیشہ سینے سے لگائے رہے، خاندان کی محبوب و مقتدر شخصیتوں کے نام، پھر ان مقاصد کا ذکر جن کے لئے انھوں نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا، بچپن سے کانوں میں پڑتے ہیں، اور وہ اس کے دل و دماغ کی تختی پر نقش کالحجر ہو جاتے ہیں، اور یہ سب چیزیں شعوری غیر شعوری طور پر اس کی شخصیت و سیرت کی تعمیر اور اسکی صورت گری کرتی ہیں۔''(۱)

(۱) حیات عبدالحی ص۱۹-۲۰

www.abulhasanalinadwi.org

خاندان

مفکر اسلام امام العصر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس اللہ اسرارہم نے ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جو ایک طویل زمانہ سے علمی و دینی خدمات انجام دے رہا تھا، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی پوری تاریخ میں شاید کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں کوئی مصلح، مصنف اور داعی نہ پیدا ہوا ہو، درمیان میں اس میں ایسے ایسے مجدد دین اور حاملین دعوت بھی پیدا ہوئے جنھوں نے بعض مرتبہ صدیوں تک فکری قیادت کی، اور جن کی تجدید و اصلاح کی فکر و دعوت کو لے کر عرصہ تک کام کرنے والے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔

اس سلسلۃ الذہب کی سب سے پہلی کڑی جس نے ہجرت و جہاد اور اصلاح کے ارادے سے ہندوستان کا رخ کیا وہ امیر کبیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد المدنیؒ کی ذات تھی جو چھٹی صدی کی ابتدا میں اپنے ہزاروں معتقدین کے ساتھ تشریف لائے اور ''کڑہ مانک پور'' کے نواح میں جہاد کر کے اس ظلمت کدہ کو نور اسلام سے منور کیا۔ امیر قطب الدین مدنیؒ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بھانجے اور بیک واسطہ خلیفہ تھے، براہ راست بھی شیخ سے استفادہ کیا تھا، جلیل القدر اولیاء اللہ میں سے تھے، کڑہ ہی میں وفات پائی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ سلطان قطب الدین ایبک آپکا دست گرفتہ اور معتقد تھا۔

امیر قطب الدینؒ کی اولاد میں اتنے اولیاء، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے کہ کم خاندانوں میں اس کی مثال ملے گی۔ ان کے حفید سعید قاضی سید رکن الدینؒ بڑے بلند پایہ تھے، پھر ان کی اولاد میں حضرت قاضی سید احمد نصیر آبادیؒ بڑے باحمیت اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ ان کے پوتے حضرت سید محمد فضیلؒ بھی زہد و ریاضت اور اتباع سنت میں مرتبہ عالی رکھتے تھے۔ دوسرے پوتے حضرت سید محمد اسحاقؒ بھی عارف کامل تھے۔ ان کے صاحبزادے دیوان خواجہ احمد نصیر آبادیؒ زبردست عالم اور صاحب

www.abulhasanalinadwi.org

شجرہ نسب

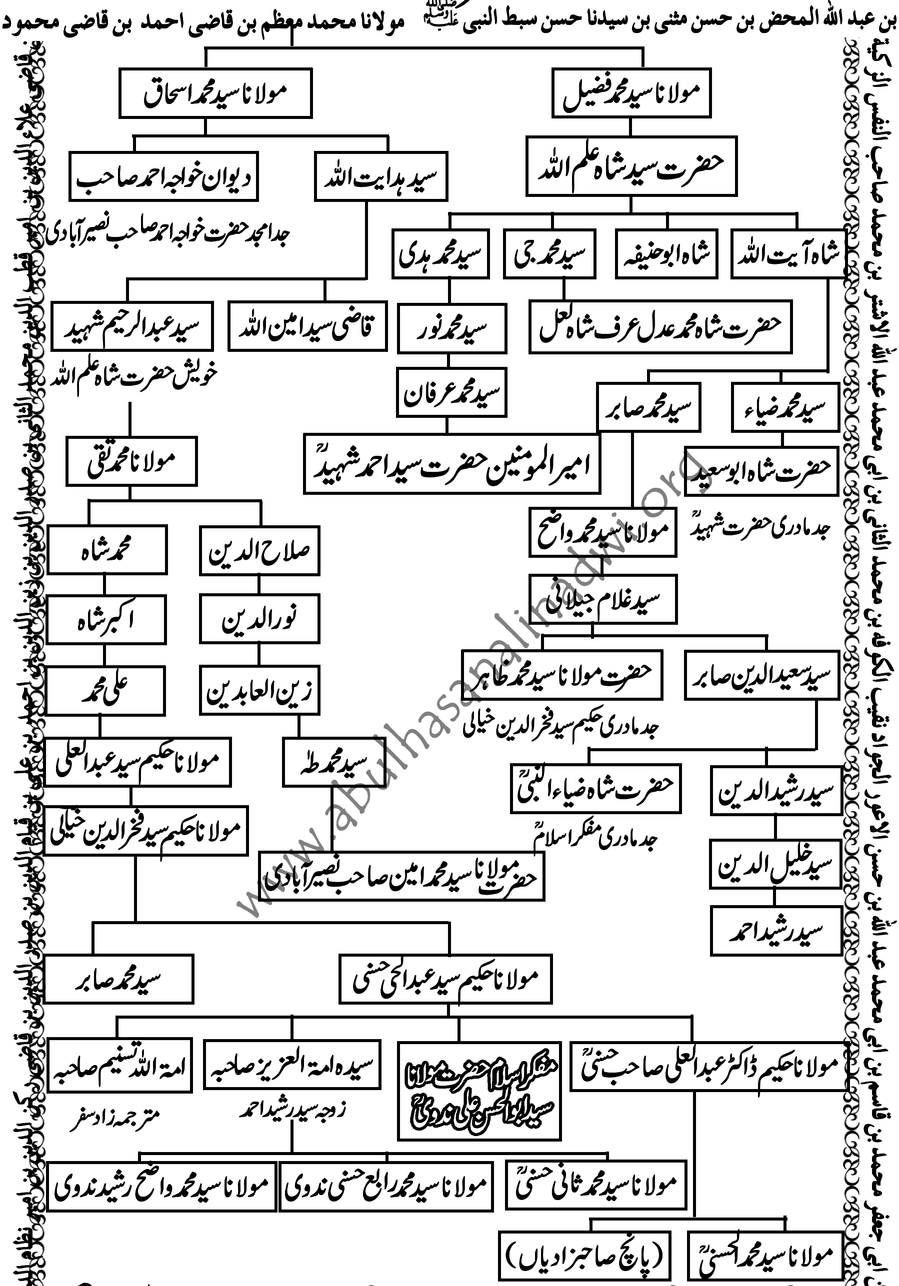

www.abulhasanalinadwi.org

سلسلہ شیخ طریقت تھے۔ حضرت سید محمد فضیلؒ کے صاحبزادہ حضرت سید شاہ علم اللہؒ اس سلسلۃ الذہب میں اپنی ایک شان رکھتے ہیں، آپ حضرت سید آدم بنوریؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے، اتباع سنت میں دور دوران کی نظیر ملنی مشکل ہے(۱)، شاہ صاحب کی اولاد میں حضرت مولانا سید محمد جیؒ حضرت شاہ لعل صاحبؒ، حضرت مولانا سید محمد حیاءؒ، حضرت مولانا سید محمد صابرؒ، حضرت شاہ ابوسعید صاحبؒ، حضرت شاہ محمد واضح صاحبؒ، حضرت مولانا سید محمد قطب الہدیٰ محدثؒ، حضرت مولانا سید محمد ظاہرؒ اور حضرت شاہ ضیاء النبیؒ بڑے بلند پایہ گزرے ہیں، لیکن ان میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت سید احمد شہیدؒ کی ہے، جو حضرت شاہ صاحبؒ کی چوتھی پشت میں ہیں، ان کے انفاس قدسیہ سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہونچا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ان کی برکات سے وہی لوگ انکار کرسکتے ہیں جو علم وعرفان کی روشنی سے فیضیاب نہیں۔(۲)

حضرت سید محمد اسحاقؒ کے دوسرے صاحبزادے سید ہدایت اللہؒ بلند پایہ عالم تھے، عہد شاہجہانی میں امور مذہبی کے صدر الصدور تھے، ان کی چھٹی پشت میں مولانا سید عبد العلیٰؒ ایک درویش سیرت فاضل بزرگ گزرے ہیں، جو سید احمد شہیدؒ کے مرید و مجاز تھے، خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ جب ڈاک سامنے آتی تو نامۂ اعمال یاد کرکے گریہ طاری ہوجاتا، نقاشی وخوشخطی کا اعلیٰ ذوق تھا، زیادہ تر آمدنی مستحقین پر صرف کردیتے، ''دست بکار دل بیار'' کانمونہ تھے، اخلاقِ کریمانہ کے ساتھ زندگی گزاردی، اور صرف ۴۸ سال کی عمر میں فالج کے مرض میں انتقال فرمایا، آخری کلام جو زبان سے ادا ہوا وہ ''ھو الرفیق الاعلیٰ'' تھا۔

جدامجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ

حضرت کے جدامجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ انہیں مولانا عبد العلی صاحبؒ

(۱) ملاحظہ ہو ''تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ'' از مولانا سید محمد الحسنیؒ

(۲) ملاحظہ ہو ''سیرت سید احمد شہید'' (۱-۲) از حضرت والاؒ اور ''سید احمد شہید'' از مولانا غلام رسول مہر

کے فرزند ہیں، دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ کو ولادت ہوئی۔ والد محترم کا کم سنی میں انتقال ہوگیا، اپنے نانا مولانا محمد ظاہرؒ کے دامن تربیت میں پرورش پائی، تعلیم کی تکمیل مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ کے درس میں ہوئی، طب اور شاعری میں بھی رسوخ پیدا کیا، مزاج میں خاموشی، متانت، حلم اور عزلت پسندی انتہا درجہ کی تھی، صبر وقناعت کی صفت ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی، تمکنت اور غرور ان کو چھو کر نہیں گیا تھا۔

راجپوتانہ، حیدرآباد، بھوپال اور ٹونک میں ملازمت کی خاطر طویل قیام فرمایا، خاص طور پر حیدرآباد کے مختلف اضلاع میں آٹھ سال تک صدر مدرسی کرتے رہے لیکن ملازمت سے کبھی مناسبت نہیں رہی، اسی لئے کہیں مستقل قیام نہ ہوسکا، آخری سفر ٹونک کا ہوا، نواب ابراہیم علی خاں نے صیغۂ طبابت سے مشاہرہ مقرر کردیا، ڈیڑھ سال قیام کے بعد پھر وطن چلے آئے اور ایسے آئے کہ پھر کہیں نہیں گئے، وطن کے گوشۂ عزلت میں پوری زندگی گزاردی۔

بیعت طریقت اپنے پھوپھا حضرت خواجہ احمد صاحبؒ سے کی تھی، اجازت سے بھی سرفراز کئے گئے، حضرت مولانا محمد ظاہر صاحبؒ نے بھی اجازت بیعت مرحمت فرمائی تھی، مگر کبھی پیری مریدی نہیں کی، ذکر وشغل طریقہ نقشبندیہ کے مطابق کرتے، کتب بینی اور تصنیف وتالیف سے خاص مناسبت تھی، تاریخ کا بڑا اچھا ذوق تھا، درس و تدریس کا بھی سلسلہ جاری رہتا۔ فارسی، اُردو میں متعدد تصانیف اور دیوان یادگار ہیں۔ عربی میں بھی بعض تصانیف موجود ہیں، اشعار بھی کبھی کبھی عربی میں رقم فرمایا کرتے تھے۔

تصانیف میں سب سے زیادہ اہم ''مہر جہاں تاب'' ہے، جو فارسی میں ہے، پہلی جلد فلسکیپ کی تقطیع میں ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں تین دفتر ہیں، دفتر اول میں علوم وفنون، متعارف وغیر متعارف کے مسائل لکھے ہیں۔ دفتر دوم میں انبیاء کرام، اہل بیت، صحابہؓ، تابعین اور محدثین، علماء، حکماء اور مشائخ کے حالات جدا جدا قلم بند فرمائے ہیں۔ تیسرے دفتر میں عربی، فارسی، اُردو اور بھاشا کے شاعروں کے حالات

ہیں۔ دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی چاہی تھی، جس میں ایشیا کا بڑا حصہ ہو چکا تھا اور جلد آدھی ہو چکی تھی کہ ان کو یہ احساس ہوا کہ جس زبان میں وہ یہ کتاب لکھ رہے ہیں اس کا زمانہ نے ورق اُلٹ دیا ہے، اس سے ان کی ہمت پست ہوگئی، مگر پھر دوبارہ ہمت کر کے اردو میں از سر نو لکھنا شروع کیا، اس کے بارہ جزء ہوئے تھے کہ پیغام اجل آ گیا۔

طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا، اظہار کمال سے سخت نفرت تھی، یہی وجہ تھی کہ زندگی میں ان کو کم کسی نے جانا، اور اپنے تمام تر علمی و عملی کمالات کے باوجود گوشۂ گمنامی میں چھپے رہے۔ وفات کا حال خود صاحب حال کے باکمال فرزند مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے :

''وفات کی رات کو نبض ساقط ہوگئی، سوائے سانس کی آمدوشد کے زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہی، رات کو دس بجے یک بیک جنبش پیدا ہوئی، دائیں پہلو کی طرف خود بخود جھک گئے، اور قلب جاری ہوگیا اور اس میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ سو قدم کے فاصلہ سے لفظ اللہ سنا جا سکتا تھا، ایک بجے رات تک یہ حال رہا، پھر اضمحلال پیدا ہوگیا، اس وقت فقیر نے حاضر الوقت اصحاب سے کہا کہ سورۂ یٰسین پڑھیں، اس کے شروع ہوتے ہی خاموشی اور سکون پیدا ہوگیا، پھر حاضرین نے تلقین شروع کی اور حضرت نے ذکر لسانی شروع فرمادیا، اور اسی حال میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، یہ واقعہ ۱۰؍رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ کا ہے۔''(۱)

جد مادری حضرت سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ

حضرتؒ نے اگرچہ شاہ صاحب ممدوح کا زمانہ نہیں پایا، حضرت کی ولادت اور شاہ صاحب کی وفات میں پورے پانچ سال کا وقفہ ہے، لیکن چونکہ شاہ صاحب اس دور میں عظمت و بزرگی کی علامت اور پورے خاندان ہی نہیں بلکہ قرب و جوار کے

(۱) انتخاب وتلخیص از حیات عبدالحی، الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ۔

www.abulhasanalinadwi.org

اضلاع میں مرجعیت کے مقام پر فائز تھے، اسلئے وفات کے بعد بھی خاندان میں ان کے اتباع سنت کے اہتمام، نمازوں میں غایت درجہ خشوع وخضوع اور اخلاص واستقامت کے چرچے تھے۔ ایک نواسے کی حیثیت سے اور والدہ ماجدہ کی نسبت سے دل ودماغ پر اس کا اثر پڑنا لازمی اور قدرتی تھا کہ ماں کی گود انسان کی پہلی تربیت گاہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ دائرہ شاہ علم اللہ میں ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں حاصل کی، پھر دہلی پا پیادہ سفر کیا، خانقاہ مجددیہ میں قیام کیا، حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ اور مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ کا زمانہ تھا۔ دو سال ٹھہر کر لکھنؤ واپس ہوئے اور مفتی سعد اللہ صاحب مراد آبادیؒ اور بعض دوسرے علماء سے استفادہ کیا، پھر وطن واپس ہوئے۔ حضرت خواجہ احمد صاحب نصیر آبادیؒ سے بیعت کی اور طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی وفات کے بعد خواجہ فیض اللہ صاحب اورنگ آبادیؒ سے تکمیل فرمائی اور مجاز ہوئے۔

۱۲۹۳ھ میں حج سے مشرف ہوئے، واپسی پر علماء ومشائخ کا بکثرت رجوع ہوا، جن میں مولانا ابوالخیر مکیؒ، مولانا ابراہیم صاحب آرویؒ اور مولانا محمد امین صاحب نصیر آبادیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اخلاص واستقامت، فرائض ادا کرنے کا اہتمام، عبادت میں خشوع وخضوع، نماز وتلاوت کا سچا عشق اور اس میں محویت واستغراق ان کا ایسا امتیاز تھا جس نے ان کو ابنائے زمانہ سے ممتاز کر دیا تھا۔ ان کے خشوع فی الصلاۃ کے واقعات سن کر اکابر سلف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ تربیت سلوک اور فیض باطنی میں شیخ کامل تھے، نسبت اور توجہ بڑی موثر تھی، صاحب املاک وجائداد تھے مگر اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ۱۹۰۸ء میں انتقال فرمایا، دو صاحبزادے (سید احمد سعید صاحبؒ اور حافظ سید عبید اللہ صاحبؒ) اور پانچ صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں، ان میں سب سے چھوٹی صاحبزادی سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ ہندوستان کے مایہ ناز مورخ، صاحب ذوق محدث اور صاحب دل عالم تھے۔ ۱۸؍رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ میں دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ولادت ہوئی۔ نانی صاحبہ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھیں، اور بڑی عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، بچپن کا کچھ حصہ ان کی آغوش تربیت میں گزرا۔ خود مولانا فرماتے ہیں کہ ''میری نانی صاحبہ مجھے یہ لوری سناسنا کر سلاتی تھیں ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب (۱)

بچپن ہی سے نہایت سنجیدہ مزاج، خاموش اور متین تھے، نہ کسی کا دل دکھایا نہ لڑے جھگڑے۔

ابتدائی تعلیم ہنسوہ میں ہوئی جو آپ کا ننھیال تھا، فارسی منشی محمد طلیق سے پڑھی جو رشتہ کے ماموں مولانا شاہ عبدالسلام صاحبؒ کے مرید تھے۔ ابتدائی عربی تعلیم خود شاہ صاحب ممدوح سے حاصل کی۔ پھر جب دادیہال میں قیام رہنے لگا تو حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ سے ابتدائی صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں، رائے بریلی کے قیام میں کچھ دن انگریزی بھی پڑھی پھر الٰہ آباد تشریف لے گئے اور مولانا محمد حسین صاحب الٰہ آبادیؒ سے تعلیم حاصل کی، کچھ مہینوں کے لئے فتحپور میں رہ کر مولانا نور محمد صاحبؒ سے فقہ کی کوئی کتاب پڑھی، ۱۳۰۱ھ میں والد مرحوم کے پاس پھر بھوپال تشریف لے گئے، دو سال وہاں رہ کر مختلف علماء سے تحصیل علم میں مشغول رہے، ۱۳۰۳ھ کے وسط میں واپس تشریف لے آئے اور کچھ دن وطن میں رہ کر تحصیل علم کے لئے لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ میں آپ نے مولانا امیر علی صاحبؒ، مولوی الطاف حسین صاحبؒ،

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۱۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولوی فتح محمد صاحب تائبؒ، مولانا فضل اللہ صاحبؒ اور مولانا محمد نعیم صاحبؒ فرنگی محلی سے کتب درسیہ پڑھیں، فراغت کے بعد وطن تشریف لائے اور اسی دوران آپ کا نکاح ہوا اور اس کے بعد کچھ دن وطن میں قیام رہا پھر تعلیم کی تکمیل کے لئے بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں قاضی عبد الحق صاحبؒ سے باقی کتب درسیہ پڑھیں، مولانا سید احمد صاحب دیوبندیؒ سے ریاضی پڑھی اور شیخ محمد عربؒ سے ادب کی تکمیل کی، ان کے والد نامدار شیخ حسین بن محسن یمانیؒ سے حدیث پڑھی اور اجازت لی، شیخ کو آپ سے بڑی محبت تھی، آپ کی فرمائش پر شیخ نے بعض رسائل بھی تصنیف فرمائے۔

طب کی تعلیم حکیم عبد العلی صاحبؒ اور حکیم عبد العزیز صاحبؒ کے یہاں مکمل ہوئی۔

طالب علمی ہی کے دور میں حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ سے بیعت کا تعلق قائم فرمایا اور حضرت نے خصوصی توجہ فرمائی لیکن ان سے زیادہ استفادہ کا موقع نہیں مل سکا، اس لئے منازل سلوک اپنے خسر حضرت شاہ ضیاء النبیؒ اور والد ماجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ کی خدمت میں طے کئے۔ شاہ عبد السلامؒ کے خلفاء مولانا امین الدین کنتھویؒ اور جناب قدرت علی صاحبؒ سے بھی اس سلسلہ میں فیض حاصل کیا۔ مذکور الصدر تینوں بزرگوں نے آپ کو اجازت بیعت مرحمت فرمائی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی مراسلت کے ذریعہ سے استفادہ کیا اور انھوں نے بھی اپنے ایک مکتوب میں آپ کو اجازت دی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حساس دل عطا فرمایا تھا، اصلاح و انقلاب کی جو کوششیں کی جاتیں دل و جان سے ان کا تعاون فرماتے، طالب علمی ہی کے دور میں دار العلوم کے ابتدائی جلسوں میں شرکت فرمائی، پھر فارغ ہونے کے بعد وطن میں ''انجمن آل ہاشم'' کی بنیاد ڈالی، پھر شوال ۱۳۱۲ھ سے باقاعدہ دار العلوم کی خدمت کا آغاز فرمایا اور ایک مدت تک بلا کسی معاوضہ کے صبر و استقلال کے ساتھ معاون ناظم کی حیثیت سے کام کرتے رہے، بعد میں ارکان کے اصرار پر معاوضہ لینا قبول فرمالیا، اس دوران تعلیم

www.abulhasanalinadwi.org

ادب وافتاء کا کام بھی کرتے رہے، اپنی مسجد میں وعظ بھی فرماتے، دس سال تک یہی سلسلہ رہا پھر معاوضہ ترک فرمادیا اور حصولِ معاش کے لئے مطب شروع کیا، اس میں بھی خدمت ہی مقصود تھی۔

جب دارالعلوم میں انتشار شباب کو پہونچا تو بالاتفاق ۱۳؍اپریل ۱۹۱۵ء میں نظامت کے لئے آپ کا انتخاب ہوا۔ نظامت کا ابتدائی دور گذشتہ اختلافات کے اثرات کو دور کرنے، ملک میں ادارہ کا وقار بحال کرنے اور مالی بحران دور کرنے میں گذرا۔ پھر آپ نے تعلیم وتربیت کی طرف توجہ فرمائی لیکن پیغام اجل آ گیا اور آپکو اس کا زیادہ موقع نہیں مل سکا۔

خلوت پسندی، وقار، کم گوئی، صبر، تواضع، فنائیت، تسلیم ورضا، جود وسخا، سلامت طبع جیسے اخلاق میں آپکو امتیاز حاصل تھا۔

والدین کے مطیع وفرمانبردار، اہل وعیال پر شفیق تھے، جو اعزہ واحباب حاجتمند ہوتے ان کے ساتھ سلوک وصلہ رحمی اس طرح فرماتے کہ گھر والوں کو بھی خبر نہ ہوتی۔ خاندان کے حقوق ادا کرنے کا بڑا خیال رہتا، آپ کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچی۔ دوسروں کا دل دکھانا گویا آپ کے مسلک میں کفر تھا۔ والد کے احباب اوران سے تعلق رکھنے والوں کا آپ کو بہت خیال رہتا۔

دن بھر کی آمدنی رات تک خرچ کرنا ضروری سمجھتے اور رات کو روپیہ باقی رکھنا برا سمجھتے تھے۔

زیادہ وقت کتب بینی اور تصنیف وتالیف میں صرف ہوتا تھا۔ تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا، تفسیر وحدیث، ادب اور طب کا درس دیتے تھے، درس حدیث کا سلسلہ آخری دن تک جاری رہا اور وفات کے دن بھی اس میں ناغہ نہیں ہوا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے آپ سے ''مقامات'' کے کچھ حصے پڑھے ہیں۔

نوافل میں اقتصاد پسند فرماتے، اتباع سنت کا غایت درجہ اہتمام تھا، مشتبہ مال سے حد درجہ اجتناب تھا، فکر میں بڑا توازن تھا، ذکاوت وذہانت میں ممتاز تھے، طبیعت

www.abulhasanalinadwi.org

ایسی سلیم تھی کہ ہر چیز کی اہمیت اسی تناسب سے سمجھتے جس تناسب کو فطرت نے قائم کر دیا ہے۔

اردو، فارسی اور عربی ادب میں بلند پایہ رکھتے تھے، تاریخ سے خاص لگاؤ تھا، اسلامیان ہند کی تاریخ میں امامت کا مرتبہ حاصل تھا، تفسیر و حدیث کا اچھا ذوق تھا، اخیر میں حدیث کی اتنی مزاولت بڑھ گئی تھی کہ تاریخ کا ذوق بھی ماند پڑ گیا تھا۔ اخیر میں یہ بھی تمنا تھی کہ فرزند اکبر ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ فارغ ہوں تو ان کو مطب میں بٹھا کر خود بقیہ زندگی درس حدیث میں مشغول رہ کر وطن میں گزار دیں۔ فقہی مسائل میں بھی فیصلہ کن رائے رکھتے تھے۔(۱)

۱۵/جمادی الاخریٰ ۱۳۴۱ھ مطابق ۲/فروری ۱۹۲۳ء میں اچانک رحلت فرمائی۔ بقول حضرتؒ کے وہ چراغ گل ہو گیا جس کی روشنی میں لوگوں نے اسلاف کے مٹے ہوئے نقش قدم اور کاروان رفتہ کے دھندلے نقوش، سلف صالحین و علماء متقدمین کے کتنے کارنامے جو تہہ بتہہ پردوں میں چھپے پڑے تھے، کاغذ کے صفحات پر دیکھے اور آئندہ نسلیں بھی ان کو دیکھتی رہیں گی، وہ چراغ جو ثلث صدی تک دلوں کو حرارت و نور سے بھرتا رہا اور حلقہ احباب ہی میں نہیں بزم علم و دین میں بھی شمع انجمن بنا رہا۔

آپ نے اپنے پیچھے متعدد شاہکار تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا جن میں ممتاز ترین کتاب ''**نزهة الخواطر**'' ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں ہندوستان کے ساڑھے چار ہزار باکمال مشاہیر رجال کا تذکرہ ہے۔ کتاب اپنی وسعت و جامعیت، حسن انتخاب، مورخانہ دیدہ وری، پھر زبان کی حلاوت و چاشنی میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ممتاز کتابوں میں ''**الهند في العهد الاسلامي**'' اور ''**الثقافة الاسلامية في الهند**'' بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ حدیث میں ''**تلخيص الاخبار**'' کے نام سے ایک بہترین انتخاب فرمایا پھر

---

(۱) انتخاب و تلخیص ''ترجمہ مصنف'' یاد ایام از مولانا حکیم ڈاکٹر عبد العلی صاحب حسنی رحمۃ اللہ علیہ معمولی حذف و اضافہ کے ساتھ۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس کی دو جلدوں میں بڑی لطیف شرح فرمائی، "تلخیص الاخبار، تهذیب الاخلاق" کے نام سے بار بار شائع ہوئی اور داخل نصاب کی گئی۔ منتهى الافکار (شرح تلخیص الاخبار) بھی انشاء اللہ جلد ہی شائع کی جائے گی۔ غناء وسماع پر ایک بھرپور رسالہ تحریر فرمایا تھا جو "الغناء فی الاسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد رسائل وتصنیفات یادگار ہیں۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی اہلیہ مولانا سید عبدالعزیز صاحبؒ ہنسوی کی دختر مخدومہ سیدہ زینب صاحبہ تھیں ان سے صرف ایک فرزند مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنیؒ کی ولادت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی کہ ان کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد آپ نے والد ماجد کے حکم سے حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی صاحبزادی مخدومہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ سے عقد فرمایا۔ ان سے دو صاحبزادیاں سیدہ امۃ العزیز صاحبہ (والدہ مولانا محمد ثانی حسنیؒ، مولانا محمد رابع حسنی، مولانا محمد واضح حسنی مدظلہما) اور سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ (مترجمہ زاد سفر) اور ایک فرزند حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

والدہ صاحبہ مرحومہ

حضرت والا کی والدہ ماجدہ مخدومہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ اپنے زمانہ کی ممتاز ترین خواتین میں سے تھیں، زہد وعبادت، ورع وتقویٰ میں امتیازی شان رکھتی تھیں، دعاء ومناجات کا تو وہ ذوق تھا کہ کم ہی خواتین اس وصف میں ان کی شریک ہونگی۔

۱۲۹۵ھ بمطابق ۱۸۷۸ء میں ولادت ہوئی، والد بزرگوار اپنے زمانہ میں اسلاف کی زندہ یادگار اور زہد وتقویٰ کا نمونہ تھے۔ والدہ بھی بڑی عابدہ، زاہدہ اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ والدین ہی کی تعلیم وتربیت میں رہیں، والد صاحب کو ان کی فطری استعداد اور عبادت کا ذوق دیکھ کر ان سے بڑی محبت تھی، والد صاحب ہی سے انھوں نے ترجمہ قرآن پڑھا اور بعض ضروری کتابیں پڑھیں جو کتابیں زیادہ ان کے مطالعہ

www.abulhasanalinadwi.org

میں رہیں اوران کا گہرا اثر پڑا، ان میں **قصص الانبیاء، مقاصد الصالحین، مآثر الصالحین، طریق النجاۃ** خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ والد صاحب کے پاس جب کوئی کتاب ہدیہ میں آتی تو انہیں سے ذکر کرتے اور ان کو مطالعہ کے لئے دیتے۔

نواب سید صدیق حسن خاں صاحبؒ کی "**الداء و الدواء**" کو بھی انھوں نے مطالعہ میں رکھا، اس سے ان کو مختلف آیاتِ قرآنی کے خواص اور اعمال قرآنی کا علم ہوا اور انھوں نے بہت سی چیزوں کو اپنا معمول بنالیا۔ محمد بن سیرینؒ کی "**تعبیر الرؤیا**" کو بھی بار بار پڑھا، اس سے ان کو خوابوں کی تعبیر سے خاص مناسبت پیدا ہوگئی تھی۔

اس خاندان میں مردوں میں حفظ کا رواج تھا مگر عورتوں میں اس کی ابتداء حضرت کی والدہ صاحبہ نے فرمائی، اس سے ایسا ذوق پیدا ہوا کہ اسی زمانہ میں پانچ بیبیاں حفظ قرآن سے مشرف ہوئیں، جن میں ان کے علاوہ ان کی منجھلی بہن، ان کی بھانجی اور دو اور عزیز بہنیں تھیں، رمضان المبارک میں باقاعدہ ان کی الگ تراویح ہوتی تھی، عشاء کے بعد سے سحری تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ یہ سب قرآن مجید بہت اچھا اور صحت مخارج کے ساتھ پڑھتی تھیں، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ :

"ایک مرتبہ میں چھپ کر دیر تک والدہ صاحبہ کا قرآن کھڑا سنتا رہا، وہ تراویح پڑھا رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے بارش ہورہی ہے، وہ لطف آج تک نہیں بھولتا، شادی ہونے کے بعد انھوں نے والد صاحب کو قرآن مجید سنایا اور اس میں مزید جلا پیدا ہوئی۔" مزید فرماتے ہیں :

"عبادت کا ذوق ان کو شروع ہی سے تھا، والد صاحب تہجد کے لئے مسجد تشریف لے جاتے تو وہ اپنی والدہ کے ساتھ تہجد میں مشغول ہوجاتیں، پھر وہ دور آیا کہ ان کو دعاء و مناجات کا ذوق پیدا ہوا۔ فرماتی ہیں کہ "ایک مرتبہ میں قرآن شریف پڑھ رہی تھی، میں نے یہ آیت دیکھی :

وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّی فَاِنِّی قَرِیْبٌ، اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا

دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَ لْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (البقرہ:۱۰۶)

انھوں نے بارہا یہ آیت پڑھی ہوگی اور ممکن ہے کہ اس وقت حفظ بھی کر چکی ہونگی لیکن وقت کی بات ایکدم سے آنکھیں کھل گئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کھوئی ہوئی چیز پالی، اور کوئی نئی حقیقت دریافت کی۔ کہتی تھیں کہ ''معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے دل پر لکھ دیا ہو اور کوئی چیز دل کی تہہ میں بیٹھ گئی ہو''۔ بس کیا تھا جیسے کوئی خزانہ مل گیا اور سارے قفلوں کی کنجی ہاتھ آ گئی، پس اسی وقت سے دعاء کا خاص ذوق پیدا ہو گیا۔''

ان کی عمر اب شادی کی ہوگئی تھی، سگے چچا زاد بھائی سے رشتہ بھی آیا مگر شاہ صاحب کو تردد تھا کہ اس خاندان میں دین کا اعلیٰ ذوق یا اعلیٰ دینی تعلیم کی کمی تھی، اسی دوران مولانا عبد الحی صاحب کی اہلیہ محترمہ (والدہ مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ) کی اچانک وفات ہوگئی، یہ بی بی بڑی نیک، سلیقہ منداور فرمانبردار تھیں، مولانا کی عمر اس وقت صرف ۳۳ سال تھی، ان کی حساس، محبت آشنا اور وفا شعار طبیعت پر قدرتاً اس کا بڑا اثر پڑا اور آپ نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کے والد ماجد مولانا حکیم سید فخر الدین صاحبؒ اور حضرت شاہ ضیاء النبیؒ دونوں مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ کے دست گرفتہ و فیض یافتہ تھے، خاندانی قرابتیں بھی تھیں اور دونوں میں بڑی الفت و اتحاد تھا۔ اس حادثہ کے بعد مولانا فخر الدین صاحبؒ کے دل میں اس بات کا شدید تقاضا پیدا ہوا کہ وہ اپنے صاحبزادہ کی دوسری شادی حضرت شاہ ضیاء النبی صاحبؒ کی ان صاحبزادی سے کریں جو اپنی دینداری، سلیقہ مندی اور پڑھنے لکھنے کے ذوق کی وجہ سے ان کو نہایت عزیز تھیں، لیکن مولانا کی طبیعت شادی کی طرف بالکل راغب نہ تھی لیکن بالآخر والد صاحب کی اطاعت اور تعمیل حکم کے خیال سے راضی ہوگئے، اور شاہ صاحب کے یہاں پیغام بھیج دیا گیا، والد صاحب ایک خط میں مولانا کو لکھتے ہیں ''زنہار زنہار میرے خلاف مرضی کے نہ کرنا، میری پسند میں تمہارے دارین کی بہبود و فلاح مضمر ہے اور مجھ سے بڑھ کر تمہارا

www.abulhasanalinadwi.org

بہی خواہ کون ہوگا؟!''

شاہ ضیاء النبیؒ کو مولانا سے بڑی محبت تھی انھوں نے شاہ صاحبؒ سے روحانی استفادہ بھی کیا تھا اور وہ ان کی علمیت وصلاحیت سے بھی واقف تھے، پیام آتے ہی انھوں نے منظور کرلیا لیکن چونکہ مولانا فخر الدین صاحبؒ بڑے قناعت پسند اور زاہد بزرگ تھے، گھر میں فاقہ ہونا کوئی نادر بات نہ تھی، اور مولانا عبدالحی صاحب کی زندگی بھی نہایت زاہدانہ تھی اور آمدنی کا کوئی خاطر خواہ باقاعدہ ذریعہ نہیں تھا عورتیں ان معاملات میں بڑی حساس ہوتی ہیں، اس لئے شاہ صاحبؒ کی اہلیہ کو بڑا تردد تھا لیکن اسی تردد وکشمکش میں حضرتؒ کی والدہ نے متعدد خواب دیکھے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس ''قران السعدین'' سے خاندان ہی کا نہیں بلکہ پوری اسلامی برادری کا بخت بلند ہوگا۔(۱) اس دوران انھوں نے ایک نہایت بشارت آمیز خواب دیکھا جس سے وہ زندگی بھر تسکین حاصل کرتی رہیں، اس کا تذکرہ کرتیں تو ان پر خاص کیفیت طاری ہوجاتی، ''**الدعاء و القدر**'' میں خود تحریر فرماتی ہیں :

''ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ خاص اس مالک کریم، رحمٰن ورحیم کی عنایت ومہربانی سے ایک آیت کریمہ مجھے حاصل ہوئی، صبح تک وہ زبان پر جاری تھی، مگر کچھ خوف ایسا تھا کہ میں بیان نہ کرسکی، منہ سے نکلنا دشوار تھا اور اس کے معنی بھی مجھے معلوم نہ تھے، جب معنوں پر غور کیا تو خوشی سے پھول گئی اور تمام فکروغم بھول گئی، اپنی اس خوش نصیبی پر فخر کیا اور اس خواب کو بیان کیا، ہر شخص سن کر رشک کرتا، والد مرحوم خوشی میں رونے لگے۔ وہ آیت شریفہ یہ تھی :

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (السجدہ ۱۷)	سو کسی کو معلوم نہیں جو چھپا دھرا ہے، ان کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک بدلہ اس کا جو کرتے تھے۔

(۱) ان خوابوں اور مبشرات کو انہوں نے ''الدعاء و القدر'' نامی رسالہ میں جمع فرمادیا، یہ رسالہ مخطوطہ کتب خانہ ندوۃ العلماء میں موجود ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

بالآخر شاہ صاحب کا فیصلہ غالب آیا اور بخیر وخوبی یہ رشتہ ہو گیا۔(۱) **و ذلک تقدیر العزیز العلیم۔**

حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں :

''والدہ صاحبہ اپنے نئے گھر میں آئیں تو اس کا انھوں نے وہی نقشہ دیکھا جس کو وہ سنا کرتی تھیں، تنگی ترشی کا زمانہ، کبھی فراغت کبھی فاقہ، گھر میں کئی کھانے والے اور دادا صاحب کی آمدنی برائے نام، ادھر نانی صاحبہ اپنی شفقت کی بناء پر اس ٹوہ میں رہتی تھیں کہ بیٹی کو کچھ تکلیف تو نہیں ہے؟ کبھی کسی ماما کو بھیجتیں کہ گھر میں کچھ پک رہا ہے یا نہیں؟ والدہ صاحبہ نے کئی بار سنایا کہ ''جب میں کسی کو اپنے میکہ سے آتے دیکھتی تو چولہے پر ہانڈی رکھ دیتی اور آگ جلا دیتی تا کہ یہ معلوم ہو کہ کھانا پک رہا ہے، حالانکہ اس میں پانی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔'' بعض اوقات نانی صاحبہ اپنی فراست سے تاڑ لیتیں اور کھانے کا خوان لگا کر بھیج دیتیں۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد والد صاحبؒ نے مطب شروع کرنے کا ارادہ کیا، والدہ صاحبہ کہتی تھیں کہ مجھ سے مشورہ لیا، میں نے اس کی بڑی تائید کی اور مطب کا سلسلہ شروع ہو گیا، مطب شروع ہوتے ہی وہ پریشانی دور ہو گئی، آمدنی کا سلسلہ شروع ہوا اور بہت جلد اتنی برکت اور ترقی ہوئی کہ گھر کا نقشہ ہی بدل گیا، گھر جس کا بڑا حصہ خام تھا، والدہ صاحبہ کی بلند ہمتی اور زندہ دلی سے اس کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ایک پختہ حویلی بن گئی، دونوں بہنوں اور بھائی صاحب (۲) کو اس طرح اپنی تربیت اور شفقت میں لیا کہ وہ ماں کو بھول گئے اور ساری عمر ان سب نے انہیں کو ماں سمجھا۔ جس گھر میں خود گھر والوں کو کبھی فاقہ کرنا پڑتا تھا اب وہاں ہر گھر سے زیادہ مہمانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، رائے بریلی و لکھنؤ میں اپنے پرایوں اور قریب و دور مہمانوں کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔(۳)

---

(۱) انتخاب وتلخیص از ذکر خیر، حیات عبدالحی۔(۲) ڈاکٹر عبدالعلی صاحب (۳) ذکر خیر ص ۳۷-۳۸

''انتظام خانہ داری کی ساری ذمہ داری ان پر تھی، مہمانوں کا وسیع سلسلہ تھا، خاندان کے کئی بچے تعلیم کے سلسلہ میں مستقل طور پر مقیم رہتے تھے، بھائی صاحب تعلیم حاصل کر رہے تھے، مختلف مہمانوں اور خاص طور پر عزیزوں کی خاطر داری اور ان کی حیثیتوں اور مزاجوں کی رعایت، سب کے حقوق کی ادائیگی بڑا نازک اور مشکل کام تھا، والدہ صاحبہؒ کی زندگی اس دور میں اس ایثار و قربانی کا نمونہ تھی جو ہندوستانی عورتوں کا طرۂ امتیاز اور دیندار و تربیت یافتہ مسلمان بیویوں کا شعار ہے، وہ والد صاحب کی اجازت کے بغیر باوجود اس کے کہ انھوں نے ان کو گھر کا مالک بنا رکھا تھا ان کی چیزوں میں بلا اجازت تصرف کرنا قریب قریب ناجائز سمجھتی تھیں، گھر میں موسم کے جو پھل اور باہر سے جو تحائف آتے جب تک کہ والد صاحبؒ کی اجازت اور صراحت نہ ہوتی وہ اپنے بھانجوں، بھتیجوں کو تو کیا اپنی اولاد کو بھی دینا گناہ سمجھتی تھیں۔''(۱)

''اس پورے عرصے میں جس میں زندگی اور خاندان میں بہت سے نشیب و فراز آئے، متعدد اولادیں ہوئیں، خوشیاں بھی اور پریشانیاں بھی پیش آئیں، ان کے معمولات، دعا کا شغف، قرآن مجید کا دور برابر قائم رہا، رمضان المبارک میں قرآن مجید کا دور اور بعض اوقات اس کا تراویح میں ختم کرنے کا سلسلہ بھی تھا، بھائی صاحبؒ کو والدہ صاحبہؒ سے اس وقت بھی اُنس تھا جب ان کی والدہ حیات تھیں اور بعد میں تو انھوں نے ان میں اور اپنی ماں میں فرق نہیں سمجھا، اور انھوں نے بھی ان کو ہمیشہ اپنی اولاد پر ترجیح دی، والد صاحبؒ کی دونوں بہنوں اور بھائی صاحب کی شادی بڑے شوق، خوش سلیقگی اور حسن انتظام سے کی۔

غرض یہ زمانہ ہر طرح سے فرحت و مسرت، خیر و برکت کے ساتھ گزر رہا تھا، اچانک ۵؍جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ (۲؍فروری ۱۹۲۳ء) کو والد صاحب کے

---

(۱) ذکر خیر ص ۴۰-۴۱

انتقال کا واقعہ پیش آیا، پہلے سے طبیعت کچھ ناساز نہ تھی، میرے چچا مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحبؒ کو کچھ چوٹ آ گئی تھی، والد صاحب نے والدہ صاحبہ کو ان کی عیادت کے لئے ان کے یہاں بھیج دیا، مغرب کے بعد تک کام کیا، لوگوں سے ملاقاتیں کیں، ندوہ کے کاغذات پر دستخط کئے پھر اچانک مرض موت پیش آ گیا اور گھنٹہ دو گھنٹہ میں اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔

مجھے خوب یاد ہے میری عمر اس وقت نو سال کی تھی، میں والدہ صاحبہ کو لینے گیا، جب وہ آئیں اور ان کو واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ سجدہ میں گر گئیں، جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، خود انکی زبان سے اس صدمہ اور اس پر صبر و رضا کا حال سنئے :

''جب خدمت کی مدت ختم ہونے کو آئی تو اس مالک حقیقی نے میرے حق میں بہتر سمجھ کر قسمت کا بہانہ پیش کر دیا، قسمت نے حکیم ایزدی پا کر فوراً ہی فیصلہ کر دیا، میں اپنے مالک حقیقی کی رضا پر راضی ہوگئی مگر یہ غم جدائی ایسا نہ تھا کہ برداشت کر لیتی، یہ بھی اسکی رحمت اور حکمت تھی جو مجھے اپنی خوشی پر راضی رکھا ورنہ جو بھی حالت ہو جاتی کم تھی، ایسے مونس و رفیق کا یک بیک نظر سے غائب ہو جانا قیامت سے کم نہ تھا، میں نہیں کہہ سکتی یہ دل پھر دل کی صورت میں کیونکر رہ گیا، بس یہ کہنا چاہئے کہ یہ حکم میرے لئے ہلاکت و مصیبت نہیں تھا بلکہ سراسر رحمت اور ذریعۂ عنایت تھا کہ بجائے ہلاکت و بربادی کے مجھے اپنے سایۂ رحمت میں لے لیا اور میرا سچا مونس و غمخوار اور مددگار رہ کر ہر موقع پر ساتھ دینے لگا، سبحان اللہ کیا شان رحمت ہے اسکی، اٹھی غم کی گھٹا اور رحمت ہو کر برس گئی جس سے تمام کھیتی سر سبز و شاداب ہوگئی۔(۱)

''رائے بریلی میں عدت کی مدت میں اور اس کے بعد والدہ صاحبہؒ کے دو ہی مشغلے تھے ایک دینی کتابوں کا سننا جن کے پڑھنے کی سعادت اکثر مجھے حاصل ہوتی تھی، دوسرے ان کی زندگی بھر کا وظیفہ، دعاء اور عبادت۔

---

(۱) ذکر خیر ص ۴۲ تا ۴۴

اس زمانہ میں ہمارے خاندان میں ایک بڑا اچھا دستور تھا کہ جہاں کوئی ایسا غمناک واقعہ پیش آتا، دل دکھے ہوئے ہوتے یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو ''صمصام الاسلام'' سنی جاتی۔ یہ مشہور مؤرخ واقدیؔ کی ایک مشہور کتاب ''فتوح الشام'' کا پچیس ہزار اشعار میں ترجمہ ہے، یہ ترجمہ اور نظم ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ میرے والد صاحبؒ کے حقیقی پھوپھا منشی سید عبد الرزاق صاحبؒ کلامیؔ کی لکھی ہوئی، جوش وخروش سے بھری ہوئی اور درد واثر میں ڈوبی ہوئی، جنگ کا نقشہ ایسا کھینچتے کہ دل جوش سے اچھلنے لگتے ہیں اور نبض تیز ہوجاتی ہے، شہادت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ خود راہِ خدا میں جان دینے کے لئے دل بیتاب ہوجاتا ہے، صحابہ کرامؓ اور مجاہدین کے غم کے سامنے اپنا غم بھول جاتا ہے۔

والدہ صاحبہ مناجاتیں اور نظمیں لکھ لکھ کر اپنا غم غلط کرتیں اور اپنے دل کو تسکین دیتیں، خاندان کی بچیوں کو اپنے پاس رکھ کر انکی تعلیم و تربیت میں مشغول رہ کر اپنا دل بہلاتیں، مناجاتوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ''بابِ رحمت'' کے نام سے ۱۹۲۵ء میں بھائی صاحبؒ کی توجہ اور اہتمام سے شائع ہوا اور اس پر انھوں نے میرے نام سے ایک بہت مؤثر تعارفی مقدمہ لکھا۔ یہ کتاب بہت جلد گھر گھر پھیل گئی، بہت سی مسلمان بیبیوں اور دعا ومناجات کا ذوق رکھنے والی مستورات نے اسکو پڑھ کر مناجات کا لطف اور دعاء کی لذت حاصل کی اور یہ مجموعہ نہایت مقبول ہوا۔

اپنے خاندان نیز دوسری مسلمان بچیوں کیلئے انھوں نے ایک دوسری کتاب لکھی جس میں دینی واخلاقی ہدایات، اچھی اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے اصول وآداب اور حقوق وفرائض وامور خانہ داری کی تعلیم دی، یہ کتاب بھی چند سال کے بعد ''حسن معاشرت'' کے نام سے چھپی اور مقبول ہوئی۔ والدہ صاحبہ کھانے کی ترکیبوں اور نئے نئے نسخوں کی ایجاد میں بھی مجتہدانہ دماغ رکھتی

www.abulhasanalinadwi.org

تھیں، اس موضوع پر بھی انھوں نے ایک کتاب ''ذائقہ'' کے نام سے لکھی جو ۱۹۳۰ء میں ''نامی پریس'' لکھنؤ میں چھپی اور بہت پسند کی گئی۔(۱)

والد صاحب کی وفات کے بعد والدہ صاحبہ کی شفقت و توجہ حضرت پر پوری طرح مرکوز ہوگئی، رائے بریلی کے قیام میں وہی حضرتؒ کی تربیت و نگہداشت فرماتیں، پھر حضرتؒ کے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں بھی وہ سراپا توجہ و دعا بنی رہیں (۲)
راقم کے والد ماجد مولانا سید محمد الحسنیؒ تحریر فرماتے ہیں :

''عم مخدوم و معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے لئے ان کی دعا کا کیا حال تھا اس کے لئے صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ ان کی ساری زندگی دعا تھی، اور ان کی ساری دعا چچا میاں کے لئے تھی، وہ جس وقت بھی دعا کرتیں اور جس کے لئے بھی دعا کرتیں وہ دراصل ان ہی کیلئے ہوتی۔''(۳)

حضرت تحریر فرماتے ہیں :

''میرے لئے ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مجھ سے دین کی تقویت اور اسلام کی اشاعت ہو، وہ کبھی کبھی مجھ سے پوچھتیں: علی! تمہارے ہاتھ پر کوئی مسلمان بھی ہوا ہے؟ میں کہتا ہاں اکا دکا کسی نے کلمہ پڑھا ہے، فرمایا کہ یہ آرزو ہے کہ جماعتیں کی جماعتیں تمہارے ہاتھ پر مسلمان ہوں۔ ایک روز بڑی ٹھنڈی سانس لے رہی تھیں، چھوٹی ہمشیرہ نے کہا کہ آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟ کیا آپ کی خواہش ہے کہ علی نبی ہو جائیں؟ فرمایا کیا میں نہیں جانتی نبوت ختم ہوگئی؟ میری آرزو ہے کہ ان کے ہاتھ پر جماعتوں کی جماعتیں اسلام لائیں اور دنیا میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک اسلام کا ڈنکا بج جائے۔(۴)

---

(۱) ذکر خیر ص ۴۵ تا ۴۷
(۲) والدہ صاحبہ کی تربیت کے واقعات کا ذکر حضرت کے مستقل تذکرہ میں آئے گا۔
(۳) ذکر خیر ۱۱۶ (۴) ذکر خیر ص ۷۰

www.abulhasanalinadwi.org

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دعا کا ایسا ذوق عطا فرمایا تھا کہ مردوں میں بھی کم ہی لوگ اس صفت میں ان کے شریک ہونگے، اپنا حال وہ خود بیان فرماتی ہیں :

''دعا گویا میری غذا تھی، بغیر دعا کئے ہوئے مجھے سیری نہ ہوتی، دعا کی مشغولیت اتنی بڑھی کہ تمام مشاغل چھوٹ گئے، اگر بات بھی کرتی تو دعا کے ساتھ کرتی، کوئی گھڑی دعا سے خالی نہ گزرتی، جمعہ گویا روزِ عید تھا اور فی الحقیقت عید کا دن بھی ہے۔ تمام دن دعا کرتی، خاص کر عصر سے غروب آفتاب تک تنہا بیٹھ کر دعا میں ایسی مشغول رہتی کہ کسی طرف آنکھ نہ اٹھاتی، مرغ کی ہر آواز پر اور ہر اذان کے ساتھ دعا کرتی، حتی الامکان کوئی وقت دعا کا ضائع نہ کرتی، یہ اس مالک حقیقی کی رحمت وعنایت تھی کہ جو جو معاملات زندگی میں پیش آنے والے تھے دعا کے وقت سب پیش نظر ہو جاتے اور اس قدر جوش پیدا ہو جاتا کہ بے خودی سی ہو جاتی اور تمام جگہ آنسوؤں سے تر ہو جاتی اور اس کی شانِ قدرت پر نظر کر کے تڑپ جاتی جس طرح مرغ تڑپتا ہے، مگر بے خودی میں دعا جاری رہتی، ہر وقت اپنے قیافہ پر نظر کرتی اور کہتی

ع جو عیب قسمت کے ہیں مٹا دے تیرا ہی عالم میں نام ہوگا

سجدہ سے سر ہرگز نہ اٹھاتی جب تک دل کو کچھ تسکین نہ ہو جاتی، دعا کے بعد مجھے اس قدر تسکین ہوتی کہ گویا رحمت کے دروازے کھل گئے ہیں اور میں خزانۂ رحمت لوٹ رہی ہوں، اس کی عنایت وشفقت پر مجھے اس قدر ناز تھا کہ یہ کہتی تھی یا ارحم الراحمین اگر تو مجھے میری کوشش میں کامیاب نہیں کرے گا تو ایسی چیخ ماروں گی کہ آسمان وزمین ہل ہل جائیں گے اور تیرے در سے ہرگز سر نہ اٹھاؤں گی۔

نہ اٹھوں گی میں اس در سے کوئی مجھ کو اٹھا دیکھے
مجھے ہے آرزو جس کی اٹھوں گی میں وہی لے کر

یہ اس کی محبت اور عنایت و رحمت تھی کہ اتنی بڑی سرکار میں مجھے ایسا

www.abulhasanalinadwi.org

ڈھیٹ کردیا تھا اور بے حجاب کہ میں کہتی اور کہہ کر اپنی بات پر اڑ جاتی اور اتنا بڑا بادشاہ، مالک الملک ہو کر مجھ ادنیٰ فقیر کی ناز برداری کرتا ہے

یہ شان دیکھی تیری نرالی جو مانگے تجھ سے تو اس سے راضی
بلا کے دنیا کرم ہے تیرا یہ فضل بھی ہے کمال بھی ہے (۱)

مولانا عبدالحی حسنی کی زندگی میں ان کا زیادہ تر وقت ان کی اطاعت اور خدمت گزاری میں صرف ہوتا تھا، نمازوں کا اہتمام، تہجد کی پابندی اور تلاوت پر مداومت ہمیشہ رہی۔ رمضان مبارک میں تراویح سنانے کا بھی اہتمام رہتا۔

مولانا کی وفات کے بعد سراپا عبادت و دعا بن گئیں۔ گرمی میں ڈھائی بجے سے اور جاڑوں میں تین بجے سے جبکہ رمضان مبارک میں گرمی میں ایک بجے سے اور جاڑوں میں ڈیڑھ بجے سے تہجد کے لئے اٹھ جاتیں، اور طویل طویل سورتیں پڑھنے کا معمول تھا۔ اس قدر روتیں کہ آنسوؤں سے جانماز تر ہو جاتی، کبھی اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے دنیا کی خواہش نہیں کی، بس اللہ و رسول ﷺ کی محبت، دینی خوبیاں اور دینی خدمت کی توفیق مانگی۔

تہجد و دعا سے فارغ ہو کر فجر کی نماز تک ذکر میں مشغول رہتیں، پھر صبح کی نماز کے بعد تسبیحات میں مشغول ہو جاتیں تھیں، اشراق کی نماز پڑھ کر ناشتہ سے فارغ ہو کر کلام پاک کی تلاوت کرتیں اور کچھ گھر کے کام انجام دیتیں، پھر چاشت کی نماز کے بعد مناجاتیں لکھنا شروع کر دیتیں، پھر ظہر کے کھانے کا وقت آ جاتا، کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتیں پھر اذان سے ایک گھنٹہ پہلے اٹھ جاتیں، اور جانماز پر بیٹھ کر تسبیح میں مشغول ہو جاتیں، جب ظہر کی اذان ہو جاتی تھی تو نماز پڑھ کر سورہ فتح اور سورہ نبا پڑھتی تھیں، پھر تسبیح پڑھنا شروع کر دیتی تھیں، حتی کہ عصر کا وقت آ جاتا تھا، عصر کی نماز پڑھ کر پھر کلام پاک کی سورتیں مغرب تک پڑھتی رہتی تھیں۔ (۲)

---

(۱) ذکر خیر ص ۲۸-۳۱ باختصار

(۲) یہ معمولات چھوٹی صاحبزادی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے مضمون سے ماخوذ ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

تہجد، نوافل، دعا اور ذکر و مناجات کا یہ سلسلہ اخیر تک جاری رہا، عمر نوے (۹۰) سال سے تجاوز کر گئی تھی، بصارت ختم ہوگئی تھی لیکن معمولات جاری تھے، یہ صرف ایمان کی طاقت تھی ورنہ حیرت ہوتی تھی کہ اتنے ضعف و نقاہت کے باوجود وہ اپنے معمولات کیسے پورے کرتیں تھیں۔ اخیر میں مناجاتیں سننے کا شوق بہت بڑھ گیا تھا۔ دماغ پوری طرح حاضر تھا، وفات کے ایک یا دو روز قبل حضرتؒ کے لئے مقوی اعصاب و دماغ معجون کا نسخہ لکھوایا، مرض الوفات کی اس شدت میں کچھ آرام ہوا تھا، حضرتؒ کو بھوپال ایک دعوتی سفر پر جانا تھا حضرتؒ نے فرمایا ہم اپنے کو بالکل آپ کے حوالہ کرتے ہیں جو آپ فرمائیں گی وہی کریں گے۔ تمام تر محبت و شفقت کے باوجود فرمانے لگیں ''علی! میں تم کو دینی کام سے بالکل نہیں روکتی، تم جاؤ اللہ حافظ و ناصر ہے۔'' وفات سے دو تین روز پہلے حضرت واپس تشریف لائے، ملتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ ساری طاقت عود کر آئی اور وہ اپنی ساری تکلیفیں بھول گئیں۔

وفات کے دن تک جب کہ بار بار غفلت ہو جاتی تھی، نمازوں کا پورا اہتمام رہا۔ وفات کے دن چاشت کے وقت تیمّم کی مٹی تلاش کرنے لگیں، کہا گیا ظہر کا وقت ابھی نہیں آیا، کوئی جواب نہیں دیا، ادھر اُدھر ہاتھ بڑھاتی رہیں، تو تیمّم کے لئے مٹی کا ڈھیلا دیا گیا، پورے اہتمام سے خود ہی تیمّم فرمایا، پھر چاشت کی دو رکعت ادا کی اس کے بعد بیہوشی کی کیفیت ہوگئی، ظہر کے وقت جب تیمّم کی مٹی دی گئی تو ہوش آ گیا، خود تیمّم فرمایا اور چار رکعت ظہر کی ادا فرمائی پھر مکمل بیہوشی ہوگئی، تین بجے سے ذکر جاری ہو گیا اور مسلسل تین گھنٹہ اس زور سے ذکر جاری رہا کہ کمرے کے باہر آواز سنائی دیتی تھی، پونے چھ بجے آواز بند ہوگئی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ ۶/ جمادی الآخر ۱۳۸۸ھ مطابق ۳۱/ اگست ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ''پوری رات ایسی رحمتوں اور برکتوں کا شامیانہ تنا رہا کہ کم ایسی راتیں گذری ہوں گی۔'' دوسرے دن صبح کو حضرتؒ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی اور روضہ شاہ علم اللہ میں اپنے باکمال رفیق زندگی کے پہلو میں حضرت شاہ علم اللہ

www.abulhasanalinadwi.org

صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ کے پائنتیں مدفون ہوئیں۔ رحمها الله رحمة واسعة

برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب حسنیؒ

برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ اپنے بہت سے کمالات و خصوصیات کی وجہ سے نادرۂ روزگار اور فرد فرید تھے۔ ان میں قدیم وجدید تہذیب و ثقافت اور مشرقی و مغربی علوم کا نہایت حسین و دل آویز امتزاج نظر آتا ہے، سنت و شریعت پر استقامت کے ساتھ فکر ونظر کی وسعت اور اس میں توازن واعتدال ان کی وہ صفت ہے جس میں وہ اپنے ابنائے زمانہ میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ حضرتؒ کی تربیت ونگہداشت میں چونکہ ان کا بنیادی حصہ ہے اس لئے ان کا تذکرہ یہاں قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

۲۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ یکم دسمبر ۱۸۹۳ء میں اپنے نانیہال ہنسوہ ضلع فتح پور میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم ہنسوہ ہی میں ایک بابرکت بزرگ اور حقانی عالم مولوی عبدالحکیم صاحبؒ کے یہاں ہوئی جو حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے دست گرفتہ اور حضرت گنگوہی کے شاگرد تھے۔ آپ آٹھ ہی سال کے تھے کہ اچانک والدہ صاحبہؒ کی وفات کا حادثہ پیش آیا اور آپ اپنی نانی صاحبہ کی نگہداشت میں آ گئے۔ پھر جب ۱۹۰۴ء میں والد صاحبؒ نے دوسرا عقد فرمالیا تو آپ انہیں دوسری والدہ کے سایۂ شفقت میں آ گئے۔

ناظرہ قرآن مجید کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے خود اپنے شوق سے میزان شروع فرمادی تھی۔ والد صاحبؒ کے حکم پر دستور کے مطابق فارسی شروع کی پھر جب ۱۹۰۴ء سے باقاعدہ رائے بریلی میں قیام ہوا تو دادا صاحبؒ سے جو فارسی کے بڑے ادیب و شاعر تھے، فارسی پڑھنی شروع کی۔ والد صاحبؒ اس زمانہ میں زیادہ تر ندوہ کے امور میں مشغول رہتے، لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کی تعلیم وتربیت کی طرف پوری توجہ تھی، خطوط کے ذریعہ آگاہ فرماتے رہتے، اور توجہ دلاتے۔ ادھر ڈاکٹر صاحبؒ نے دادا صاحبؒ کی

www.abulhasanalinadwi.org

صحبت سے پورا فائدہ اٹھایا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ والد صاحب ان کو فارسی میں خطوط لکھنے لگے، صرف ونحو کی تعلیم بھی رائے بریلی میں مولوی محمد احسن صاحبؒ سے حاصل کی۔ جب دارالعلوم کا دفتر شاہ جہاں پور سے لکھنؤ منتقل ہوا تو والد صاحبؒ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا اور انھوں نے وہیں رہ کر دارالعلوم کے فاضل اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ ادب عربی مولانا سید علی زینبیؒ، فقہ و اصول مولانا شبلی جیراجپوریؒ، ہیئت مولانا سلطان کابلیؒ اور اقلیدس مولانا شیر علی صاحبؒ سے نیز بعض درسیات اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔

دارالعلوم میں تکمیل ہی کے زمانہ میں شیخ حسین بن محسن یمانیؒ لکھنؤ تشریف لائے اور اپنے محبوب شاگرد مولانا سید عبد الحی صاحبؒ کے مکان پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اولیات سنا کر ان سے اجازت حدیث حاصل کی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تکمیل کے بعد مولانا عبد الحی صاحبؒ نے حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ کے لئے ڈاکٹر صاحبؒ کو دارالعلوم دیوبند بھیجا۔ حضرت شیخ الہند نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت اور مولانا عبد الحی صاحبؒ کے تعلق کی وجہ سے خود اپنا مہمان بنایا، خود اپنے ہاتھ سے کھانا لیکر آتے، ان کا یہ تکلف اور تکلیف دیکھ کر ڈاکٹر صاحبؒ دارالاقامہ میں منتقل ہو گئے، ایک سال دیوبند میں قیام رہا۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ سے بخاری وترمذی اور علامہ انور شاہ صاحبؒ سے ابوداؤد پڑھی۔ ان کی تقریروں کو ڈاکٹر صاحب نے عربی میں منضبط بھی فرمایا تھا۔ مولانا انور شاہ صاحب نے ان کو دیکھ کر پسند فرمایا لیکن افسوس کہ یہ مجموعہ محفوظ نہ رہ سکا اور ڈاکٹر صاحبؒ کو ساری عمر اس کا افسوس رہا۔

دیوبند سے واپسی کے بعد والد صاحبؒ سے طب کی متداول کتابیں پڑھیں۔ اور انہیں کے مطب میں نسخہ نویسی شروع کی۔ اسی زمانہ میں حقیقی ماموں زاد بہن سے عقد نکاح ہوا۔ والد صاحب نے تکمیل کے لئے حکیم اجمل خاں صاحبؒ کے پاس دہلی بھیجا۔ اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی فرمائی کہ ڈاکٹر مختار انصاری صاحب سے طب جدید

www.abulhasanalinadwi.org

کی معلومات بھی حاصل کریں۔ دہلی چھ مہینہ رہ کر واپس تشریف لائے تو آپ کو انگریزی میں کمال پیدا کرنے اور طب جدید کو حاصل کرنے کا شوق ہوا اور آپ نے والد صاحبؒ کی اجازت سے مکان کے قریب ہی ایک اسکول کے نویں درجہ میں داخلہ لیا، وہاں امتیازی کامیابی حاصل کی اور کرسچین کالج میں داخلہ لیا، وہاں انگلش لٹریچر کا آپ نے انتخاب کیا۔ وہیں سے ۱۹۱۷ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا، پھر اسی سال کیننگ کالج میں داخل ہوئے اور بی ایس سی کے دو سال مکمل کر کے ۱۹۱۹ء میں فائنل امتحان اس امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ پورے کیننگ کالج میں اول اور پوری الہٰ آباد یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن آئی۔ اس پوری تعلیم کے دوران آپ کی وضع، لباس اور معمولات میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، شرعی کرتا پائجامہ، دوپلی، یا کشتی نما ٹوپی، پوری شرعی داڑھی، نمازوں کا اہتمام، اس وضع داری اور متانت کی وجہ سے اساتذہ بھی آپ کا احترام کرتے، ایک مرتبہ امتحان کے دوران نماز کا وقت ہو گیا تو وہیں شیروانی بچھا کر نماز شروع فرمادی، ایک انگریز پروفیسر نے کہا کہ مسٹر حسنی ہم کو معلوم ہوتا تو ہم جانماز کا انتظام کر دیتے۔

اس تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے والد صاحب کو ایک مفصل تاریخی خط لکھا، جو آپ کی دقت نظر، وسعت فکر اور دینی تقشّف و پختگی کی واضح دلیل ہے۔

۱۹۲۰ء میں طب جدید (میڈیسن) کے حصول و تکمیل کے لئے کنگ جارج میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور دوران تعلیم ہی جبکہ وہ طلبہ کی ایک ٹیم کے ساتھ مدراس کے سفر پر تھے، والد صاحب کی وفات کا حادثہ پیش آیا۔ ان کو اس کی اچانک خبر ملی، واپسی میں سیدھے قبر پر گئے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ”میں بھی ساتھ ہو گیا، ان کا قبر پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا میری آنکھوں کے سامنے ہے، سب سے زیادہ صدمہ انہیں اس بات کا ہوگا کہ وہ اخیر وقت میں ان کے پاس نہ تھے اور آخری خدمت بھی انجام نہ دے سکے۔“

والد صاحبؒ کی وفات کے بعد اس کثیر المصارف تعلیم کا جاری رکھنا بہت دشوار

www.abulhasanalinadwi.org

تھا کہ گھر میں باقاعدہ آمدنی کا کوئی ذریعہ یا جائیداد وغیرہ نہیں تھی، مگر نواب نورالحسن صاحب مرحوم کے گھر والوں نے (جو والد صاحبؒ کے جانثار دوست تھے) اور منشی رحمت اللہ صاحبؒ نے بڑی محبت واپنائیت کا معاملہ کیا۔ نواب صاحبؒ نے اپنی کوٹھی پر ٹھہرایا اور اسباب راحت فراہم کئے۔ ۱۹۲۵ء کے اواخر میں میڈیکل کالج سے فراغت ہوئی اور ۱۹۲۶ء کے اوائل میں والد صاحب کے مطب کے قریب مطب کا آغاز کیا، اور قریب ہی ایک چھوٹا مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے وسعت دی اور اتفاق سے وہ قدیم مکان خالی ہوا جس میں والد صاحبؒ کی وفات ہوئی تھی تو اس کو کرایہ پر لے لیا، پھر ساری عمر اسی کرایہ کے مکان میں گزار دی، بہتر سے بہتر مکانات کی پیش کش ہوئی لیکن آپ کو کبھی اس طرف توجہ نہیں ہوئی۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ پھر ان کے بعد حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے بیعت کا ارادہ تھا، والد صاحب کے نام اپنے مکتوب میں اس کا اظہار بھی فرمایا تھا، مگر اس کی نوبت نہیں آسکی۔ بالآخر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تعلق قائم فرمایا۔ حضرت مدنیؒ کو بھی بہت جلد ڈاکٹر صاحبؒ سے خصوصی تعلق ہو گیا اور لکھنؤ میں ڈاکٹر صاحب کا مکان ان کی مستقل قیام گاہ بن گیا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کو حرمین شریفین سے تعلق ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ ۱۹۲۷ء میں اپنے دوست شیخ خلیل عرب صاحبؒ کے ہمراہ حج کیا، مدینہ طیبہ میں وہاں کے مشہور شیوخ حدیث سے حدیث کی سند واجازت بھی حاصل کی۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۲۳ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی منتخب ہوئے۔ پھر ۱۹۲۸ء کو نائب ناظم اور ۱۹۳۱ء کو ناظم کی حیثیت سے انتخاب ہوا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۶۱ء تک مسلسل تیس سال اس عہدہ کو زینت بخشی۔ ان کے دور نظامت میں دارالعلوم نے ہر لحاظ سے ترقی کی، مسجد کی تعمیر ہوئی، رواق شبلی کی دوسری منزل کی تکمیل ہوئی، ماہر اساتذہ فن رکھے گئے، انہیں کے دور میں شیخ تقی الدین ہلالیؒ تشریف لائے اور انہیں کے دور سے ندوہ میں دینی، دعوتی فضا بننا شروع ہوئی جس

www.abulhasanalinadwi.org

میں ان کی توجہ وسرپرستی اور حضرتؒ کی فکر وعمل اور جدوجہد کو خاص دخل تھا۔ دارالعلوم کے علاوہ ان کو مدینہ طیبہ کے مدرسۃ العلوم الشرعیۃ سے بڑی دلچسپی تھی اور اس میں ان کی حرمین شریفین سے عقیدت ومحبت بلکہ عشق و وارفتگی کو بڑا دخل تھا، اس کے لئے انھوں نے ''معین مدرسہ علوم شرعیہ'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی، جس کا کام ہی اہل خیر کو اس کی اعانت کی طرف متوجہ کرنا تھا، یہ کام وہ بڑی دلسوزی اور ذوق وشوق سے کرتے تھے۔

غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کا ان کو بڑا شوق تھا اور یہ ان کی زندگی کا بڑا محبوب موضوع ومشغلہ تھا، ساری عمر اس کی فکر رہی اور کوشش کرتے رہے، ان کے اسی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے حضرتؒ کو ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوت اسلام دینے کے لئے بمبئی بھیجا۔

۱۹۵۸ء کو وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بنے اور ساری زندگی رہے، لیکن بڑی مصروفیت اور سفروں کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے کسی جلسہ میں شرکت کی نوبت نہیں آئی۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کے تبلیغی کام سے ان کو بڑا شغف تھا اور اس کی قدر افزائی فرماتے۔ ایک مرتبہ چند روز کے لئے نظام الدین بھی تشریف لے گئے، حضرت مولاناؒ ان کی غیر متوقع آمد سے بڑے مسرور ہوئے۔ حضرت تھانویؒ کے لکھنؤ کے زمانہ قیام میں ان کی مجالس میں حاضری دیتے اور حضرت کو اپنے ساتھ لے جاتے، ایک روز حضرت تھانویؒ ازخود ڈاکٹر صاحبؒ کے گھر تشریف لائے۔ حضرت رائے پوریؒ کے زمانۂ قیام لکھنؤ میں بھی پابندی کے ساتھ ان کی مجلس میں شرکت فرماتے۔ حضرت رائے پوریؒ متعدد بار ان کے مکان پر تشریف لائے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحبؒ بڑے بابرکت آدمی ہیں۔ علماء فرنگی محل اور حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقیؒ سے بھی قدیم تعلقات کی بنا پر خصوصی تعلق تھا، یہ حضرات بھی احترام ومحبت کے ساتھ پیش آتے۔

www.abulhasanalinadwi.org

۱۳؍اگست ۱۹۵۷ء میں اچانک اہلیہ صاحبہ کی وفات ہوگئی، اس کا طبیعت پر بڑا اثر ہوا۔ ادھر مولانا مدنیؒ کی طبیعت مسلسل ناساز رہنے لگی۔ ان کی عیادت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، مولانا بہت مسرور ہوئے، نمازوں میں اہتمام تھا کہ وہ پہلو میں کھڑے ہوں۔ واپسی میں ایک روز کے لئے رائپور بھی تشریف لے گئے۔

۵۶،۵۷ء سے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہوگئی تھی، اس کے نتیجہ میں قلب پر بھی اثر تھا۔ ۷؍مئی ۱۹۶۱ء کو قلب کا شدید دورہ پڑا اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ حضرتؒ اس وقت سہارن پور کے سفر پر تھے، فوراً اطلاع کی گئی لیکن دوسرے دن جب حضرتؒ تشریف لائے تو یہاں سب کچھ ہو چکا تھا۔ پہلی نماز جنازہ لکھنؤ میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ نے پڑھائی اور دوسری رائے بریلی میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے۔ روضہ شاہ علم اللہ میں تدفین عمل میں آئی۔

پسماندگان میں ایک صاحبزادہ مولانا محمد الحسنی صاحب (سابق مدیر البعث الاسلامی) اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑیں۔

ڈاکٹر صاحبؒ نہایت خوبصورت وحسین تھے۔ چہرہ سے معصومیت نمایاں تھی۔ ان کے فاضل ہم عصر دوستوں، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کی شہادت ہے کہ ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل میں گناہ کا شائبہ بھی نہیں گزرا۔ "إن هذا إلا ملك كريم" کے عنوان سے مولانا عبدالباریؒ صاحب نے ایک بڑا محبانہ ومعتقدانہ مضمون بھی تحریر فرمایا تھا۔

نہایت کم گو اور کم سخن تھے، ضرورت سے زائد بولنے کا گویا انھوں نے سبق ہی نہیں پڑھا تھا۔ لباس بہت سادہ پہنتے، کھانے میں عیب نکالنا گویا ان کے مذہب میں کفر تھا، بے مزہ سے بے مزہ چیز اس شوق اور سلیقہ سے کھاتے کہ دیکھنے والے کو رغبت پیدا ہو جائے، طبیعت ہمیشہ سے بڑی جفاکش واقع ہوئی تھی۔ جب تک صحت رہی، رات رات بھر جاگ کر عزیز مریضوں کی تیمارداری کرتے، اعزہ کے ساتھ حسن سلوک

www.abulhasanalinadwi.org

اور صلہ رحمی میں بہت فائق تھے، نمود و نمائش اور جاہ طلبی سے طبعاً نفرت تھی۔ اجر وثواب و رضائے الٰہی کا خیال ان کے لئے اصل قوت محرکہ کی حیثیت رکھتا تھا، نیک نامی و بدنامی اور لوگوں کے کہنے سننے کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں تھی، ہر ایک سے شرعی حق اور مرتبہ کے مطابق سلوک کرتے۔ حضرت فرماتے ہیں:

''وہ ہر چیز میں پختہ تھے، پختہ اعتقاد، پختہ دینداری، پختہ عملی استعداد، پختہ خیالات و نظریات، وہ اسلام کی ابدیت و اسلامی تہذیب کی برتری و پاکیزگی اور اسلاف و متقدمین کی اخلاقی و روحانی و انسانی عظمت کے شدت سے قائل تھے۔ مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے اور اس کے نظام تعلیم کے سایہ میں برسوں رہنے کے باوجود وہ اس کے سخت ناقد تھے، لیکن ان کی تنقید جذباتی و سطحی نہیں تھی، وہ علم و مطالعہ پر مبنی تھی۔ راقم سطور کو ان کی مجلسوں سے جو فائدہ پہنچا، وہ مغربی تہذیب اور موجودہ نظام حیات پر درجنوں کتابیں پڑھنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔''(۱)

''اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں میں ان کی جو صفت بہت نمایاں تھی اور جن کا اقرار ان کے تمام جاننے والوں اور عزیزوں کو تھا وہ اپنے والد ماجد کی فرماں برداری اور ان کو راحت پہنچانے اور خدمت کا جذبہ تھا، اس میں وہ اپنے ساتھیوں میں ضرب المثل تھے، اس سلسلہ کا سب سے حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ وہ انگریزی کا کوئی بڑا سالانہ امتحان دے رہے تھے، خاندان میں کوئی تقریب تھی جس میں والد صاحب اپنے بجائے ان کو بھیجنا چاہتے تھے، والد صاحب کو اس کا علم نہیں تھا یا ذہول ہوگیا کہ وہ امتحان دے رہے ہیں اور ایک پرچہ چھوڑ دینے سے پورا تعلیمی سال برباد ہوجائے گا۔ انھوں نے ان کو بلایا اور اس تقریب میں شرکت کے لئے کانپور یا ہنسوہ جانے کے لئے کہا، وہ فوراً آمادہ ہوگئے۔ بعد میں والد صاحب کے کسی دوست نے ان کو بتایا کہ ان کا امتحان

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۸۹

www.abulhasanalinadwi.org

ہو رہا ہے اور اس روز پرچہ ہے، اس وقت والد صاحب نے انہیں حکماً منع کیا، اور اس طرح وہ نقصان سے بچ گئے۔ مطب شروع کرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قابل کیا تو انھوں نے والد صاحب کا حج بدل کرایا اور اس کے لئے انھوں نے خاندان کے ایک نہایت صالح بزرگ مولوی سید حسن مجتبیٰ صاحب مرحوم کا انتخاب کیا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور ان کے دوستوں کے صاحبزادوں کے ساتھ ہمیشہ خصوصیت برتتے۔ ان کا عمل گویا اس حدیث پر تھا **إنّ من أبر البر بر الرجل اهل وُدِّ أبيه** (بڑی نیکی اور سعادت مندی یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کے تعلق والوں سے حسن سلوک کرے) وہ بہت کم دعوت کرتے تھے لیکن جب والد صاحبؒ کے دوستوں میں یا دوستوں کے صاحبزادوں میں سے کوئی آجاتا تو ضرور پرتکلف دعوت کرتے اور اس موقع پر بہت خوش نظر آتے۔''(۱)

ان صفات وعلمی کمالات کے ماسوا ان کی ایک بڑی صفت اور زندگی کا جوہر ان کی دینی حمیت، عالم اسلام کی فکر اور دعوت اسلام کا جذبہ اور ذوق ہے۔ میں نے گوشہ نشین زندگی اور انفرادی فرائض کی مشغولیت کے ساتھ عالم اسلام کی اتنی فکرمندی، اتنی وسیع اور گہری واقفیت اور اس کے حالات وتغیرات کے تتبع کا ایسا ذوق نہیں دیکھا۔

ان کا اس ارشاد نبوی پر یقین اور عمل تھا کہ ''**من لم يهتم بأمر المسلمين فليس منهم**'' (جس کو مسلمانوں کے معاملہ کی فکر نہ ہو وہ ان میں سے نہیں ہے۔) فلسطین کا جہاد ہو یا الجزائر کی جنگ ان کا دل اس سے متعلق تھا اور ایک بعید الوطن مسلمان پر ان کے بارہ میں جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کرنے کی فکر تھی، عالم اسلام میں پیش آنے والے خوش کن یا رنج دہ حادثہ سے وہ اسی طرح متاثر ہوتے تھے جیسے وہاں رہنے والا دردمند وفکرمند مسلمان۔(۲)

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۹۳-۳۹۴ (۲) حیات عبدالحی ص ۳۹۵

www.abulhasanalinadwi.org

اللہ تعالیٰ نے ان کو تربیت کا بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا، حضرتؒ کی انھوں نے جس طرح تربیت ونگہداشت کی وہ ایک مستقل موضوع ہے، انشاء اللہ اس کا کچھ تذکرہ حضرت کی اصل سوانح میں آئے گا۔ حضرت کے علاوہ صاحبزادہ گرامی منزلت مولانا سید محمد الحسنی اور خواہرزادگان، مولانا سید محمد ثانی صاحب، مولانا سید محمد رابع صاحب اور مولانا سید محمد واضح رشید صاحب بھی ڈاکٹر صاحب کے تربیت یافتہ ہیں، اپنی صاحبزادیوں کی تعلیم وتربیت کا بھی انھوں نے خصوصی خیال رکھا۔ ان کی تربیت واصلاح کے دسیوں ایسے واقعات ہیں جو اس باب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

اب اس مضمون (جو بعض ضروری اضافوں کے ساتھ حضرت ہی کے مضمون کی تلخیص ہے) کا اختتام حضرتؒ ہی کی اس تحریر پر کیا جاتا ہے، جس پر حضرتؒ نے اپنے مضمون کو ختم فرمایا ہے۔

حضرتؒ فرماتے ہیں :

۱۳۷۰ھ، ۱۹۵۱ء میں جب یہ راقم سطور حجاز ومصر وشام وفلسطین اور سوڈان کے طویل سفر سے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد واپس ہوا، تو طلبائے دارالعلوم کی ''انجمن الاصلاح'' نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں میں نے اس سفر کی مختصر روداد سنائی، مصر وشام کے بلند پایہ مفکرین اور مختلف مکاتب خیال کے نامور زعماء وقائدین سے جو تبادلۂ خیال ہوا، عربوں کو جو اس دعوت کے فطری علمبردار ہیں، ان کی ذمہ داریاں یاد دلانے کی جو توفیق ہوئی اس کا مختصر تذکرہ کیا۔ حاضرین جلسہ کی پہلی صف میں وہ محبوب ونورانی چہرہ بھی تھا جس کی تعلیم وتربیت اور پدرانہ شفقت سے اس کی ٹوٹی پھوٹی اہلیت پیدا ہوئی، اور دہقانی اور عجمی کو عربوں کو ان کی زبان میں دین کا پیغام دینے اور انہیں سے پڑھا ہوا سبق ان کے سامنے دہرانے کی جرأت وصلاحیت پیدا ہوئی تو معاً فارسی کا یہ شعر یاد آ گیا اور اس چہرہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اسی کی

www.abulhasanalinadwi.org

تعلیم وتربیت کا فیض ہے اور اب آپ کے اس مختصر سوانحی خاکہ کو اس پر ختم کیا جاتا ہے ؂

روح ''پدرم'' شاد کہ فرمود بہ استاد
فرزند مرا عشق بیاموز دِگر ہیچ (۱)

www.abulhasanalinadwi.org

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۹۸

تیسرا باب

ولادت وطفولیت اورابتدائی تعلیم وتربیت

دائرہ شاہ علم اللہ

لکھنؤ سے اسی کلو میٹر دور شہر رائے بریلی کے مشرقی جانب دو کلو میٹر کے فاصلہ پر سئی ندی کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی آباد ہے جو اپنے بانی حضرت شاہ علم اللہؒ کے نام سے موسوم ہے اور اس کو ''دائرہ شاہ علم اللہ'' کہتے ہیں۔ اس کا مشہور نام تکیہ کلاں بھی ہے۔ کلاں اس کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے قریب ہی ''چھوٹی تکیہ'' کے نام سے ایک اور بستی ہے جو شاہ عبدالشکور مجذوب کا مسکن اور مدفن ہے۔ ان ہی شاہ صاحب موصوف کے اصرار پر حضرت شاہ علم اللہ نے یہاں کا قیام اختیار فرمایا تھا۔(۱)

پونے چار سو سال سے یہی بستی حضرت شاہ صاحب کے خاندان کا مسکن ہے۔ اس خاندان میں ایسے علماء وصلحاء اور مشائخ واولیاء پیدا ہوئے کہ کم خاندانوں میں اس کی نظیر ملے گی۔ اس کا کچھ تذکرہ دوسرے باب میں گزر چکا ہے۔

مولانا عبدالعلی صاحب کی ہجرت

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ صاحب کے عم زاد بھائی شاہ ہدایت اللہ صاحب کی اولاد میں ہیں جو عہد شاہجہانی میں امور مذہبی کے صدر الصدور تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی اہلیہ کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی۔ ان کا بقیہ خاندان نصیر

(۱) تفصیل کے لئے تذکرہ شاہ علم اللہ مولفہ مولانا سیّد محمد الحسنی ملاحظہ ہو۔

آباد میں مقیم تھا۔ حضرت مولانا کے اجداد میں سب سے پہلے مولانا میر عبدالعلیؒ نے نصیرآباد سے تکیہ ہجرت کی۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حضرت مولانا محمد ظاہر صاحب کی دو ہی صاحبزادیاں تھیں جو یکے بعد دیگرے مولانا عبدالعلی صاحب کو منسوب ہوئیں۔ یہ دونوں ہی حضرات حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے دست گرفتہ اور صاحب اجازت تھے۔ اس نسبت سے بھی مولانا عبدالعلی صاحب کو مولانا محمد ظاہر صاحب سے خاص موانست وعقیدت تھی۔ یہی محبت ونسبت کشاں کشاں ان کو نصیرآباد سے تکیہ لے آئی۔ مولانا محمد ظاہر صاحب سے ان کی بیٹی کو ترکہ میں جو مکان ملا مولانا عبدالعلی صاحب کا خاندان اسی میں مقیم ہوا۔

ولادت

اپنی اسی آبائی مکان میں حضرت مولاناؒ پیدا ہوئے۔ اس بستی نے ہر دور میں جو کہکشاں سجائی تھی اس میں ایک آفتاب عالمتاب کا اضافہ ہوا جس کی کرنیں دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچیں یہ ۶ر محرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ ساتویں دن عقیقہ کی سنت ادا ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام نامی پر ''ابوالحسن علی'' نام تجویز کیا گیا۔

بچپن کے واقعات

عمر کوئی ڈیڑھ سال رہی ہوگی کہ ۱۹۱۵ء کو تکیہ میں وہ ہولناک طوفانی سیلاب آیا جس نے سب پچھلے ریکارڈ توڑ دئے، اسی سیلاب میں حضرتؒ کا آبائی مکان جو نیم پختہ نیم خام تھا گر گیا۔ اس کی تعمیر نو تک رائے بریلی کے قیام میں حافظ سید عبید اللہ صاحب مرحوم کے مکان میں ٹھہرنا ہوتا تھا(۱)۔ جو بڑے شفیق ماموں تھے اور اس بستی (دائرہ شاہ علم اللہ) میں ان کی شخصیت بڑی دل آویز اور محبوب تھی، حضرتؒ سے ان کو

(۱) ندوہ کے نظم وانتظام کے سلسلہ میں مولانا حکیم عبدالحی صاحب کا قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہتا تھا۔ رائے بریلی میں کم ہی رہنے کی نوبت آتی تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

بڑی محبت تھی، اپنی اولاد سے زیادہ حضرت کا خیال فرماتے۔اسی زمانہ میں حضرت کی والدہ کے علاوہ خاندان میں کئی بیبیاں حافظہ تھیں اور علمائے فرنگی محل کے فتوی کے مطابق ان کی باقاعدہ تراویح ہوتی تھی، خاندان کے بزرگ اس کا بڑا اہتمام کرتے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ''والدہ صاحبہ کے قرآن مجید سنانے کا سلسلہ میرے شعور کے بہت بعد تک جاری رہا، میں کبھی دروازہ میں کھڑا ہوکر سنتا، ایسا معلوم ہوتا کہ پانی برس رہا ہے، صحت مخارج کے ساتھ روانی پھر اس میں رقت ودردنسوانی نورٌ علیٰ نورٌ (۱)''۔

اس کے علاوہ بچپن کے بعض وہ واقعات ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں کہ جن سے اس وقت خاندان کے مزاج و مذاق کا بھی اندازہ ہوگا اور حضرتؒ کی جدی شاخ کے بعض امتیازات بھی معلوم ہوں گے۔

پہلا واقعہ تو حضرتؒ کے شعور سے پہلے کا ہے، یہ زمانہ انگریزی اقتدار اور اس کی تہذیب کے اقبال وعروج کا زمانہ تھا، ہر اس چیز کو عزت ومرعوبیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جس کا اس قوم و ملک سے انتساب ہو، یہ خارجی اثرات اس خاندان پر بھی مرتب ہورہے تھے، حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی وفات کو کئی سال گزر چکے تھے، خاندان کا عمومی رجحان انگریزی تعلیم کی طرف ہونے لگا تھا، جن بچوں کو ذہین سمجھا جاتا ان کو انگریزی تعلیم دلوائی جاتی۔اسی زمانہ میں حضرتؒ کے خالہ زاد بھائی سید محمد احمد صاحب بیرسٹر انگلستان تعلیم حاصل کرنے گئے اور فلسفہ میں ''ایڈنبرا یونیورسٹی'' سے ایم، اے کرکے آئے۔اس وقت جس والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا گیا اس سے اس وقت خاندان کے ذہنی رجحانات وخیالات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔حضرت اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''ان کی آمد پر اس چھوٹے سے خاندان اور چھوٹی سی بستی میں بڑا استقبال اور اہتمام کیا گیا تھا کہ اس وقت شاید پورے ضلع میں کم سے کم مسلمان شرفاء اور زمینداروں کے خاندانوں میں شاید ہی کوئی یہ اعزاز حاصل کرکے آیا

(۱) کاروان زندگی ص ۴۶

www.abulhasanalinadwi.org

ہو، یہ میرے شعور سے پہلے کی بات ہے، میں نے اس مسرت اور استقبال کے قصے سنے ہیں جو انکے پہنچنے پر دیکھنے میں آئے۔(۱)‘‘

اسی طرح حضرتؒ کے حقیقی ماموں زاد بھائی سید سراج النبی صاحب نے امریکہ کا سفر کیا اور نیویارک میں موٹر میکانک کی تربیت حاصل کی اور وہاں کے ایک کالج سے کامرس کی ڈگری لی، لیکن اس کے باوجود خاندان میں حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کے اثر سے اس وقت بھی عقیدہ پر تمسک اور نمازوں کا اہتمام باقی تھا۔ یورپ و امریکہ کے اس سفر کے باوجود دونوں کی اس ادا میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

دوسرا واقعہ جس سے حضرت کی جدی شاخ کی امتیازی صفت، اس کا دینی شعور اور حضرت سید احمد شہیدؒ سے اسکی وابستگی بلکہ وارفتگی کا اظہار ہوتا ہے، یہ ہے کہ ٹونک کے وہ اعزہ جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد وہاں مقیم ہو گئے تھے جب ان کو وہاں سے تحریک خلافت کے زمانہ میں ۱۹۲۱ء میں جلاوطن کیا گیا، وہ اپنے قدیم وطن رائے بریلی آئے تو عزیزوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، سید محمد اسماعیل صاحب جو حضرت سید صاحب کے حقیقی نواسہ کے صاحبزادہ تھے، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے گھر ٹھہرے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم لکھنؤ آئے تو اچھے بھیا مرحوم (مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب) نے مجھ سے کہا ’’اسماعیل اگر تم ہمارے گھر ٹھہرو گے تو احسان کرو گے۔‘‘ اس میں وہی حضرت سید صاحب کی نسبت کا احترام اور ان سے محبت و عقیدت کا جذبہ کارفرما تھا جو خاندان کی اس شاخ کا امتیاز تھا۔

اکل حلال کا اس خاندان میں ہمیشہ اہتمام رہا، خاص طور پر حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کو اس کی ہمیشہ فکر رہتی تھی کہ ایک حبّہ بھی مشتبہ مال کا گھر میں نہ آنے پائے، اس کا اثر پورے گھرانہ پر تھا، یہاں تک کہ کام کاج کرنے والوں کو بھی اس کا خیال رہتا تھا کہ خاندان کے بچوں کو مشتبہ مال سے محفوظ رکھا جائے۔ گھر کے اسی ماحول اور احتیاط کی اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرت اپنے گھر کی بوڑھی انّا

(۱) کاروان زندگی ص ۵۱

www.abulhasanalinadwi.org

کے ساتھ تکیہ سے خالص ہاٹ (جہاں بعض عزیزوں کے مکانات تھے) جارہے تھے، اس وقت حضرت کی عمر مشکل سے تین، چار سال رہی ہوگی، راستہ میں کہیں غریبوں کو کھانا کھلایا جارہا تھا، بڑی بی نے کھانا لیا اور وہیں کھانے بیٹھ گئیں، حضرت فرماتے ہیں "میں بچہ تھا، میرے بھی منھ میں پانی بھر آیا اور میں نے شرکت کرنی چاہی، انھوں نے کہا کہ بیٹا یہ تمہارے کھانے کا نہیں اور انھوں نے کھانے نہیں دیا۔(۱)"

اس خاندان میں خالص حصول معاش کی جو کوششیں کی گئیں، وہ کامیاب نہیں ہوسکیں۔ جن لوگوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور امریکہ جرمنی، انگلینڈ کا سفر کیا اور بڑی بڑی ڈگریاں لے کر لوٹے وہ بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھاسکے۔ اس کے علاوہ زمینداری سے بھی جو اس زمانہ میں بڑی عزت ومنفعت کا ایک ذریعہ تھا، خاطر خواہ مالی فائدہ حاصل نہ ہوسکا، اس لئے خاندان کے بزرگوں نے ذریعہ آمدنی کے لئے ایک مشترکہ بھٹا لگایا جس کے ذمہ دار حضرت کے رشتہ کے چچا مولانا عزیز الرحمٰن صاحب قرار پائے، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحب کی جو فیسیں باقی رہ گئیں تھیں ان کو لے کر برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے بھی اس میں شرکت کی، اس کی کچھ آمدنی بھی ہوئی۔ حضرت فرماتے تھے کہ "میں نے اس کی آمدنی سے ایک ہوائی بندوق (Air-Gun) اور ایک گھڑی خریدی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد اسکو بھی بند کرنا پڑا۔ آمدنی کی ایسی کوششیں اس خاندان کو راس نہیں آئیں، اس لئے کہ تجارت کے لئے جو ذہنی صلاحیتیں اور تجربہ چاہئے اس کی خاندان میں کمی تھی۔"(۲)

والد صاحب کے ندوۃ العلماء سے تعلق اور مطب کی وجہ سے بچپن میں زیادہ تر لکھنؤ ہی قیام رہتا، درمیان میں کبھی کبھی رائے بریلی جانا ہوتا، رائے بریلی کے علاوہ سفر کی دوسری منزل قصبہ ہنسوہ ضلع فتح پور تھا، جہاں سادات حسینی واسطی کی ایک شاخ عرصہ سے مقیم تھی اور اس سے اس خاندان کی زمانہ سے قرابتیں چلی آرہی تھیں،

(۱) کاروان زندگی اول ص ۸۲
(۲) کاروان زندگی اول ص ۵۴

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت کے والد کا اس سے نانیہالی تعلق بھی تھا اور وہ ان کی سسرال بھی تھی، یہ خاندان دینی و دنیوی وجاہت رکھتا تھا، جس کا اصل سبب حضرت مولانا عبد السلام صاحبؒ کی ذات گرامی تھی جو حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددیؒ کے اجل خلفاء میں تھے۔ اس کے علاوہ دنیوی وجاہت کا ایک بڑا سبب زمینداری بھی تھی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ قرابتوں کی وجہ سے والد صاحب گویا اس خاندان کے چشم و چراغ تھے اور قصبہ کا بچہ بچہ ان سے محبت کرتا تھا اور وہ وہاں جا کر بہت مسرور ہوتے۔ یہ بات ایسی نمایاں تھی کہ مجھے اپنی کمسنی کے باوجود اس کا احساس ہوا، اور میں نے ایک دن ان سے کہا کہ بابا آپ ہنسوہ جا کر اتنے خوش کیوں ہوتے ہیں، فرمایا کہ عبید اور احمد سعید تمہارے کون ہیں؟ میں نے کہا ماموں، فرمایا کہ تم وہاں جا کر خوش ہوتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا تکیہ تمہارے ماموں کا گھر ہے، ہنسوہ ہمارے ماموں کا گھر ہے؟

حضرت کے شعور کا آغاز ہی تھا کہ تحریک خلافت کا لاوہ پھوٹ پڑا اور پورے ملک میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی۔ حضرت اس زمانہ کی اپنی یادداشت تحریر فرماتے ہیں :

''شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے اور علی برادران اور گاندھی جی ہی کی حکومت ہے۔ پرنس آف ویلز کا لکھنؤ آنا بھی یاد ہے۔ میں کسی ضرورت سے گھر سے نکلا، دیکھا تو شہر میں ہو کا عالم ہے، بھرے بازار، چلتی ہوئی سڑکیں ویران پڑی ہیں، امین الدولہ پارک (جھنڈے والے پارک) میں ولایتی کپڑوں کو آگ لگائی جاتی تھی، جو لوگ ولایتی کپڑوں میں ملبوس ہوتے وہ راستہ چھوڑ کر چلتے۔ اس زمانہ میں میں نے مولانا محمد علی اور گاندھی جی کو دیکھا۔ ہمارے بھائی سید حبیب الرحمٰن امین آباد ہائی اسکول میں پڑھتے تھے، ترک موالات کے اثر سے اسکول سے نکل آئے اور کسی نیشنل اسکول میں داخلہ لیا۔ جن لوگوں کو اعزازی یا امتیازی تمغے ملے تھے ان پر انگریزی حکام کے نام یا انگریزی لکھی ہوئی تھی ان کو پاؤں سے روندتے اور

www.abulhasanalinadwi.org

اپنے عزیزوں اور محلّہ والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہزاروں آدمیوں نے انگریزی لباس بلکہ انگریزی معاشرت ترک کرکے دیسی لباس اور ہندوستانی معاشرت اختیار کر لی اور ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔

ہمارا خاندان بھی تحریک خلافت کا بالکل ہمنوا تھا اور یہ بات خاندانی روایات، اسلامی حمیت اور خاندان کی تاریخ، جہاد و غزوات کے عین مطابق تھی۔ والد صاحب اگرچہ نہایت خاموش اور عزلت پسند تھے لیکن تحریک خلافت کی تائید و حمایت میں انھوں نے بھی ایک اپیل شائع کی جس کا مجھے اپنے بچپن میں دیکھنا یاد ہے، اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے اس زمانہ میں اس گورنمنٹ گرانٹ کو بند کرادیا جو ندوہ کو ملتی تھی۔ مولانا محمد علی مرحوم کی والدہ محترمہ بی امّاں جب اپنے دورہ کے سلسلہ میں رائے بریلی آئیں تو والدہ صاحبہ سے ملنے اور تعزیت کرنے (جو ایام عدت میں تھیں) تکیہ تشریف لائیں۔ خاندان کے بزرگوں کا ان کو تخت پر بٹھا کر اور خود اٹھا کر ہمارے گھر لانا ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔(۱)"

www.abulhasanalinadwi.org

تعلیم کا آغاز

غالباً چار سال کی عمر میں رائے بریلی کے قیام میں تسمیہ خوانی ہوئی جو حضرت کے چچا مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب (۲) نے کرائی چونکہ زیادہ تر قیام لکھنؤ میں ہی رہتا تھا، اسلئے باقاعدہ تعلیم کا آغاز وہیں سے ہوا۔ محلّہ کی مسجد نوازی کے ایک حجرہ میں مکتب

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۷۲-۷۳

(۲) مولانا عزیز الرحمٰن صاحب، مولانا عبدالحی صاحب کے پھوپھی زاد بھائی تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ابتدائی دور میں تعلیم پائی تھی، پھر دارالعلوم میں مدرس ہوئے، ایک زمانہ تک بحیثیت نائب ناظر کتب خانہ بھی کام کیا، نہایت غیور، منتظم اور رعب داب کے بزرگ تھے۔ مولانا عبدالحی صاحب سے بڑی محبت و عقیدت تھی، حضرت مدنی سے بیعت کا تعلق تھا، نہایت خوش اوقات اور ذاکر و شاغل تھے، ۱۶؍شوال ۱۳۷۷ھ کو وفات پائی اور حظیرہ شاہ علم اللہ میں مدفون ہوئے۔ مولانا سید ابوبکر حسنی صاحب ایم اے ان ہی کے فرزند ہیں۔

لگتا تھا، اسی مکتب میں داخلہ ہوا، مسجد کے موذن و امام حافظ محمد سعید صاحب ہی اس مکتب کے مدرس تھے، حروف شناسی، قرآن مجید اور اردو کی ابتدائی تعلیم ان ہی کے پاس ہوئی۔ خاندان کے دستور کے مطابق تقریباً سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم ہوا، اس کی خوشی میں والد ماجد نے ہلکی سی ضیافت بھی کی۔ اس موقع پر یہ دلچسپ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت کے بھانجے سید محمد مسلم حسنی صاحب (جو تقریباً حضرت کے ہم عمر اور بچپن کے دوست تھے، بعد میں حضرت کی سب سے بڑی بھتیجی سے ان کا عقد ہوا۔) اسی زمانہ میں لکھنؤ گئے، مولانا عبد الحی صاحب نے ان سے پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ انھوں نے غالباً پارہ عـــمَّ بتایا تو مولانا بڑی خوشی میں کہنے لگے کہ ''علی کا تو قرآن مجید ختم ہوگیا۔''

با قاعدہ تعلیم

اردو کی با قاعدہ تعلیم عم محترم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کے یہاں شروع ہوئی جو اس وقت دفتر ندوۃ العلماء میں کام کرتے تھے، اس زمانہ میں دار العلوم کا دفتر اور کتب خانہ گولہ گنج میں خاتون منزل کے قریب ایک عمارت میں واقع تھا، حضرت کے مکان سے اسکا فاصلہ کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ ہوگا جو اس عمر کے اعتبار سے خاصا تھا۔

اردو حروف شناسی تو قاعدۂ بغدادی سے شروع ہوئی تھی، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کے یہاں زیادہ تر مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی کی اردو کتابیں نصاب میں رہیں جن میں ''سفینہ اردو'' خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کے بارے میں حضرت نے لکھا ہے کہ ''ہم بھائی بہنوں کے لئے گویا بیاض اور وظیفہ کی کتاب تھی اور جس کی بہت سی نظمیں ہم لوگوں کو زبانی یاد ہوگئی تھیں۔'' (۱)

اردو بقدر ضرورت پڑھ لینے کے بعد خاندانی دستور کے مطابق فارسی شروع ہوئی، سب سے پہلے انجمن حمایت الاسلام کی فارسی کی پہلی کتاب دی گئی اور تعلیم دینے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۷۰

www.abulhasanalinadwi.org

کے لئے ایک کہنہ مشق استاد مولوی محمود علی صاحبؒ کا انتخاب ہوا جن کے بارے میں حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ ''وہ بڑے مہذب، شفیق اور دیرینہ سال معلم تھے۔'' (۱) فارسی کے ساتھ اسی زمانہ میں والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی تصنیف کی ہوئی کتابیں ''تعلیم الاسلام'' اور ''نورالایمان'' پڑھی، خوش خطی کی مشق بھی اسی زمانہ میں کی جو تعلیم کا ایک اہم جزاور ضروری نصاب تھا۔

کتابی شوق اور خاندانی ذوق

اس عمر میں جو عام طور سے کھیل کود کی ہوتی ہے اور جس میں کتاب سے ایک توحش سا ہوتا ہے، حضرت کو کتابوں سے بڑا اشغف تھا بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ وہی حضرت کا کھیل اور دلچسپی کا سامان تھا، اس میں گھر کے ماحول کو بھی بڑا دخل تھا۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں :

''ہمارا گھرانہ علماء و مصنفین کا گھرانہ ہے، والد صاحب اپنے زمانہ کے مصنفوں میں تھے، خاندانی وموروثی اثرات بڑے طاقتور ہوتے ہیں، وہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور بچوں اور بچیوں سب میں ان کے اثرات کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ کچھ یہ آبائی اثر، کچھ والد صاحب کا ذوق وانہاک ہمارے سارے گھر پر یہ کتابی ذوق سایہ فگن تھا۔ کتب بینی کا یہ ذوق، ذوق سے بڑھ کر لت اور بیماری کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے تو اس کو پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ہم بھائی بہنوں کو جو تھوڑے سے پیسے دست خرچ کے لئے ملتے یا خاندان کے کوئی بزرگ جاتے ہوئے (اس زمانہ کے خاندانی رواج کے مطابق) بچوں کو روپئے دے جاتے اس کا ایک ہی محبوب مصرف تھا کہ اس سے کوئی کتاب خرید لی جائے۔

اس سلسلہ میں خود میری ایک دلچسپ کہانی سنتے چلئے کہ میرے پاس اس

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۷۰

www.abulhasanalinadwi.org

طرح کچھ پیسے آ گئے وہ ایک دو آنے سے زیادہ نہ تھے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کتب فروشوں ہی کے یہاں ملتی ہے اور ہر چیز کی دوکان الگ ہوتی ہے۔ میں امین آباد گیا، گھنٹہ گھر والے پارک کے سامنے بڑی دوکانوں کی جو قطار ہے اس میں کسی دوا فروش کی دوکان پر پہنچا، غالباً ''سالومن'' کمپنی تھی، میں نے پیسے بڑھائے کہ کتاب دے دیجئے۔ دکان پر کام کرنے والے صاحب نے سمجھا کہ کسی شریف گھرانہ کا بھولا بھالا بچہ ہے۔ کیمسٹ کی دوکان پر کتاب کیا ملتی، دواؤں کی فہرست اردو میں تھی انھوں نے وہی بڑھا دی اور پیسے بھی واپس کر دیئے، میں پھولے نہیں سماتا تھا کہ کتاب بھی مل گئی اور پیسے بھی واپس آ گئے، خوش خوش گھر پہنچا اور اس سے اپنے چھوٹے سے اس کتب خانہ کو سجایا جو والد صاحب کے یہاں کی ان کتابوں سے بنایا تھا جو ان کے لئے بیکار تھیں اور وہ ردی میں ڈال دیتے تھے۔ یہی شوق میری دونوں بہنوں کا تھا کہ کتاب کے بغیر ان کو چین نہیں آتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک کتاب فروش ہماری گلی میں آتے تھے اور صدا لگاتے تھے ''ہرنی نامہ'' ''نور نامہ'' ''حلیمہ دائی کی کہانی'' ''معجزہ آل نبی'' ''میلاد نامہ'' وغیرہ وغیرہ۔ ان کی صورت ابھی تک آنکھوں میں ہے۔ وہ ان کتابوں کے اشعار گا گا کر پڑھتے تھے۔ ادھر ان کی آواز کان میں آئی ادھر ان دونوں بہنوں کی طرف سے حکم ملا کہ فلاں کتاب لے آؤ، دوڑا دوڑا گیا اور کتاب خرید لایا۔ ہمارا گھرانہ عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا سختی سے پیرو تھا اور ان کے اثرات ایسے رچ بس گئے تھے کہ بے اصل اور غیر مستند چیزیں جن سے عقائد میں خلل پڑتا ہو گھر میں بار نہیں پاتی تھیں، مردوں سے زیادہ عورتیں عقیدہ کے بارے میں سخت تھیں۔ اس لئے ''معجزہ آل نبی'' جیسی کتابوں کا تو یہاں گزر نہ تھا، البتہ سیرت بزرگوں کی حکایات اور بے ضرر دلچسپ کتابیں خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں، ان کتابوں کی قیمت ہی کیا تھی،

www.abulhasanalinadwi.org

کسی کے دو پیسے، کسی کے چار پیسے، بہت قیمت ہوئی تو دو آنے، چار آنے، دونوں میں سے کسی نے ترنم کے ساتھ مزے لے لے کر پڑھنا شروع کیا، اور جب تک کتاب ختم نہ کر لی ان کو چین نہ آیا۔ اسی زمانہ کا سنا ہوا حضرت حلیمہ دائی کا قصہ آج تک دل پر نقش ہے۔ اس کے ابتدائی چار شعر یہ ہیں۔

ایک عاشق تھی حلیمہ دائی | جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی | اسکی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی
نور اللہ کو لائی گھر میں | یعنی اس شاہ کو لائی گھر میں
واہ! کیا طالع بیدار ملے | جس کو کونین کے سردار ملے

اس سیدھی سادی نظم نے جس کے کہنے والے کا نام بھی معروف نہیں اس پاک محبت کے دل کی نرم سرزمین میں ابتدائی بیج ڈالے، پھر جب "سیرۃ ابن ھشام" میں یہ عزیز و لذیذ حکایت پڑھی، جس میں راوی نے اپنے معمول سے زیادہ دراز نفسی سے کام لیا

ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

تو وہ معصوم زمانہ جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں یاد آ گیا۔

کتابوں کی خریداری میں صرف اسی کتب فروش ہی کے ذخیرہ پر بس نہ تھی جس کی گٹھری وہ اپنے بغل میں داب کر لاتے تھے، بلکہ مجھے وقتاً فوقتاً حکم ملتا رہتا تھا، میں "صدیق بکڈپو" سے جو ہمارے قریب سب سے بڑی کتابوں کی دکان تھی ان کی انتخاب کی ہوئی کتابیں خرید لاؤں۔ یہ سب کتابیں جو کبھی نظم میں ہوتیں اور کبھی نثر میں، مشترک طور پر پڑھی جاتی تھیں، اسی زمانہ میں سیرت پاک پر اردو کے چھوٹے بڑے رسالے پڑھے گئے اور دل و دماغ میں پیوست ہو گئے، ان کے نام تو اب یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ان کے پڑھنے سے اس زمانہ کے رواج کے مطابق مجھے میلاد یا سیرت کا جلسہ کرنے کا شوق ہوا، اپنے ہم سن بچوں کو مدعو کیا اور ان کو دعوت دینے کے لئے خود گھر گھر گیا، انہیں بہنوں

www.abulhasanalinadwi.org

میں سے کسی نے میرے سر پر چھوٹی سی پگڑی باندھی، عمر یہی آٹھ نو برس کی رہی ہوگی، انہیں کتابوں میں سے میں نے کوئی کتاب لے کر پڑھنی شروع کی، قابلیت کا یہ حال تھا کہ حضورؐ کے دادا سردار قریش **عبد المُطَّلِب** کو **عبد المَطْلَب** پڑھ رہا تھا۔ والد مرحوم خاموشی سے آ کر ایک طرف اوٹ میں کھڑے ہو گئے تھے، ان کا دل یہ منظر دیکھ کر کتنا باغ باغ ہو رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے عشق نبویؐ کا ان کو حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور اسی سے ان کی تحریروں میں آب و رنگ ہے۔ ان کے لئے کیا کم خوشی کی بات تھی کہ ان کا کم سن بچہ اس ذکر خیر میں مصروف ہے جو ہر خیر و برکت کا سرچشمہ ہے، اور اس طرح وہ خود اپنا طالع بلند اور اپنا بخت بیدار کر رہا ہے ؎

حکایت از قد آں یار دل نواز کنیم با ایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنیم

نعتوں میں سب سے زیادہ امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعتیں ان بہنوں کی زبان پر جاری تھیں، خاص طور سے حضرت محسن کی مشہور نظم

ع سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

بہت پڑھی جاتی تھی۔ کتابوں میں "مسدس حالی" گویا ورد زبان تھی اور اس کا بڑا حصہ ان دونوں بہنوں کو تقریباً حفظ تھا۔ اس زمانہ میں شرفاء اور پڑھے لکھے لوگوں کا کوئی گھر بھی اس کتاب کے مطالعہ اور نغمہ خوانی سے خالی نہ تھا۔"(۱)

والد صاحب کے اسی ذوق کا اثر تھا کہ جب ہنسوہ جانا ہوتا تو چونکہ لوگ والد صاحب سے خوب واقف تھے، اور ان سے عقیدت و محبت رکھتے تھے، اس لئے حضرت سے کوئی وعظ کی فرمائش کرتا، کوئی نبض دکھاتا اور نسخہ پوچھتا کہ والد صاحب عالم بھی تھے اور طبیب بھی۔ اس وقت حضرت کی عمر مشکل سے ۶-۷ سال کی تھی۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں :

"وعظ کی فرمائش پر میں قرآن شریف کی آیت 'یا أیھا الذین آمنوا

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۵۷-۶۰

www.abulhasanalinadwi.org

قوآ أنفسكم و أهليكم ناراً (سورہ تحریم-۶) اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے۔ پڑھ کر اس کا ترجمہ کرتا۔ پھر کوئی نبض دکھاتا اور کہتا حکیم جی نسخہ بتایئے، میں نسخہ بولتا گل بنفشہ، گاؤزبان، عناب ولایتی، تخم خبازی، تخم خطمی پرہیز پوچھنے پر ''شوربا، پھلکا'' بتاتا۔''(۱)

کون جانتا تھا کہ یہ نوخیز بچہ جو آج تقریر کی نقل کر رہا ہے، آگے چل کر صف اول کے مقررین میں شمار کیا جائے گا اور ہزاروں بندگان خدا کی صحیح رہنمائی کرنے والا اور ان کو راہ راست پر لانے والا ہوگا، اور آج نباض حکیم کی نقل کر کے نسخہ بتانے والا آگے چل کر امت کا نبض شناس اور اس کے امراض کا علاج کرنے والا اور اس کے درد کا درماں ہوگا۔

والد صاحبؒ کی شفقت وتوجہ

حضرت نے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی شفقت کا زمانہ کم پایا۔ حضرت کی عمر دس سال سے بھی کم تھی کہ انھوں نے رحلت فرمائی مگر اس پورے زمانہ میں حضرت کو ان کی پوری شفقت وتوجہ حاصل رہی۔ حضرت ہی کے الفاظ میں اس کو درج کیا جاتا ہے۔

''والد صاحب کا اصل انہماک تصنیف وتالیف میں تھا، مطب اور ندوہ کی نظامت کے ضروری کام سے جو کچھ وقت بچتا وہ سب ''نزهة الخواطر'' کی تصنیف میں صرف ہوتا، مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ہمارے مکان کے بالائی جنوبی مشرقی کمرہ میں جو سڑک کی طرف ہے ان کی مسہری تھی، اس کے پاس آرام کرسی، اس آرام کرسی پر برابر وہ تحریر وتسوید میں مشغول رہتے، مجھے کم سنی کے باوجود ان کے ساتھ کھانا کھانے کا بہت شوق تھا، اس انتظار میں دیر تک بیٹھا رہتا، وہ غیر معمولی طریقہ پر کم خوراک تھے، لیکن غذا لطیف، سادہ مگر نفیس ہوتی۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۶۵

www.abulhasanalinadwi.org

صبح ناشتہ میں شرکت کرتا جس میں صرف چائے، ایک آدھ بسکٹ اور تھوڑا سا دیسی مکھن ہوتا، پرانے دوستوں میں سے کوئی باہر سے آتا، تو اس کی پر تکلف دعوت کرتے، اور ہم لوگوں کی گویا موج ہو جاتی۔ والدہ صاحبہ کھانوں کی تیاری میں نہ صرف مشاق بلکہ اختراعی ذہن رکھتی تھیں۔ مجھے اس زمانہ میں معلوم نہیں کہ کہاں سے یہ شوق ہو گیا تھا کہ والد صاحب کسی مریض کو دیکھنے بھی جائیں تو میں ساتھ جاؤں، بعض اوقات تانگہ حرکت میں بھی آ جاتا تو بھی میں سوار ہونے کی کوشش کرتا۔ شہر کے کسی رئیس یا ندوہ سے تعلق رکھنے والے معزز آدمی کے یہاں جانا ہوتا تو میں بھی اپنے انہیں کپڑوں میں ساتھ ہو جاتا اور والد صاحب بھی از راہ شفقت اور مظاہر و تکلفات سے بری ہونے کی بنا پر مجھے ساتھ بٹھا لیتے، ایک آدھ مرتبہ میری ٹوپی درست کرنے کا بھی خیال آتا ہے۔

شہر میں سب سے زیادہ آمد و رفت نواب سید نور الحسن خاں کی کوٹھی بھوپال ہاؤس گھسیاری منڈی میں تھی۔ نواب صاحب کا (جو امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم کے فرزند اکبر تھے) تعلق والد صاحب سے دوستانہ نہیں برادرانہ و عاشقانہ تھا، ہمارے گھر کے بڑے چھوٹے ان کو نور میاں کہتے تھے۔ شاید کوئی ہفتہ گزرتا ہو کہ والد صاحب یا والدہ صاحبہ کا کسی تقریب یا عنوان سے بڑی کوٹھی نہ جانا ہوتا۔ اس خاندان سے عزیز داری بھی تھی۔ نواب صاحب مرحوم کی بیگم صاحبہ ہم لوگوں سے ایسا تعلق رکھتی تھیں جیسی حقیقی پھوپھیوں یا خالاؤں کا ہوتا ہے۔

نواب صاحب کے علاوہ والد صاحب کے مخصوص دوستوں اور پیر بھائیوں منشی سید محمد خلیل صاحب نہٹوری منشی رحمۃ اللہ صاحب اور شاہ محمد خاں صاحب اور شیخ محمد عرب صاحب کے یہاں بھی آنا جانا تھا۔

نور میاں کی کوٹھی کے قریب ہی ہمارے بڑے حقیقی خالہ زاد بھائی سید محمد احمد صاحب بیرسٹر کی کوٹھی تھی، ہم لوگ وہاں بھی جاتے رہتے تھے۔ مجھے اس کم

www.abulhasanalinadwi.org

سنی میں بھی جب ٦-٧ سال سے زائد عمر نہ تھی، پھولوں کا بڑا شوق تھا۔ میں ان کے چمن سے پھول توڑ کر لاتا، خوش ہوتا۔ ان چند گھروں کے علاوہ جن سے گونا گوں تعلقات تھے، والد صاحب کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسہ سیرت میں جو سال میں ایک مرتبہ بڑے اہتمام سے ہوتا تھا اور مٹھائی تقسیم ہوتی تھی اور کسی اہم رکن بالخصوص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ کی آمد پر کسی استقبالیہ وغیرہ میں جانا یاد ہے۔ ایک مرتبہ والد صاحب کے ساتھ ہنسوہ جاتے یا آتے ہوئے شیخ وقت مولانا سید نجم الدین شاہ صاحب کی خانقاہ فتحپور میں جانا یاد ہے جو ایک ٹیلہ پر تھی، ابھی تک یاد ہے کہ انھوں نے کم سن بچہ کی تواضع مٹھائی سے کرنی چاہی، مٹھائی ایک نعمت خانہ میں تھی، اس میں تالا پڑا ہوا تھا اور کنجی ان کے گھر کے کسی آدمی کے پاس تھی، مجھے اس آدمی کا تلاش کرانا اور اپنی بے چینی کہ شاید وہ نہ ملے، ابھی تک یاد ہے، یہ یاد نہیں کہ اس میں کامیابی ہوئی یا نہیں لیکن اس کی خوشی ہے کہ ایک کامل بزرگ و صاحب نسبت ہستی کی زیارت ہوگئی۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میں بچپن میں اکثر بیمار رہتا، پانی کسی برتن میں حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب نقشبندی مجددی کی خدمت میں جاتا اور وہ دم کرتے، اس طرح میں نے ان کا دم کیا ہوا پانی بہت پیا ہے، کیا عجب ہے کہ انکے انفاس متبرکہ کا کوئی اثر حصہ میں آیا ہو۔

والد صاحب کا ماحول چونکہ بالکل علمی و تصنیفی تھا، وہ بکثرت اپنی ضرورت سے کتابیں منگواتے تھے اور مصنفین بھی ان کو بھیجتے تھے۔ بہت سی کتابیں اور رسائل ایسے ہوتے تھے جن پر وہ ایک نظر ڈال کر ان کو وہ ایک طرف رکھ دیتے تھے۔ میں اس انبار سے (جو والد صاحب کے لئے بیکار تھا) رسالے، فہرستیں وغیرہ چھانٹ کر لے جاتا، صحن میں ایک کھلی الماری تھی، اس میں ان کو سجاتا۔ ایک چھوٹا سا بورڈ بنایا تھا جس پر لکھا تھا ''کتب خانہ ابوالحسن علی'' مجھے اب بھی یاد

www.abulhasanalinadwi.org

ہے کہ ایک مرتبہ میں رو رہا تھا یا کسی بات پر ضد کر رہا تھا، والد صاحب نے اپنے پیش کار مولوی سید عبد الغفور صاحب شرر استھانوی ندوی مددگار ناظم ندوۃ العلماء کو بلایا تھا، وہ زینے پر کھڑے تھے، والد صاحب نے ''گل رعنا'' کا مسودہ جو اس وقت مکمل ہوا تھا، ان کے حوالہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ مولوی سید سلیمان (مولانا سید سلیمان ندویؒ) کو اعظم گڑھ بھیج دیا جائے۔ مسودہ حوالہ کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ چپ ہو جاؤ، میں اس کتاب میں تمہارا نام چھپواؤں گا۔ خدا کی شان کہ آج ان کی وفات کے تقریباً ۶۰ برس کے بعد اسکی نوبت آ رہی ہے کہ ''گل رعنا'' کے پانچویں ایڈیشن کی اشاعت پر (جو زیر تیاری ہے) میرا اس کتاب پر تبصرہ اور ''آب حیات'' سے موازنہ بطور مقدمہ کے شائع ہو رہا ہے۔

والد صاحب کے مطب میں آ کر کبھی ان کے کوئی خاص دوست یا علماء و مشائخ میں سے کوئی ممتاز شخصیت آ جاتی تو ان کی فرمائش یا والد صاحب کی خواہش پر مجھے بلایا یا بلوایا جاتا۔ ایک مرتبہ مولانا سید تجمل حسین صاحب دیسنوی بہاری (جو حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے عشاق اور اس سلسلہ کے مشائخ میں تھے) تشریف لائے، غالباً انھوں نے خود مجھے بلوایا اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا پورا قرآن شریف مجھے عنایت فرمایا جو ابھی تک ذاتی کتب خانہ کی زینت و برکت ہے۔

۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء میں والد صاحب پر وجع مفاصل کا حملہ ہوا اور جب وجع مفاصل کے حملہ کے بعد کچھ سنبھلے تو اس دوران نقاہت اور ضعف میں نواب صاحب کی کوٹھی گھسیاری منڈی میں رات گزارنے کے لئے جایا کرتے تھے، میں ساتھ جایا کرتا تھا، وہاں جانا اور وہاں کا نقشہ خوب یاد ہے، اسی زمانہ میں ''گل رعنا'' تصنیف فرمائی تھی۔''(۱)

(۱) کاروان زندگی اول ص ۶۶-۶۹

www.abulhasanalinadwi.org

والد صاحبؒ کی وفات اور برادر معظمؒ کے آغوش تربیت میں

۱۵؍ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۱ھ جمعہ کے دن والد ماجد نے معمولی علالت کے بعد رحلت فرمائی، اخیر وقت میں خدمت کی سعادت بھی حضرت کے حصہ میں آئی۔ تحریر فرماتے ہیں کہ ''میری خوش قسمتی کہ میں نے بغیر کسی ہدایت یا ان کے اشارے کے پیر دابنے شروع کئے۔'' (۱) اس میں بھی شاید کوئی حکمت تھی کہ والد صاحب نے وفات سے کچھ پہلے سنترے منگوائے اور فرمایا کہ علی کو دے دو، وفات کے وقت فرزند اکبر مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ ایک ہزار میل دور مدراس میں تھے۔ انھوں نے یہ خبر بمبئی میں سنی۔ جب لکھنؤ واپس ہوئے اور رائے بریلی پہنچے تو سیدھے قبر پر گئے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں بھی ساتھ ہولیا، قبر پر پہنچ کر پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ بس اسی دن سے غیر معمولی تبدیلی ان کے اندر پیدا ہوگئی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ

''اسی وقت سے ان کے اندر ہم سب لوگوں نے ایک انقلاب محسوس کیا، اب وہ نرے بڑے بھائی نہ تھے جو اپنی تعلیم میں ہمہ تن مشغول یکسو اور گھر کے قصوں سے فارغ ہوں، اب وہ ہم چھوٹے بھائی بہنوں کے شفیق باپ اور والدہ صاحبہ کے ایک سعادت مند فرزند بلکہ خادم تھے۔ میں نے ان سے صرف شفقت پدری کا اظہار ہوتے نہیں دیکھا بلکہ شفقت مادری کا بھی صاف صاف ظہور ہوتا تھا۔'' (۲)

تکیہ کا عبوری قیام اور والدہ صاحبہ کی تربیت

والد صاحب کی وفات کے بعد لکھنؤ قیام کا مسئلہ ہی نہ تھا۔ برادر اکبر ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ زیر تعلیم تھے، گھر میں کوئی جائیداد یا دوسرا ذریعہ آمدنی نہ تھا اسلئے عبوری طور پر تقریباً ڈیڑھ سال رائے بریلی ہی میں قیام رہا۔

فارسی کی ابتدا لکھنؤ میں مولوی محمود صاحب کے پاس ہوگئی تھی، ڈاکٹر صاحب کی

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۷۹

(۲) کاروان زندگی اول ص ۷۸، ۷۹

www.abulhasanalinadwi.org

ہدایت سے اس کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ سید محمد اسماعیل صاحب جو حضرت سید صاحبؒ کے نواسہ کے فرزند تھے، ان کو فارسی کا اچھا ملکہ تھا، ان سے اسی زمانہ میں ''بوستاں'' پڑھنی شروع کی۔ حساب سکھانے اور اردو عبارت نویسی کی مشق کے لئے ماسٹر محمد زماں صاحب کو متعین کیا گیا جو قریبی گاؤں لوہانی پور سے آتے تھے۔ حضرت کے چھوٹے ماموں مولوی حافظ عبید اللہ صاحب کو بڑی شفقت و محبت تھی، وہ بھی تعلیم کی فکر رکھتے لیکن اس زمانہ میں اصل تربیت والدہ صاحبہ نے فرمائی جن کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں :

''گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں۔ مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں، باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی، اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دل داری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں۔ لیکن دو باتوں میں وہ بہت سخت تھیں۔ ایک تو نماز کے بارے میں مطلق تساہلی نہیں برتتی تھیں، میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر پڑھے سو گیا، خواہ کیسی بھی گہری نیند ہو اٹھا کر نماز پڑھواتیں اور نماز پڑھے بغیر ہرگز نہ سونے دیتیں۔ اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بٹھا دیتیں۔ دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں ان کی غیر معمولی محبت و شفقت حارج نہ ہوتی، یہ تھی کہ اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی، ناانصافی کرتا، یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جوڑواتیں، اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اسکے بغیر نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہنچا اور ظلم، تکبر و غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے

www.abulhasanalinadwi.org

لگا، اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔"(۱)

والدہ صاحبہ کو حضرت کی بڑی فکر رہتی، وہی ان کے تنہا فرزند تھے، وہ چاہتی تھیں کہ ان کی ساری امیدیں حضرت ہی سے پوری ہوں۔ حضرت کو مخاطب کر کے ایک مکتوب میں لکھتی ہیں "اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو (۱۰۰) کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں۔" معمولی شکایت سے بھی ان کے دل کو ٹھیس لگتی، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ظاہری تربیت کے ساتھ ساتھ دعاؤں کا انھوں نے غیر معمولی اہتمام کیا اور دل کھول کر حضرت کی علمی و دینی ترقیات، بلند اقبالی، مقبولیت و محبوبیت اور مقام تجدید و امامت کے حصول کے لئے دعائیں مانگنے کو اپنا وظیفہ اور ورد بنا لیا۔

دعاؤں میں یہ اضطراب، گریہ وزاری اور پھر وہ یقین جس کے ساتھ وہ دعا کرتی تھیں، خاندان میں ضرب المثل تھا۔ روزانہ گھنٹوں دعا میں صرف ہوتے، بعض بعض مرتبہ اس قدر روتیں کہ دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا، اس میں ان کے والد بزرگوار حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی نسبت و توجہ کو بھی دخل تھا جو اپنے وقت کے عارف کامل تھے، یقیناً یہ نسبت حضرت کی طرف بھی منتقل ہوئی اور حضرت کی زندگی میں زہد و قناعت، دنیا سے بے رغبتی، خوف آخرت اور معرفت الٰہی کی جو درخشانی ہے اس میں حضرت شاہ صاحب کا بھی موروثی اثر ہے جو والدہ صاحبہ کی وساطت سے منتقل ہوا۔

یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اسی فکر و پریشانی کے زمانہ میں انھوں نے حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کو خواب میں دیکھا کہ وہ اس پرانے خواب کو یاد دلا رہے ہیں، جس میں انھوں نے "**فلا تعلم نفسٌ ما أُخفِي لهم من قرةِ أعيُن**" کی بشارت سنی تھی اور فرما رہے ہیں کہ تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟!

لکھنؤ میں نواب نور الحسن خاں صاحب کی کوٹھی پر قیام

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کے انتقال کے بعد نواب نور الحسن خاں

---

(۱) ذکر خیر ص ۴۷-۴۸ باختصار

www.abulhasanalinadwi.org

صاحب کی بیگم صاحبہ اوران کے صاحبزادگان نواب سید ظہور الحسن صاحب وسید نجم الحسن صاحب نے اپنی کوٹھی پر قیام کی پیشکش کی تھی۔لکھنؤ کا مکان جو شروع سے کرایہ پر تھا چھوڑ دیا گیا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے ان کی اس مخلصانہ ومحبانہ پیش کش کو قبول کیا تھا لیکن حالات ایسے نہ تھے کہ پورا گھر وہاں قیام کر سکے اس لئے ڈیڑھ سال تک ڈاکٹر صاحب تنہا وہاں مقیم رہے پھر جب وہاں قیام میں اطمینان حاصل ہوا تو انھوں نے سب سے پہلے حضرت کو رائے بریلی سے وہاں بلوالیا تا کہ اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم کا نظم کر سکیں، یہاں آ کر ''بوستاں'' پڑھنے کا سلسلہ چچا عبدالرحمٰن صاحب سے جاری ہو گیا جن کی اسی احاطہ میں کوٹھی تھی۔تقریباً سال بھر فارسی ہی کی تعلیم جاری رہی اور اس کا اختتام مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کی کتاب ''اصول فارسی'' پر ہوا، جو ڈاکٹر صاحب کی پسندیدہ کتاب تھی۔

نواب نور الحسن خاں صاحب مرحوم کا حضرت کے والد ماجد سے بڑا ہی گہرا تعلق تھا جس میں عقیدت ومحبت کی یکجائی تھی اگر چہ نواب صاحب وفات پا چکے تھے لیکن بیگم صاحبہ نے اس تعلق کا پورا پاس رکھا اور دونوں بھائیوں سے اسی طرح محبت کا معاملہ کیا جیسے وہ اپنے صاحبزادوں سے کرتی تھیں۔

تقریباً دو سال حضرت کا اس کوٹھی میں قیام رہا۔حضرت فرماتے ہیں :

''اس کوٹھی میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ آنکھوں کے زنگار چھٹ گئے اور دولت وامارت سے کبھی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں، اسلئے کہ اس کا اعلیٰ سے اعلیٰ مظہر اس کوٹھی میں دیکھ لیا۔میرے سامنے ہی ایک مرتبہ بیگم صاحبہ بھوپال نواب سلطان جہاں یہاں آئیں اور ہم بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔نان پارہ کی رانی قمر زمانی بیگم اور دوسرے رئیس گھرانوں کی بیبیاں اور رؤساء آتے اور مہمان ہوتے۔سید ظہور الحسن صاحب کا حلقہ احباب وسیع تھا، وہ ٹینس کے ممتاز پلییئر تھے اور اس رشتہ سے مسلم اور غیر مسلم لکھنؤ کے بعض پروفیسر صاحبان، وکلاء اور شہر کے رؤساء آتے، کوٹھی کے صحن ہی میں ٹینس کورٹ تھا اور کوٹھی کے ایک

www.abulhasanalinadwi.org

حصہ میں بلیرڈ روم تھا اسلئے نئے تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال طبقہ کے لوگوں کو بھی خوب دیکھا۔ اودھ کی تہذیب، لکھنؤ کے آداب، ریاست کی امارت وشوکت اور نوابوں کے ٹھاٹھ سب سامنے آئے اور کوئی چیز اجنبی نہیں رہی۔"(۱)

www.abulhasanalinadwi.org

(۱) کاروان زندگی اول ۸۶-۸۷

چوتھا باب

عربی تعلیم، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دیوبند ولاہور کا قیام، حضرت خلیفہ صاحب سے بیعت اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں تعلیم سلوک

عربی تعلیم کی ابتدا اور شیخ خلیل عربؒ کی خدمت میں

ہندوستان میں عربی زبان کی تعلیم کا صرف یہی مقصد گردانا جاتا تھا کہ اس سے حدیث وفقہ اور علم کلام کی ضروری کتابیں سمجھ لی جائیں، اسکو گہرائی کے ساتھ پڑھنے اور مہارت پیدا کرنے کا اسوقت کوئی تصور نہیں تھا، اس کی جگہ فارسی ہی پر ساری محنتیں صرف کی جاتی تھیں اور عمومی طور پر شریف گھرانوں میں اسی پر سارا زور دیا جاتا تھا۔ حضرت کے خاندان میں بھی فارسی کا بڑا رواج تھا، جد امجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ فارسی کے ادیب وشاعر تھے، والد صاحبؒ کو بھی اس کا اچھا ذوق تھا، برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی خود بھی فارسی میں مہارت رکھتے تھے اور بے تکلف گفتگو کر لیتے تھے، لیکن ان کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اب ہندوستان میں فارسی کا ورق الٹ رہا ہے اور قریبی زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اس کی اہمیت بالکل ختم ہو جائے گی، اور صرف اسی حد تک اس کی افادیت محدود ہو کر رہ جائے گی کہ بزرگوں کے ملفوظات ومکاتیب یا شعراء کے دواوین سے استفادہ ممکن ہو سکے۔ حضرتؒ کی فارسی تعلیم اس حد کو پہونچ رہی تھی، اس لئے ڈاکٹر صاحبؒ نے فارسی کو وہیں روک دیا، اور

www.abulhasanalinadwi.org

ایک طرف انگریزی کی ایک ریڈر شروع کرائی، اور دوسری طرف انھوں نے عربی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ کی اور اس کا ایسا حکیمانہ انتظام کیا جس کو توفیق الٰہی کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ قرین قیاس تھا کہ وہ حضرتؒ کو دارالعلوم میں داخل کر دیتے جسکے وہ خود اہم ذمہ داروں میں سے تھے، اور بعد میں اسکے ناظم بنائے گئے لیکن یہ خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے ایک غیبی انتظام تھا، اور حضرتؒ کو عالمی سطح پر جو اصلاحی و تجدیدی خدمات انجام دینی تھی اور جس طرح سے عربوں کو خطاب کر کے انکو ان کے فرائض یاد دلانے تھے اس کی قدرت کی طرف سے ایک غیبی صورت تھی کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرتؒ کو شیخ خلیل بن محمد عرب یمانیؒ کے سپرد کیا جو اس وقت عربی کے کامیاب ترین استاد اور بقول حضرتؒ کے ''اسکا ذوق ہی نہیں بلکہ ذائقہ رکھتے تھے،'' ڈاکٹر صاحبؒ سے انکے دوستانہ تعلقات اور بے تکلفی تھی اور اسی محلّہ میں انکی بھی سکونت تھی جس میں ایک طویل عرصہ مولانا عبدالحیؒ نے گزارا تھا اور پھر جلد ہی ڈاکٹر صاحب بھی اسی محلّہ میں منتقل ہو گئے، عرب صاحبؒ کے درس میں حضرتؒ کے شریک صرف انکے حقیقی بھائی شیخ حسین عرب تھے، اسلئے عرب صاحبؒ کی توجہ اور قدرتِ تدریس کا بڑا حصہ حضرتؒ کو ملا جو عام طور پر بڑی جماعت کے طلباء کو میسر نہیں آتا، پھر حضرتؒ کے ذوق وشوق کو دیکھ کر عرب صاحبؒ نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔

حضرت کی عربی تعلیم پر خاندان کے بعض بزرگوں نے ڈاکٹر صاحبؒ پر نکتہ چینی بھی کی اور یہ مطالبہ کیا کہ انکو آئی سی ایس (I.C.S.) کے لئے تیار کرنا چاہئے، اور عصری تعلیم دلانی چاہئے، ڈاکٹر صاحب نے جو بڑے کم گو اور متین واقع ہوئے تھے برجستہ کہا کہ ہم علی کو وہی تعلیم دے رہے ہیں جو میاں (ا) ان کو دیتے، یہ ایسا دوٹوک جواب تھا کہ لوگوں کی زبانیں بند ہو گئیں، پھر زمانہ نے دیکھ لیا کہ یہ فیصلہ کیسا حکیمانہ اور دور اندیشی پر مبنی ثابت ہوا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعد میں جب حضرتؒ نے لاہور کا پہلا سفر کیا تو پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحبؒ نے ایک دن اورنٹیل

(ا) ڈاکٹر صاحب والد صاحب کو میاں کہتے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع صاحب سے ملوایا، اوران سے رائے طلب کی کہ یہ بچہ کون سی لائن اختیار کرے، توانھوں نے اس وقت کے بعض مضامین اورتحریریں دیکھنے کے بعد کہا کہ یہ عربی کوہی اپنا مضمون بنائیں، اسی میں ترقی کریں اورکمال پیدا کریں۔

شیخ خلیل عربؒ کے درس کی خصوصیات اور حضرت سے انکا تعلق خاطر

موجودہ نظام تعلیم کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اس میں ایک ہی وقت میں مختلف مضامین شروع کرادئے جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک طالب علم کا ذہن پورے طور پر ان کوقبول کرنے سے عام طور پر قاصر رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو اس کثرت وانتشار سے محفوظ رکھا، اور حضرتؒ نے ایک وقت میں ایک ہی مضمون اورفن کی تعلیم پائی۔ اس میں بڑا دخل شیخ خلیل عربؒ کو تھا جنکا خود اپنا ''خانہ ساز'' نصاب تھا جس میں وہ اپنی پسند کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ ان کے اصولِ تعلیم میں ایک ضابطہ یہ بھی تھا کہ وہ دوزبانوں کی تعلیم بلکہ عام اوقات میں دوعلوم اورمضامین کی تعلیم کوبھی مخلوط نہیں کرتے تھے۔

شیخ کے خاندان کا حضرتؒ کے خاندان سے استاذی شاگردی کا تعلق کئی پشتوں کا تھا۔ شیخ کے دادا علامہ حسین بن محسن انصاریؒ حضرت کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کے باقاعدہ استاذِ حدیث رہ چکے تھے۔ شیخ کے والد شیخ محمد بن حسینؒ سے بھی مولانا عبدالحی صاحبؒ نے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے بھی شیخ حسین سے سند حدیث لی تھی، اورشیخ محمد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ ''میرا عرب صاحب پر، اورعرب صاحب کا مجھ پر تین پشتوں کا حق تھا، اوروہ اس بارے میں ایسے ہی حق شناس تھے جیسا کہ زمانہ قدیم کے علماء وشرفاء۔''

۱۹۲۴ء کے اواخر کا زمانہ تھا کہ حضرتؒ نے باقاعدہ شیخ سے عربی شروع کی، اور انھوں نے ایک کاپی پر فَعَلَ کی گردان لکھ کر یاد کرنے کو دی، پھر جلد ہی عربی زبان کی پہلی کتاب ''المطالعة العربية'' شروع کرادی، اس کے بعد انھوں نے ''مدارج

القراءة" کا دوسرا حصہ اور "الطريقة المبتكرة" کے تین حصے درساً درساً اور دو حصہ مطالعہ کے طور پر پڑھائے، حضرت اس درس کی خصوصیت بیان فرماتے ہیں :

"سبق سے ذرا بھی گرانی اور وحشت نہیں تھی، عرب صاحب کی پرلطف باتیں حوصلہ بڑھانے والی اور وحشت دور کرنے والی ظرافت، عملی مشق ان سب چیزوں نے اجنبی زبان کی وحشت اور درسی کتابوں کی ثقالت کو دور کر دیا تھا۔"(۱)

"الطريقة المبتكرة" کے بعد انھوں نے اپنی پسندیدہ کتاب "كليلة و دمنة" شروع کرائی، اس کے طریق درس کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں کہ

"ہم دونوں رفیقوں کو دن بھر اس پر محنت کرنی پڑتی تھی، پورا سبق تیار کر کے اس طرح ان کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا جیسے آموختہ سنایا جاتا ہے، عبارت کا صحیح پڑھنا، اس کے صرفی ونحوی وجوہ کا جاننا، سوالات کا جواب دینا، عبارت کے مفہوم کو پورے طور پر اخذ کر لینا یہ سب ہمارے ذمہ تھا، دراصل یہی کتاب اور اس کا یہ طریقہ تعلیم ہماری استعداد اور قوتِ مطالعہ کی کلید تھی جس سے تعلیم کے ہر ہر مرحلہ میں (جہاں تک زبان کا تعلق ہے) ہر قفل کھلتا چلا گیا، دراصل پورے نصاب میں (قدیم نصاب تعلیم میں) ایک ہی دو کتابیں ایسی ہوتی تھیں جو قوت مطالعہ پیدا کر دیتی تھی اور اخذ مطالعہ کے لئے کافی ہو جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں عرب صاحب نے ایک چھوٹے سے رسالہ جو میرے ہی ہمنام "ابوالحسن علی الضریر" کی نسبت سے "ضریری" کے نام سے مشہور ہے عربی کے کثیر الاستعمال اور عامۃ الورود قواعد کی مشق کرائی، ہم دونوں نے صرف ونحو کی مختلف کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک کی ساری کمائی اور عملی جمع خرچ اُسی چھوٹے سے رسالہ کا رہین منت ہے۔

"كليله و دمنه" ختم ہوئی تو عرب صاحب نے مصر کی عربی نصابِ درس کی ایک کتاب جو وہاں کے مدارس میں رائج تھی، اور جس کا نام

---

(۱) پرانے چراغ اول ص ۲۱۴

www.abulhasanalinadwi.org

"مجموعة من النظم و النثر للحفظ و التسميع" تھا، شروع کرائی، اسکا پہلا حصہ منظوم ہے دوسرا نثر، لیکن عرب صاحب نے اپنے خداداد ذوقِ سلیم کی بنا پر نثر سے ابتدا کی، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے طلباء کیلئے اس کتاب کا زبانی یاد کرنا، اور سنانا ضروری ہے۔ ہم جو پڑھتے اس کو اگلے دن سناتے، اس کے بغیر نیا سبق نہ ہوتا۔ سب جانتے ہیں کہ تقریباً سب زبانوں بالخصوص عربی کے لئے زبان کا ایک معتد بہ حصہ اور اساتذہ و مستند اہل زبان کا کلام زبانی یاد ہونا اور حافظہ کا کسی نہ کسی طرح جزء بن جانا نہایت مفید ہے، غالبًا اس طرح پورے حصہ نثر کو زبانی یاد کرنے کی نوبت تو نہ آئی، لیکن اسکا بہت سا حصہ زبانی یاد کر کے سنانا پڑا، وہ حصہ اگرچہ فراموش ہوگیا، لیکن حافظہ اور ذوق میں وہ اس طرح تحلیل ہوگیا تھا کہ اسکے اجزاء واثرات جزء بدن ہوگئے اور تحریر و انشاء میں اسکا رنگ نمایاں ہوا، عرب صاحب کے طریقہ تعلیم کی یہ خوبی تھی کہ وہ اچھے الفاظ، تعبیرات و محاورات کا اس طرح چٹخارہ لیتے، ان کی لذت و حلاوت کا اس طرح اظہار کرتے کہ وہ ہم لوگوں کے دل و دماغ پر مرتسم ہوجاتے اور ہم سمجھتے کہ ان الفاظ کا لطف لینا اور ان کی قدر ضروری ہے۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ ہم لوگوں کے ذہن پر یہ اثر قائم کرتے کہ یہ الفاظ و تعبیرات کسی کی ذاتی ملکیت نہیں اور نہ یہ سربمہر خزانہ ہے، یہ ہر اس شخص کی ملکیت ہے جو اسکو صحیح طریقہ پر استعمال کر سکے، بعض اوقات انھوں نے ہماری انشاء کی کاپیوں میں کسی محاورہ، ضرب المثل یا جملہ کے صحیح استعمال پر اس طرح اپنی مسرت کا اظہار کیا، جیسے ہم لوگوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، اور بعض اوقات اس پر انھوں نے انعام بھی عطا کیا۔"(۱)

ادب کی متوسط کتابوں کے ختم ہونے کے بعد انھوں نے قرآن مجید میں سے سورۂ زمر اور اس کے بعد کی چند سورتیں پڑھائیں۔ شیخ قرآن مجید کا بڑا پاکیزہ ذوق

(۱) پرانے چراغ اول ص ۲۱۵-۲۱۶

www.abulhasanalinadwi.org

رکھتے تھے، قرآن مجید پڑھتے تو قابو نہ رہتا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ ان کے اندر درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آواز بڑی درد انگیز اور لہجہ بڑا پر تاثیر تھا۔ فجر کی نماز میں وہ کوئی بڑی سورہ شروع فرماتے لیکن فرطِ تأثر اور شدت گریہ سے اسکو مکمل کرنے کی نوبت کم آتی۔ توحید کا بڑا غلبہ تھا، وہ بڑا کھرا اور صاف عقیدہ رکھتے تھے۔ سورۂ زمر جس میں توحید کی بڑی صاف اور طاقتور تعلیم ہے، ان کی محبوب اور منتخب سورہ تھی۔ حضرتؒ کی تعلیم قرآن کا آغاز انھوں نے اسی سورہ سے کیا۔ اس کے بعد سورہ مومن، سورہ شوریٰ پڑھائی۔ دوسری طرف صحیح مسلم میں سے انھوں نے ''کتاب المغازی'' پڑھانی شروع کی۔ ان دو سبقوں کے علاوہ زیادہ تر عربی ادب ہی کی کتابیں زیر درس رہیں لیکن تمام تر نثر۔ نظم نسبتاً کم اور ثانوی درجہ میں۔

عربی ادب کی ابتدائی اور متوسط کتابوں کے بعد قدیم معیاری کتابوں میں سے **نهج البلاغة، حماسه** اور معرّی کی **سقط الزند، مقامات حريری، دلائل الاعجاز** اور **عشر قصائد** جیسی کتابیں زیر درس رہیں، حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں :

''دلائل الاعجاز ان کی محبوب کتاب تھی اور وہ اس کے پڑھانے کا حق ادا کر دیتے تھے، جس شعر پر مصنف کو سرور آتا ان کو بھی وجد آتا اور وہ جھوم جھوم کر اسکو پڑھتے اور دیر تک اسکا مزہ لیتے رہتے۔ عربی قصائد پڑھتے تو سوقِ عکاظ کا نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا۔ وہ شعر پڑھتے وقت ہمہ تن تصویر بن جاتے اور انکے روئیں روئیں سے شعر اور نغمہ ابلتا ہوا نظر آتا۔'' (۱)

اس میں ان کے عربی ذوق اور ادبی ذائقہ کو دخل تھا۔ اس کے علاوہ وہ بڑے رقیق القلب اور لطیف الحس واقع ہوئے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کے اس امتیاز کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''ان کی اصل سند جس سے ہر جگہ انھوں نے عزت پائی اور اپنے اقران و اماثل میں ممتاز و صدر نشیں رہے، وہ زبان و ادب کا خداداد ذوق ان کی تعلیم کا

---

(۱) پرانے چراغ اول ص ۲۱۸ بالاختصار

www.abulhasanalinadwi.org

فطری ملکہ، تعلیم میں جاں گدازی اور دلسوزی کی وہ کیفیت ہے جو مدتِ دراز سے تعلیمی وتدریسی حلقوں سے مفقود اور تاریخ کے اوراق میں مدفون ہوکر رہ گئی ہے۔اپنے طلبا وشاگردوں سے پدرانہ بلکہ مادرانہ محبت وانس، اپنے ذوق ونظر کو طلباء تک منتقل کردینے اور انکے رگ و ریشہ میں اتار دینے کی عجیب وغریب قابلیت زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کر دینے اور مصنف کا ہم زبان وہم مذاق بنادینے کی وہ بے نظیر قدرت ہے جو ہزاروں میں سے کسی ایک استاذ و ماہر فن میں ہوتی ہے۔"(۱)

اپنے محبوب شاگرد سے ان کو جو تعلق خاطر اور قلبی محبت تھی اس کا کچھ اندازہ ان کے ان مکاتیب سے کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے حضرتؒ کو ارسال فرمائے ہیں۔ایک خط میں اس طرح خطاب فرماتے ہیں :

"میرے حقیقی بھائی اور اولاد سے زیادہ عزیز ومحبوب! تمہاری مشغولیات اور دعوتی سرگرمیوں کا علم ہوا، اور دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش کہ تم جیسے بہت سے علی ہوتے۔" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کا لفافہ پڑھ کر شادمانی کا وہ عالم تھا جس کی مثال زندگی میں نہیں ملتی۔"

مختارات جب چھپ کر آئی تو اس پر انھوں نے اپنے قلبی تاثرات تحریر کئے اور اپنے محبوب شاگرد کو دل کھول کر داد دی۔اخیر میں یہ جملہ بھی لکھا:

قلیل ما كتبت و فی القلب	میں نے کم لکھا دل میں تو بہت کچھ
کثیر ملأ القلب لک حبا	ہے تمہارے لئے سراپا محبت دل

حضرتؒ کو مخاطب کرکے انھوں نے عربی میں چند اشعار بھی کہے تھے جو انکی محبت اور تعلق کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

استاذ کی عظمت ومحبت کی نادر مثال

توفیق الٰہی کے عنوان سے حضرتؒ نے جو واقعہ تحریر فرمایا ہے وہ استاذ کے ادب و

(۱) پرانے چراغ حصہ اول ص۲۱۲

www.abulhasanalinadwi.org

احترام بلکہ عظمت ومحبت کی ایک نادر مثال ہے، وہ بے کم وکاست یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''عرب صاحبؒ سے پڑھنے کے زمانہ میں ایک امتحان پیش آیا، جو دیکھنے میں تو معمولی واقعہ تھا، لیکن میرے کم سے کم عربی تعلیم اور زبان وادب کے حصول میں کامیابی کے سلسلہ میں فیصلہ کن اثر رکھتا تھا؛ ہوا یہ کہ میرے انگریزی کے استاد خلیل الدین صاحب ہنسوی نے جن کا عرب صاحب بڑا لحاظ کرتے تھے، ان سے میرے ایک ایسے طرز عمل کی شکایت کی جس سے ان کو اپنی اہانت کا احساس ہوا تھا۔ یہ احساس محض غلط فہمی پر مبنی تھا کہ میں نے یہ کہنے کے بعد کہ آج فلاں عذر کی وجہ سے میرے لئے سبق پڑھنا مشکل ہے، دروازہ ذرا زور سے بند کیا۔ عرب صاحبؒ اس سے بہت متاثر ہوئے، اور انھوں نے بھائی صاحبؒ سے اجازت لی کہ آج وہ میری اچھی طرح تنبیہ کریں گے۔ ان کے مزاج میں میں قدرے حدّت بھی تھی۔ اس واقعہ نے ان کو مشتعل کردیا، انھوں نے مجھے اس پر اتنا زدوکوب کیا جو اس جرم اور واقعہ کی نوعیت سے بہت بڑھ گیا۔ بعد میں ان کو اس کا احساس ہوا کہ اس میں کچھ بے اعتدالی ہوگئی، جس کے لئے مجھ سے معذرت بھی کی، شدہ شدہ یہ خبر والدہ صاحبہؒ کو رائے بریلی پہونچی، انھوں نے مجھ سے دریافت کیا اور کہا کہ معلوم ہوا ہے کہ عرب صاحب نے تم کو بہت مارا؟ اللہ تعالیٰ نے اس وقت توفیق دی، اور میں نے عرب صاحب کی پوری وکالت اور انکی طرف سے مدافعت کی اور انکو اس تنبیہ وتادیب میں بالکل حق بجانب قرار دیا۔ والدہ صاحبہ مطمئن ہوگئیں اور میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس سعادتمندانہ رویہ نے جو محض توفیق الٰہی کا نتیجہ تھا، مستقبل میں میرے لئے عربی زبان وادب کا ذوق پیدا ہونے اور اس کے ذریعہ سے دین وعلم کی خدمت کرنے کا فیصلہ کرادیا۔ اگر صورتحال اسکے برعکس ہوتی اور میں اپنے کو بری اور مظلوم قرار دیتا اور اپنے محسن ومربی استاد کو حدود سے تجاوز کرنے والا۔ تو شاید معاملہ برعکس ہوتا اور میں ہمیشہ کے لئے ان

www.abulhasanalinadwi.org

کے فیض تعلیم اور عربی زبان و ادب میں کامیابی سے محروم کر دیا جاتا۔ ذلک من فضل ربی لیبلونی أأشکر أم أکفر"۔(۱)

بعض دوسرے اساتذہ سے استفادہ

شیخ خلیل عربؒ نے زبان و ادب کی تعلیم کے ساتھ نحو کی ایک مختصر کتاب "الضریری" حضرتؒ کو پڑھائی تھی۔ اس کے علاوہ نحو کی بعض قدیم نصابی کتابیں میزان، منشعب، صرف میر، نحو میر، پنج گنج چچا مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے پڑھائیں۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "وہ بڑی محنت اور نگرانی سے ان کتابوں کو پڑھاتے تھے، ان کے یہاں تسامح یا تساہل کا کوئی خانہ نہ تھا۔"(۲) زیادہ دنوں اگر رائے بریلی ٹھہرنا ہوتا تو عرب صاحب کے یہاں زیر درس عربی کتاب بھی انہیں کے یہاں ہوتی تھی۔

مولانا سید عزیز الرحمٰنؒ کے علاوہ صرف و نحو کی مشق مولانا سید طلحہ صاحبؒ نے بھی کرائی جن کو اس میں بڑی مہارت تھی اور وہ صرف و نحو کے استاذ ہی نہیں بلکہ امام تھے۔ حضرت فرماتے ہیں :

"صحیح عبارت پڑھنے اور صرف و نحو کے ضروری مسائل کے جزو دماغ بن جانے میں ان کا بڑا دخل ہے۔ وہ ادبی، نحوی، صرفی غلطی، عبارت کا غلط پڑھنا معاف نہیں کرتے تھے اور کئی کئی دن تک اس پر طنز فرماتے اور چٹکیاں لیتے رہتے، جسکی وجہ سے بڑا چوکنا اور ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ عربی زبان و صرف و نحو کے علاوہ ان سے اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے اور ذہنی تربیت ہوئی، تاریخی شعور پیدا ہوا، اور اس متنوع ثقافت میں سے کچھ حصہ ملا جس میں ان کو اپنے باکمال معاصرین میں بھی امتیاز حاصل تھا۔"(۳)

اسی زمانہ میں خواجہ عبد الحی صاحب فاروقیؒ سے استفادہ کی نوبت آئی جو مولانا

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۹۱-۹۲
(۲) کاروان زندگی اول ص ۹۰
(۳) کاروان زندگی اول ص ۱۰۱

www.abulhasanalinadwi.org

عبید اللہ سندھی کے تلمیذ رشید اور برادر اکبر ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کے رفیق درس تھے، انکی دعوت پر وہ لکھنؤ آئے تھے، اور ان ہی کے گھر میں ٹھہرے، ڈاکٹر صاحبؒ ہی کے کہنے پر انھوں نے پارہ عم کی آخری چند سورتیں پڑھائیں، اسکے علاوہ بھی انکی صحبت و مجلس بڑی معلومات افزا اور مفید تھی، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ میرا مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ کے طرز تفسیر و طرز فکر سے پہلا تعارف تھا جسکی وجہ سے میں نے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے درس میں اجنبیت محسوس نہیں کی۔'' (۱)

اردو زبان وادب کا ذوق

عربی تعلیم کے آغاز ہی میں حضرتؒ نے اردو زبان وادب کی تعلیم مکمل کرلی، اور اس کی معیاری کتابیں پڑھ لیں، اسکی تفصیل حضرت کی زبانی درج کی جاتی ہے :

''رائے بریلی کے قیام میں جو کبھی کبھی طویل ہو جاتا تھا، میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی 'الفاروق' آگئی، مطبع نامی کانپور کی چھپی ہوئی سراپا تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ عم محترم سید طلحہ صاحب کی صحبت اور مجلسوں میں ''آب حیات'' سے تعارف ہوا، سنی اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گئے جس طرح بچپن کی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔

''گل رعنا'' گھر کی کتاب تھی اس کو اتنے بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہو گئے کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمان جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر وشاعری کا بڑا شوق تھا، ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں

---

(۱) ایضاً ص ۱۰۰

www.abulhasanalinadwi.org

سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے، اور اردو میں تحریر و تقریر کے مقابلہ کرواتے، اس سلسلہ میں خاص طور پر مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتشؔ اور امیر مینائیؔ کے کام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔ شعر فہمی اور ذوق آفرینی میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابوالخیر برقؔ کا بھی حصہ ہے جو لکھنؤ کی زبان کے عاشق، محاورات اور الفاظ کی تذکیر و تانیث میں سند اور استاد کا درجہ رکھتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اچھے کہتے تھے۔

اس زمانہ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحبؒ کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرۂ کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر فنی کا ایک مرصع نمونہ ہے بہت اثر پڑا، بہت دنوں تک ''نیرنگ خیال'' اور ''آب حیات'' کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کئے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدے سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، مولانا شبلی مرحوم، مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں۔ میرے ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ صاحبؒ کے یہاں مولانا آزادؒ کے شہرۂ آفاق اخبار ''الہلال'' کے کئی سال کے فائل تھے، وہ بھی ذوق و شوق سے پڑھے، اور انکے زورِ قلم اور جوش بیان کا طبیعت نے پورا اثر قبول کیا، کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دی جائے بیکار اور بے اثر نہیں

www.abulhasanalinadwi.org

رہتی، اپنا اچھا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لئے اسکا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب ''یادِ ایام'' کا تھا، جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے، جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زبان کا بانکپن بھی موجود ہے، جو میرے علم میں مصنفِ ''گل رعنا'' اور مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانیؒ کی تحریر کا مشترک جوہر ہے، اس طرز پر میرا پہلا مضمون جو اب یاد آتا ہے اندلس پر تھا۔

اس زمانہ کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ میں نے شبلی بک ڈپو (جو لکھنؤ میں اس وقت لاٹوش روڈ پر مولوی کلیم احمد صاحب بہرائچی ندوی کا تجارتی مکتبہ تھا) کی فہرست میں سیرت کی ایک کتاب ''رحمۃ للعالمین مصنفہ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری'' کا نام پڑھا، پڑھتے ہی طبیعت میں ایسا انجذاب ہوا کہ میں نے اس کا آرڈر دے دیا، کتاب آئی تو اس وقت والدہ صاحبہ کے پاس وی پی چھڑانے کے لئے پیسے نہ تھے، انھوں نے مجبوری کا اظہار کیا، میں نے اس پر رونا شروع کر دیا، والدہ صاحبہ نے مجبور ہو کر کہیں سے اس کا انتظام کیا اور وی پی چھڑالی۔ میں نے اس کتاب کو بڑے ذوق وشوق اور عقیدت ومحویت کے ساتھ پڑھا، کم کتابوں نے دل ودماغ پر ایسا گہرا اثر ڈالا ہوگا، جتنا اس کتاب نے۔ مصنف کا اخلاص اور ان کی قوتِ ایمانی اور داعیانہ رنگ تھا اور سیرت کے واقعات کی سادگی اور اثر انگیزی کہ دل ودماغ میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا، اس کتاب کو اپنی محسن ومربی کتابوں میں سمجھتا ہوں۔''(۱)

اس زمانہ کے بعض اہم واقعات اور دلچسپیاں

نومبر ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر صاحب تعلیم سے فارغ ہوئے، اور جنوری ۱۹۲۶ء سے

(۱) کاروان زندگی اول ص ۹۴-۹۶

انھوں نے گوئن روڈ پر والد صاحبؒ کے قدیم مطب کے قریب ہی مطب کا آغاز کیا، اور قریب ہی بازار جھاؤلال کی اس گلی میں جسکے سرے پر لب سڑک قدیم مکان تھا جس میں والد صاحبؒ رہ چکے تھے اوراس میں ان کی وفات ہوئی تھی، ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا، اور کئی سال بھوپال ہاؤس میں رہنے کے بعد اس میں منتقل ہوگئے، یہ مکان عرب صاحب کے مکان کے بالکل بالمقابل اور متصل تھا، اس لئے حضرتؒ کو تعلیم کے لئے آنے جانے کی سہولت ہوگئی۔

بازار جھاؤلال کے اسی قیام میں حضرت کو ہاکی سے کچھ رغبت ہوئی اور کچھ دن دیکھنے اور کھیلنے کی بھی نوبت آئی، لیکن شعور بیدار ہو چکا تھا اس لئے جلد ہی اس کے مضر اثرات کا احساس ہونے لگا اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔ اس کے بارے میں حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں : ''مجھے خوب اندازہ ہے کہ ایسے شوق، تعلیمی انہماک اور ذہنی یکسوئی پر کتنے اثر انداز ہوتے ہیں۔'' (۱)

''اسی زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں کے اخبار ''زمیندار'' سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ''اس کے سنڈے ایڈیشن کا ہفتہ بھر انتظار رہتا، مولانا کی نظم جو صفحہ اول پر ہوتی تھی مزے لے لے کر پڑھتا، اور ان کی قادر الکلامی، خوش نوائی اور جوشِ کلام سے مسحور ہوتا۔'' (۲)

اسی زمانہ میں مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا آزادؒ کو دیکھنے اور سننے کی نوبت آئی کہ یہ دونوں اس زمانہ میں مختلف موقعوں پر لکھنؤ تشریف لاتے اور سیاسی اور قومی جلسوں کو خطاب کرتے۔

ندوۃ العلماء کا اجلاسِ کانپور اور اس میں شرکت

۶/۵/۷ رنومبر ۱۹۲۶ء کی تاریخوں میں ندوہ کا سالانہ جلسہ کانپور میں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب جن کو حضرت کی تعلیم وتربیت کی بڑی فکر رہتی تھی، اس خیال سے حضرتؒ کو

(۱) کاروان زندگی ص ۱۰۱ (۲) کاروان زندگی اول ص ۱۰۰

اپنے ساتھ لے گئے کہ وہاں اہم دینی و علمی شخصیات کی زیارت وملاقات ہوگی۔ تینوں دن حضرت کا شب و روز وہاں قیام رہا، سابق ناظم ندوۃ العلماء کے فرزند اور موجودہ نائب ناظم ڈاکٹر سید عبد العلی کے برادر خورد ہونے کے رشتہ سے اہل تعلق کا شفقت و محبت سے پیش آنا طبعی امر ہے لیکن اس نوعمری میں حضرت کے عربی میں گفتگو کرنے کے نتیجہ میں مشاہیر وعلماء کی خصوصی توجہ ہوئی۔ اس کا ذریعہ یہ ہوا کہ مدنی شاعر و ادیب شیخ سعد الدین برّادہ بھی اس جلسہ میں شریک تھے، ان کو کسی سے راستہ پوچھنے یا بات کرنے کی ضرورت پیش آتی تو حضرت ہی ترجمان بنتے، لوگوں میں مشہور ہوگیا، ۱۲/۱۳/سال کا لڑکا بے تکلف عربی بولتا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم، اور مولانا ابو عبداللہ محمد سورتیؒ نے اپنی قیام گاہ پر بلوا کر کچھ سوالات بھی کئے تھے۔

اس اجلاس میں جن مشاہیر وعلماء کی زیارت پہلی مرتبہ ہوئی، ان میں حکیم اجمل خاں صاحبؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ظفر علی خاںؒ، مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ، قاضی سلیمان صاحب منصور پوریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "رحمة للعالمين" (جو حضرت کی پسندیدہ سیرت کی کتاب ہے) کے مصنف قاضی سلیمان صاحب منصور پوری بھی اجلاس میں موجود تھے، انھوں نے ایک دن دورانِ گفتگو فرمایا کہ رحمۃ للعالمین میں نے تم کو بھی بھیجی۔ حضرتؒ تک کتاب تو نہ پہونچ سکی، اور حضرتؒ نے وہ کتاب خرید کر پڑھی، لیکن اس سے قاضی صاحبؒ کے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتؒ کی اس نوعمری میں انھوں نے کتاب بھیجنے کا اہتمام کیا، حضرتؒ کو بھی اس کتاب سے جو شغف تھا اس کا تذکرہ ابھی گزر چکا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ اور اسکی بعض حکمتیں

۱۹۲۷ء کو اگست کے مہینہ میں ڈاکٹر صاحبؒ نے غالباً عرب صاحب کے رجحان اور اصرار پر حضرتؒ کو لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل کردیا، خود ڈاکٹر صاحبؒ ان یونیورسٹیوں

www.abulhasanalinadwi.org

میں مشرقی امتحانات دینے کے طبعاً خلاف تھے، لیکن عرب صاحبؒ اس کی افادیت کے قائل تھے اور ایم اے، بی اے کلاسز کو عربی پڑھاتے تھے، یونیورسٹی میں داخلہ کے باوجود عرب صاحبؒ کے یہاں اسباق جاری رہے اور حضرت کو اصل فائدہ اسی سے پہونچا۔

یونیورسٹی میں دو مضامین سے حضرت کو مناسبت نہیں تھی۔ ایک فن عروض، دوسرے دقیق نحوی مسائل، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سالانہ امتحان میں اور مضامین میں امتیازی نمبرات کے باوجود ان دقیق نحوی مسائل کی وجہ سے ایک مضمون میں ناکامی ہوئی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ''شاید اس میں حکمت الٰہی تھی کہ مجھے ناکامی کا تجربہ کرنے اور اس کو برداشت کرنے کا موقعہ ملا اور دوبارہ محنت و جانفشانی کے لئے مجبور ہوا۔'' (۱)

اگلے سال اس کی پوری تلافی ہوگئی، وظیفہ بھی دیا گیا، اور گولڈ میڈل کا استحقاق بھی ہوا، لیکن کسی تعلقدار کے رقم جمع نہ کرنے کی وجہ سے وہ مل نہ سکا، حضرت تحریر فرماتے ہیں :

''غالباً اسکی قیمت سو روپئے سے زائد نہ ہوتی ہوگی، اس وقت اگر کوئی پیشین گوئی کرتا کہ تمہیں اسکے بجائے کسی زمانہ میں سب سے بڑی قابل احترام حکومت (سعودی عرب) کی طرف سے فیصل ایوارڈ کی شکل میں وہ بیش قیمت طلائی تمغہ ملے گا جس کی قیمت سے یونیورسٹی کے اس تمغہ کو کوئی نسبت نہیں تو کوئی باور نہ کرتا، لیکن **یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید**'' (۲)

لاہور کا تاریخی سفر

حضرتؒ کی امتیازی کامیابی کی خبر پھوپھی صاحبہ (اہلیہ مولانا سید طلحہ صاحبؒ) کو لاہور میں ملی، تو انھوں نے خوشی میں حضرتؒ کو لاہور بلوایا، والدہ صاحبہ اور بھائی صاحب سے اجازت کے بعد اواخر مئی یا اوائل جون ۱۹۲۹ء میں حضرتؒ کا پہلا باقاعدہ سفر ہوا، لاہور اس وقت برصغیر کا سب سے بڑا ثقافتی ادبی اور صحافتی مرکز تھا، مولانا طلحہ

(۱) کاروان زندگی حصہ اول ص ۱۰۴
(۲) کاروان زندگی اول ص ۱۰۴

www.abulhasanalinadwi.org

صاحبؒ نے حضرت کو ہر طبقہ کے اہل کمال سے ملایا، اس وقت حضرتؒ کی عمر سولہ سال کی تھی۔ اس سفر میں پہلی مرتبہ حفیظ جالندھریؒ کے ساتھ مجلس اور کھانے میں شرکت کی نوبت آئی اور انھوں نے حضرتؒ کی فرمائش پر اپنی بعض نظمیں سنائیں۔ علامہ اقبالؒ سے بھی پہلی ملاقات اسی سفر میں ہوئی اور حضرتؒ نے ان کی نظم ''چاند'' کا عربی ترجمہ ان کو دکھایا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ سفر میری زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔'' مزید فرماتے ہیں کہ میں نے اس سفر میں مولانا طلحہ صاحبؒ کی بدولت جو کچھ سیکھا اور دیکھا، اُس سے اپنی پوری زندگی میں فائدہ اٹھایا، ان کا احسان کبھی بھول نہیں سکتا، کہ وہی حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے تعارف وتعلق کا ذریعہ بنے اور ان کی شفقتوں وخصوصی توجہات کی سعادت حاصل ہوئی، جسکا میری زندگی پر بہت گہرا اور دیرپا نقش ہے۔''(۱)

اسی سفر میں مولوی شفیع سے ملاقات ہوئی اور استصوابِ رائے کا وہ واقعہ پیش آیا جس کا تذکرہ عربی تعلیم کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

انگریزی تعلیم کا انہماک اور والدہ صاحبہؒ کی پریشانی

حضرتؒ کی انگریزی تعلیم کی ابتدا تو عربی کے ساتھ ہی ہوگئی تھی اور لکھنؤ میں خلیل الدین صاحب ہنسویؒ سے یہ سلسلہ آہستہ آہستہ جاری تھا، رائے بریلی کے زمانہ قیام میں بڑے ماموں سید احمد سعید صاحبؒ اس سلسلہ کو جاری رکھتے تھے، جو روزمرہ کی زبان اور محاورات پر بڑے قادر تھے۔ پھر جب دارالعلوم میں قیام ہوا تو ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب سے حضرت نے استفادہ فرمایا اور بعد میں محمد الفاروقی صاحب (استاذ شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی) سے باقاعدہ انگریزی پڑھنے کی نوبت آئی۔

فاضل ادب میں نمایاں کامیابی کے بعد حضرتؒ کو میٹرک کر لینے کا خیال ہوا، یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزی تعلیم عروج پر تھی، خاندان میں اسی کا رواج ہو چلا تھا، اور چند ہی

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۰۸

www.abulhasanalinadwi.org

روز پہلے حافظ سید اسحاق حسنی صاحب کا آئی سی ایس (.I.C.S) کیلئے انتخاب ہوگیا تھا۔ خلیل عرب صاحبؒ بھی بڑی حد تک اس کی ضرورت وافادیت کے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ عربی داں نوجوان انگریزی میں مہارت پیدا کریں، اوراسکے ذریعہ دین کی خدمت اور تبلیغ کریں۔ حضرت فرماتے ہیں :

''یہی زمانہ تھا جب مجھ پر انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا اور اس کا بخار چڑھا، میں نے میٹرک کے کورس کی کتابیں خرید لیں، ریاضی محلّہ کے ایک استاد سے پڑھنی شروع کی، انگریزی محمد فاروقی صاحبؒ کے یہاں پڑھنے جاتا تھا، جب وہ لکھنؤ سے منتقل ہوگئے تو میں نے بطور خود مطالعہ کرنا شروع کیا، اور اپنے شوق سے انٹرمیڈیٹ کے معیار کی کتابیں (جواب شاید بی اے کے معیار کی ہونگی) ڈکشنری سے حل کرکے مطالعہ کرنے لگا ابھی امتحان میں بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والدہ صاحبہؒ کو (غالباً بھائی صاحبؒ کے ذریعہ) میرے اس انہماک کا علم ہوا۔ انھوں نے مجھے بڑے موثر اور دردمندانہ خط لکھے، جن کے کچھ نمونے میں نے انکے تذکرہ ''ذکر خیر'' میں چند تربیتی خطوط کے عنوان سے دیئے ہیں۔ صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

''علی ! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو جنھوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ عبد العزیز صاحبؒ، شاہ عبد القادر صاحبؒ مولوی محمد ابراہیم صاحبؒ، اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحبؒ اور مولوی محمد امین صاحبؒ، جن کی زندگی اور موت اس وقت قابل رشک ہوئی، کس شان وشوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے کیسے حاصل ہوسکتے ہیں، انگریزی مرتبہ والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں، اور ہوں گے، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں ....علی ! اگر میرے سو اولادیں ہوتیں تو میں

www.abulhasanalinadwi.org

یہی تعلیم دیتی اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین یارب العالمین۔

والدہ صاحبہؒ کی دعائے نیم شبی اور آہِ سحر گاہی کا اثر تھا کہ میرا دل اچانک انگریزی کی مزید تعلیم سے اچاٹ ہوگیا، اور میں نے کورس کی ساری کتابیں زبردستی لوگوں کے گلے لگائیں، مگر اس غیر معتدل اور بحرانی مصروفیت کا یہ اثر ہوا کہ اس تھوڑے سے وقت میں میں نے انگریزی کی ضروری استعداد پیدا کرلی، اور میں اپنے علمی و تصنیفی کاموں میں، اور بعد میں انگلستان اور امریکہ کے سفر میں اس سے کام لیا، اس کے بعد شاید انگریزی پر محنت کرنے کا موقع نہ ملتا، انگریزی کی اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ میں ان کتابوں کا آسانی سے مطالعہ کرسکا جو اسلامیات کے موضوع پر اور تاریخ پر لکھی گئی ہیں اور میں اس سے ابھی تک فائدہ اٹھا رہا ہوں۔'' (۱)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں

دارالعلوم سے حضرتؒ کا تعلق خاندانی اور موروثی تھا، والد ماجد اور برادرِ معظم اسی طرز فکر کے حامل بلکہ داعی تھے، حضرتؒ کی نشو ونما بھی اسی فکر میں ہوئی تھی لیکن باقاعدہ اور براہِ راست استفادہ کی نوبت اس وقت آئی جب حضرتؒ نے دارالعلوم کے قدیم و مقبول استاذ مولانا شبلی صاحب جیراجپوریؒ سے فقہ پڑھنی شروع کی، یہ غالباً ۱۹۲۸ء کے اواخر کی بات ہے، مولانا شبلیؒ حضرتؒ پر بڑے شفیق تھے اور ان کا حضرتؒ کے خاندان سے قدیم تعلق تھا، اس کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے دورانِ درس حضرتؒ سے فرمایا کہ ہمارے علاقہ میں شرک و بدعت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، پھر فرمایا جانتے ہو کیوں؟ حضرت نے عرض کیا آپ ہی فرمائیں،

---

(۱) کاروان زندگی ص ۱۲۱ تا ۱۲۳

www.abulhasanalinadwi.org

توفرمانے لگے یہ تمہارے بزرگوں حضرت خواجہ احمد صاحبؒ اور مولانا محمد امین صاحبؒ کا فیض ہے۔

حضرت مولانا حیدر حسن خان صاحبؒ کے درس حدیث میں

لاہور سے واپسی پر حضرتؒ باقاعدہ حضرت مولانا حیدر حسن خان صاحبؒ (شیخ الحدیث دارالعلوم) کے درس حدیث کے طالب علم بن گئے۔ یہ سلسلہ جولائی ۱۹۲۹ء سے شروع ہوا، حضرتؒ اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے مولانا سے دارالعلوم میں صحیحین (بخاری و مسلم) اور ابوداؤد، ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی، کچھ حصہ بیضاوی کا بھی علیحدہ سے پڑھا، اور کچھ سبق منطق کے بھی مولانا نے اپنے شوق سے پڑھائے۔ دوسال میں نے مولانا کے ساتھ ہی ان کے کمرے میں جو دارالحدیث میں تھا شب وروز قیام کیا، ٹونک کے قدیم خاندانی تعلقات، پھر والد صاحب سے خصوصی تعلق (کہ دونوں ہم استاد اور سہیل یمانیؒ امام حدیث شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی بھوپالیؒ کے عزیز شاگرد تھے اور والد صاحبؒ ہی کے طلب واصرار پر مولانا نے دارالعلوم کی خدمت تدریس قبول کی تھی۔) مجھ پر مربیانہ بلکہ پدرانہ شفقت رکھتے تھے، کھانے پینے میں بھی ساتھ تھا، حساب و کتاب بھی میرے پاس رہتا تھا، آنے جانے میں بھی معیت وہم رکابی حاصل رہتی تھی، تدریس حدیث کا طرز خالص محدثانہ ومحققانہ تھا، محدثین یمن کی خصوصیات کا حامل، اور شیخ حسین کے درس کا عکس۔ درس میں طالب علموں سے مراجعت وتحقیق، تلاش وجستجو کا پورا کام لیتے تھے ان کو محض سامع نہیں رہنے دیتے تھے، کتابوں میں سے حوالہ نکالنے، کتب رجال اور جرح وتعدیل میں مواد تلاش کرنے، اور مسئلہ لکھنے میں بھی شریک رکھتے، جس سے طلباء کی نظر وسیع اور تجربہ عملی ہوتا، وہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے، نماز میں رقت وخشیت کا غلبہ ہوتا، اور آخر شب میں طویل

www.abulhasanalinadwi.org

نوافل اور طویل سجود کا معمول جس میں گریہ غالب ہوتا، زندگی کی سادگی، شاگردوں اور ساتھیوں کے ساتھ مساوات اور ہر کام میں مشارکت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، جس میں افغانی نسل وخون کے علاوہ ٹونک کی معاشرت کو بھی بہت دخل تھا۔ میری حدیث کی تعلیم سر تا پا ان کی شفقت اور مہارت فن کی رہینِ منت ہے۔ مولاناؒ عام طور پر جن فضلاء کو حدیث کی سند عنایت فرماتے، اس کی کتابت اپنے کسی خوشخط شاگرد سے کرواتے اور دستخط فرما دیتے، میں نے بھی یہ خدمت انجام دی، لیکن مجھے سند عطا فرمانے کا ارادہ کیا تو باوجود نقل و کتابت سے عدم مناسبت کے اور اس کے کہ لکھنے میں بہت دیر لگتی تھی، مجھے سند اپنے قلم سے لکھ کر (جس میں غالباً پورا دن لگ گیا) عنایت فرمائی، جو شفقت خاص اور عنایت خاص کی دلیل تھی، **فالحمد للہ علیٰ ذلک**۔"(۱)

مولاناؒ کو حضرتؒ سے نہایت درجہ تعلق تھا، مولانا احمد علی صاحبؒ کے درس میں شرکت کے لئے جب حضرت لاہور جانے لگے تو مولانا فرط محبت میں فرمانے لگے "میاں تم جا رہے، میاں تم کو دیر تک دیکھتا رہونگا۔"

حضرتؒ کے اسی دور کے رفقاء میں مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا محبّ اللہ صاحب ندویؒ (سابق مہتمم دارالعلوم)، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی (سابق مہتمم دارالعلوم)، مولانا محمد اویس صاحب ندوی (شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء) ہیں، مولانا سید ابوبکر حسنی بھی اس درس میں شریک رہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرتؒ نے جب ترمذی شریف شروع کی تو ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرت کو وہ قدیم خاندانی نسخہ پڑھنے کے لئے دیا، جو مولانا سید قطب الہدیٰ محدث نے شاہ عبدالعزیزؒ کے یہاں نقل کیا تھا اور شاہ صاحب ممدوح کے درس کے کچھ مضامین بھی حاشیہ پر نقل کئے تھے، پھر حضرت کے والد مولانا حکیم سید عبد الحی صاحبؒ نے بھی علامہ حسین عربؒ کے درس میں اسی نسخہ سے پڑھا۔ اور انھوں نے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۱۱-۱۱۲

بھی شیخ کے کچھ امالی حاشیہ پر تحریر کئے۔ حضرتؒ نے بھی جب مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ سے اس نسخہ میں پڑھا، تو کچھ افادات حاشیہ پر نقل فرمائے، لیکن بعد میں تواضع غالب ہونے پر حضرتؒ نے اس کو مندمل فرما دیا، کہیں ایک دو جگہ وہ افادات باقی رہ گئے ہیں جو حضرتؒ کے حسن ذوق کا ثبوت ہیں۔

ترمذی شریف کا یہ ایک نادر اور صحیح ترین نسخہ ہے، جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں خاندانی ذخیرہ مخطوطات میں محفوظ ہے، اور اس کے لئے باعث زینت ہے۔

علامہ تقی الدین ہلالیؒ سے زبان وادب کی تکمیل

ستمبر ۱۹۳۰ء کو عربی زبان و ادب کے محقق عالم علامہ تقی الدین ہلالیؒ(۱) کی دارالعلوم میں آمد ہوئی اور باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع ہوا، حضرتؒ نے ان سے بھرپور استفادہ کیا، باقاعدہ ''دیوانِ نابغہ'' ان سے پڑھا اور انکے افادات نوٹ کئے، اس کے علاوہ ''شرح شذور الذہب'' کے درس میں شرکت کی، ان کی تصنیف کردہ ایک ناتمام تفسیر بھی ان سے پڑھی، لیکن حضرتؒ کو اصل فائدہ ان کی مجلسوں اور علمی افادات سے ہوا، حضرتؒ پر وہ ڈاکٹر صاحبؒ اور عرب صاحبؒ کی وجہ سے بڑی شفقت فرماتے اور خصوصی توجہ دیتے، اسی توجہ کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے ایک بنارس، اعظم گڑھ، مئو کے سفر میں حضرت کو اپنا رفیق بنایا۔ اسی سفر میں مبارکپور بھی حاضری ہوئی اور صاحب ''تحفة الاحوذی'' مولانا عبدالرحمان صاحب مبارکپوریؒ نے حدیث کی سند اور اجازت مرحمت فرمائی۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی تعلیم وتربیت کے خاص انداز اور حضرتؒ کی مضمون نگاری

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحبؒ کو تعلیم وتربیت کا فطری اور خداداد ملکہ عطا فرمایا تھا،

(۱) علامہ موصوف عربی زبان کے ان گنے چنے اساتذہ اور فضلاء میں تھے جو سند کا درجہ رکھتے تھے، ان کے امتیاز کیلئے اتنی شہادت کافی ہے کہ جب علامہ رشید رضا اور علامہ امیر شکیب ارسلان کا نحو وعربیت کے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا، تو ہلالی صاحب کو حکم بناتے۔ (کاروان زندگی اول ص ۱۱۵-۱۱۶)

www.abulhasanalinadwi.org

شیخ خلیل عربؒ اور علامہ تقی الدین ہلالیؒ جیسے یگانہ روزگار اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ان کو یہ فکر رہتی تھی کہ حضرتؒ عربی مضمون نگاری اور انشاء میں مہارت حاصل کریں، اس سے پہلے ہندوستان میں اس کا کوئی تصور نہ تھا۔ عربی تعلیم محض قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی لیکن ڈاکٹر صاحبؒ اپنی فراست اور عالم اسلام سے گہری واقفیت کی بنا پر یہ محسوس کر رہے تھے کہ عربوں کو ان ہی کی زبان میں خطاب کرنے اور ان کا منصب یاد دلانے کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ حضرتؒ عالمی سطح پر داعیانہ ومجددانہ کردار ادا کرسکیں، اسی لئے انھوں نے ابتدا ہی سے اس کی کوشش کی، حضرت کی عمر تیرہ یا چودہ سال کی تھی کہ انہیں مکہ مکرمہ سے نکلنے والے عربی رسالہ ''اُم القریٰ'' کا ایک مضمون ترجمہ کے لئے دیا، اس میں باہر سے آنے والے حجاج کے لئے ہدایتیں تھیں، حضرتؒ نے اس کا ترجمہ کیا، جو اس وقت کے مشہور اخبار ''زمیندار'' میں ابوالحسن علی پسر مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے نام سے شائع ہوا۔

عربی مضمون نگاری اور انشاء کی پختگی کے لئے ڈاکٹر صاحبؒ نے خاص انداز اپنایا، اور عربی کا پہلا مضمون جو حضرت سید صاحبؒ کے تذکرہ پر مشتمل تھا، ڈاکٹر صاحبؒ کی رہنمائی میں لکھا گیا، اس کا ایک فائدہ عربی تحریر کی مشق کا ہوا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت سید صاحبؒ کی تحریک ودعوت سے واقفیت اور ان سے گہرا تعلق پیدا ہوا، اس کی تفصیل حضرتؒ بیان فرماتے ہیں :

''وہ چاہتے تھے کہ میرا حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اور ان کی سیرت ودعوت سے گہرا تعلق پیدا ہو کہ ہمارے اجداد انہیں کے سلسلہ کے حلقہ بگوش اور اس میں صاحب اجازت تھے، اور ہماری جدی شاخ کا ان سے بہت گہرا ربط تھا، اسی زمانہ میں رسالہ ''توحید'' میں جو مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی کی ادارت میں امرتسر سے نکلتا تھا، مولوی محی الدین صاحب قصوریؒ کا ایک سلسلہ مضامین ''ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم'' کے نام سے نکلا تھا،

www.abulhasanalinadwi.org

جس میں پہلی مرتبہ سید صاحبؒ کی حیات و دعوت کو سلیقہ اور نئے اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ یہ پرچہ عم محترم مولوی سید خلیل الدین صاحبؒ کے یہاں آتا تھا، بھائی صاحبؒ نے مجھے اس کے عربی ترجمہ کی ہدایت کی، اور مشورہ دیا کہ پہلے میں تاریخ وسیر کی مستند اور سلیس کتابیں دیکھ لوں، اور ان کی خاص خاص تعبیرات اور مطالب کے طریق ادا جس کی تاریخ اور سوانح میں ضرورت پڑتی ہے، نوٹ کرلوں۔ میں نے اس غرض کے لئے ابن الاثیر کی ''الکامل'' دیکھی، اور خاص خاص الفاظ و محاورے نوٹ کرتا گیا، اس کے بعد مجھے ترجمہ میں بڑی آسانی ہوئی۔

میں نے اس کا ترجمہ تیار کرلیا تھا کہ اسی زمانہ میں شیخ تقی الدین ہلالیؒ تشریف لے آئے، میں نے ان کو دکھایا انھوں نے برائے نام تصحیح کی، اور مجھ سے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارا یہ مقالہ علامہ رشید رضا کو ''المنار'' میں اشاعت کے لئے بھیج دوں، لیکن یاد رکھنا کہ ان کی نظر بڑی خوردہ گیر ہے، اور ان کے یہاں صحت کا معیار بہت بلند ہے۔ اچھے اچھے لکھنے والوں کی تحریروں میں وہ سقم نکالتے ہیں۔ میں نے بخوشی اس کو منظور کیا، اور انھوں نے اپنے ایک تعارفی خط کے ساتھ علامہ موصوف کو میرا مقالہ بھیج دیا، انھوں نے نہ صرف اسکو شائع کیا بلکہ لکھا کہ اگر صاحب مقالہ چاہیں تو میں اسکو الگ رسالہ کی شکل میں طبع کرسکتا ہوں

ع کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

اس سے بڑھ کر ایک ہندی نوعمر طالب علم کا کیا اعزاز ہوسکتا تھا کہ اس کا رسالہ علامہ رشید رضا مصر سے شائع کریں، تھوڑے عرصہ میں ''**ترجمة الامام السید احمد بن عرفان الشہید**'' کے عنوان سے وہ رسالہ چھپ کر آ گیا، اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی، میری عمر اس وقت سولہ سال کی رہی ہوگی، یہ میری پہلی تصنیف ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر سے شائع ہوئی۔''(۱)

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۱۸-۱۱۹

www.abulhasanalinadwi.org

خاندان میں کئی پشتوں سے ایک قیمتی ذخیرہ کتب چلا آ رہا تھا، ڈاکٹر صاحبؒ کی بڑی خواہش اور تاکید تھی کہ حضرتؒ اس کی دیکھ بھال کرتے رہیں، تا کہ خاندانی تبرکات اور علمی مطبوعات ومخطوطات سے واقفیت حاصل ہو سکے، والدہ صاحبہؒ نے بھی ڈاکٹر صاحبؒ کے توجہ دلانے سے تاکید فرمائی، ان کتابوں کے رکھنے اٹھانے سے خاندانی ذوق اور اسلاف کی علمی ودینی خدمات سے شناسائی ہوئی اور چونکہ ان کتابوں میں تاریخ ہند، تراجم علماء، اور تذکرہ وسوانح کا بڑا ذخیرہ تھا، اس لئے ان کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی بہت نفع ہوا، اور ہندوستان کی اسلامی ودینی تاریخ سے ذوق وشغف پیدا ہوا۔ اسی ذخیرہ میں سب سے پہلے ''مکاتیب مجدد الف ثانی'' دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس سے حضرت نے بعد میں بڑا فائدہ اٹھایا۔

ڈاکٹر صاحبؒ حضرتؒ کی تربیت کے لئے نئے نئے طریقے اختیار فرماتے، فاضل ادب کے امتحان میں نمایاں کامیابی ہوئی تو ڈاکٹر صاحبؒ نے بیس روپیے دیئے کہ حضرتؒ اپنے اساتذہ ورفقاء کی دعوت کر دیں۔ پھر کچھ وقفہ دیکر فرمایا کہ اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں، لوگ ایک وقت کھانا کھالیں گے، اور ذائقہ مل جائیگا۔ اس رقم کو مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ میں بھیج دو کہ ثواب بھی اور حقیقی فائدہ حاصل ہو۔

یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ لکھنؤ کے محلّہ کے قریب ہی ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے، جو طبی سارٹیفکٹ دینے میں بہت فراخ دل اور غیر محتاط تھے۔ ایک دن ان پر تنقید ہو رہی تھی، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے بھی اس موضوع سے دلچسپی لی اور ان کے اس طرز عمل پر تنقید کرنے لگا۔ بھائی صاحب نے فوراً مجھے ٹوکا، اور کہا کہ تم بچپن میں ایک مرتبہ بہت سخت بیمار ہو گئے تھے، تو انھوں نے بڑی ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ تمہارا علاج کیا تھا، تم کو اس کا شکر گذار ہونا چاہئے اور ان کے حق میں کلمہ خیر کہنا چاہئے، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب نے اسی زمانہ میں حضرتؒ کو امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ، حضرت

---

(۱) ماخوذ از حیات عبدالحی ضمیمہ ص ۳۹۳

www.abulhasanalinadwi.org

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابیں پڑھنے کی تاکید کی، حضرتؒ فرماتے تھے کہ بھائی صاحب کے بار بار تاکید کے نتیجہ میں میں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا اور مجھے بڑا فائدہ پہونچا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے ذہن میں بڑی وسعت اور فکر میں عالمیت تھی، عالم اسلام کے حالات سے باخبر رہتے، اور اس کے لئے عربی اخبارات شوق سے منگواتے اور ان کا مطالعہ کرتے۔ حضرتؒ نے بھی ان سے فائدہ اٹھایا۔ ڈاکٹر صاحبؒ اس سلسلہ میں رہنمائی فرماتے، جدید تعبیرات واصطلاحات کی تشریح کرتے، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ''میں رفتہ رفتہ ان کو بے تکلف پڑھنے لگا اور مجھے اس سے انشاء وتحریر میں بڑی مدد ملی کہ اخبارات میں تنوع بھی ہوتا ہے اور تکرار بھی۔'' (۱)

اصلاح باطنی اور تعلق مع اللہ

اصلاح وترقی اور تعلق باللہ کا رنگ حضرت پر والدہ کی توجہ ودعا سے ابتدا ہی میں چڑھنے لگا تھا، اور شعور کی منزل کو پہونچتے پہونچتے اس کے اثرات نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگے، پھر خداداد ذہانت نے اس میں چار چار چاند لگا دیے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر تک اس میں مزید پختگی پیدا ہوئی۔ اس وقت کے حضرت کے رفقاء بیان کرتے ہیں کہ لغویات سے اجتناب اور لا یعنی باتوں سے تنفر پیدا ہو گیا تھا، مجلس میں اگر کوئی اس قسم کی بات شروع ہوتی تو حضرتؒ خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ جاتے۔ تلاوت سے بڑا شغف پیدا ہو گیا، دیر دیر تک مسجد میں ٹہل ٹہل کر تلاوت میں مشغول رہتے، فنائیت اور انکار ذات کا بھی غلبہ تھا۔ اسی زمانے میں علاقہ والوں کی اصلاح کی بھی فکر ہوئی، اور اسی مقصد کی خاطر عید کے دن عیدگاہ میں حضرتؒ نے تقریر فرمائی یہ حضرتؒ کی پہلی تقریر تھی مگر اس میں ایسی روانی اور اثر انگیزی تھی کہ سامعین کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ بعد میں حضرتؒ نے یادداشت سے وہ تقریر قلمبند فرمائی اور ''مسلمانوں پر ایک نظر اور قلب پر تین اثر'' کے عنوان سے وہ شائع ہوئی۔ خاندان کے بزرگوں کو

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۲۴

www.abulhasanalinadwi.org

حضرتؒ کے اس جذبہ کا احساس بھی تھا اور قدر بھی۔ ۱۹۳۰ء میں جب دائرہ شاہ علم اللہ کے قریبی گاؤں میدان پور میں مسجد کی بنیاد رکھنے کا مسئلہ سامنے آیا، تو اس وقت کے بزرگ خاندان سید خلیل الدین صاحبؒ نے حضرت سے اس کا سنگ بنیاد رکھوایا، جبکہ حضرت کی عمر اس وقت صرف سولہ سال کی تھی۔(۱)

۱۹۳۰ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس رنگ میں مزید پختگی پیدا کر دی، ہوا یہ کہ حضرت کے بڑے بھانجے سید محمود حسن صاحبؒ (برادر اکبر مولانا محمد ثانیؒ و مولانا محمد رابع و مولانا محمد واضح مدظلہما) کو مثانہ میں شدید تکلیف ہوئی، آپریشن کے لئے لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخل کیا گیا۔ حضرتؒ ہی ان کے تیماردار تھے، شب و روز اسپتال میں رہنا ہوا، حضرتؒ اس واقعہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''رات کو مریض کے پاس ہی رہنا ہوتا تھا، عزیز موصوف سب سے زیادہ مجھ سے مانوس تھا، اس لئے مجھی کو آواز دیتا، اور تکلیف کی شکایت کرتا۔ بعض اوقات رات کا بڑا حصہ جاگنے اور نرسوں کو بلانے میں گذر جاتا، اسپتال کا سارا ماحول، انسان کی کمزوری صحت کی بے وفائی اور زندگی کی بے ثباتی کا منظر اور قوی دلائل پیش کرتا تھا۔ اس سے طبیعت میں جو ابھی تک لکھنے پڑھنے اور ادبیات سے زیادہ مانوس تھی ایک تغیر پیدا ہوا جس کو انابت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس قیام نے جو ایک طرح کا مجاہدہ بھی تھا، ایک خانقاہی ماحول اور بزرگوں کی صحبت کا کام دیا۔ ان سب حالات نے دل و دماغ پر ایک گہرا اثر ڈالا اور اسپتال تیماردار کیلئے ایک چھوٹا سا دارالشفاء بن گیا۔''(۲)

یہی زمانہ تھا کہ والدہ صاحبہؒ کو آنکھ کے آپریشن کے لئے لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخل کرنا پڑا، ان کی خدمت اور تیمارداری کے لئے حضرتؒ نے وہ پوری مدت اسپتال میں گذاری۔ اسی زمانہ میں ''رحمۃ للعالمین'' حضرتؒ نے بڑے تاثر کے ساتھ پڑھی

(۱) یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نصف صدی سے زائد گذرنے کے بعد اسی مسجد کی تعمیر جدید کا سنگ بنیاد بھی حضرت ہی نے رکھا، اور مدرسہ ضیاء العلوم کی زیر نگرانی الحمد للہ یہ عالیشان مسجد تیار ہوئی۔

(۲) کاروان زندگی ص ۱۱۴-۱۱۵ اختصار و معمولی تغیر کے ساتھ۔

www.abulhasanalinadwi.org

اوردل ودماغ پراس کے نقوش ثبت ہو گئے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ

''اس کا خیال کیئے بغیر کہ کالج کے طلباء، پروفیسر اور مریضوں کے تیماردار کیا رائے قائم کریں گے اور کس نظر سے دیکھیں گے، رحمۃ للعالمین کھولے ہوئے سڑک پر ٹہل ٹہل کر وجد وتاثر کی کیفیت میں پڑھتا تھا، خاص طور پر وہ حصہ جس میں حضرت مصعب بن عمیرؓ اور ان کے پاک نہاد رفقاء کے تبلیغی شغف اور دعوتی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔''(۱)

قدیم مکان میں دوبارہ قیام اور حضرت مدنیؒ سے تعارف واستفادہ

وہ قدیم مکان جس میں حضرتؒ کا بچپن گزراتھا، اور وہیں والد صاحبؒ کی وفات ہوئی تھی، اہل خاندان کو اس سے ایک جذباتی تعلق تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا مطب جب اچھا چلنے لگا اور اتفاق سے وہ مکان خالی ہوا تو ڈاکٹر صاحبؒ نے اس کو کرایہ پر لے لیا، اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا اور حضرت مدنیؒ کو ڈاکٹر صاحب سے بہت جلد اتنا تعلق اور اعتماد پیدا ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کا گھر لکھنؤ میں ان کی مستقل فرودگاہ بن گیا۔ حضرتؒ اس زمانہ میں اپنے تعلق واستفادہ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں :

''۱۹۲۸ء میں لکھنؤ آل پارٹیز کانفرنس میں مولانا کی زیارت ہوئی تھی۔ اب اس قیام کی وجہ سے جس کی نوبت جلد جلد آتی تھی اور بعض مرتبہ کئی کئی دن قیام رہتا تھا، مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے اور گھر کا سب سے چھوٹا باشعور فرد ہونے کی وجہ سے خدمت کرنے موقع ملا۔ باطنی کمال اور رُوحانی مرتبے کا ادراک نہ اس وقت تھا، نہ اب ہے، لیکن اتنا یاد ہے کہ مولانا کے آنے سے گھر میں ایک خاص رونق وبرکت محسوس ہوتی تھی جس کو نورانیت سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ سادے کھانے میں بھی (جس کیلئے مولانا کی بڑی تاکید تھی

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۷۹

www.abulhasanalinadwi.org

اور اگر کوئی تکلف کی چیز پکتی تھی تو احتجاج فرماتے تھے) عجیب لذت وذائقہ محسوس ہوتا تھا۔ مولانا بھی مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے تھے۔ اور جیسا کہ ایک مرتبہ بھابھی صاحبہ والدہ عزیزی سید محمد حسنی مرحوم نے ذکر کیا۔ مولانا نے بھائی صاحب کو میرا خاص خیال رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ یہ پہلی دینی روحانی شخصیت تھی جس سے میں متعارف اور متاثر ہوا اور الحمدللہ بعد میں اس میں اضافہ ہی ہوا اور وہ عقیدت ومحبت ابھی تک قائم ہے۔ مجھے یاد ہے کہ یہ تاثر مولانا کی تقریروں یا دوسرے کمالات کی بنا پر نہیں تھا، جس کا اندازہ اس وقت میرے لئے مشکل تھا۔ ان کی شخصیت میں ایسی کشش معلوم ہوتی اور دل اس طرح کھنچتا کہ بے اختیار پاؤں پکڑ لینے اور ہاتھوں کو بوسہ دینے کو جی چاہتا۔ بعد میں جب کچھ عرصہ تک تلمذ اور صحبت کا شرف حاصل ہوا تو اس میں مزید اضافہ اور استحکام پیدا ہوا۔"(۱)

حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری سے تعلق، استفادہ واِسترشاد

لاہور کے پہلے سفر میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی زیارت وملاقات کا اجمالی ذکر آچکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اس کی تفصیل حضرتؒ کی زبانی نقل کردی جائے۔ فرماتے ہیں :

"یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ مولانا احمد علی صاحبؒ کے دیدار سے آنکھیں روشن نہ کرتا، جن کا ذکر خیر عرصہ سے سنتا تھا، اس پر اضافہ یہ ہوا کہ بھائی صاحبؒ نے میرے لاہور پہنچنے پر جو خط پھوپھا صاحب کو لکھا اس میں تاکید کی کہ مجھے مولانا احمد علی صاحبؒ سے ضرور ملایا جائے۔

مئی کی غالباً کوئی آخری تاریخ تھی کہ مولانا سید طلحہ صاحبؒ مجھے مولانا احمد علی صاحبؒ کے پاس لے گئے، میری عمر اس وقت ۱۵-۱۶ کے درمیان رہی

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۲۴

www.abulhasanalinadwi.org

ہوگی، میرے تعارف میں دو ہی باتیں کہی جاتی تھیں، والد صاحب کا نام اور ان سے نسبت فرزندی اور عربی زبان سے مناسبت اور اس میں بے تکلف لکھنے پڑھنے کی صلاحیت جو اس عمر اور زمانہ میں کچھ نئی ہی بات سمجھی جاتی تھی۔ مولانا نے جس شفقت وعنایت کا اظہار فرمایا اس کا مجھے اس وقت تک کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا اور وہ میری توقع اور حیثیت سے زیادہ تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی محبت وعقیدت کا بیج دل کی نرم زمین پر پڑا اور زمین نے اس کو قبول کرلیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ دوسرے یا تیسرے سال کی گرمیوں کی تعطیل میں لاہور پھر اس شوق میں گیا کہ مولانا کے درسِ قرآن میں شرکت کروں، لیکن معلوم ہوا کہ عربی مدارس کے طلباء اور فضلاء کا باقاعدہ درس جس کو مولانا کے رفقاء وخدام، علماء کلاس کے نام سے یاد کرتے ہیں، رمضان، شوال، ذیقعدہ میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن مولانا نے ازراہِ شفقت مجھے مستقل وقت دیا اور شروع سے قرآن شریف پڑھانا شروع کیا، اس درس میں صرف میں اور برادر سید احمد الحسنی جو پہلے سے لاہور میں تھے شریک تھے۔ اس درس کا سلسلہ زیادہ دن نہیں رہا، شاید سورہ بقر نصف ہوئی ہوگی کہ لکھنؤ میری واپسی ہوگئی۔ اس درس میں نیز صبح کے عمومی درس میں شرکت سے اور کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہ ہو دینی ذوق ضرور پیدا ہوا۔"(۱)

اگلے سال ۱۹۳۱ء کو حضرت نے پھر سفر کیا اور باقاعدہ "حجۃ اللہ البالغۃ" کے درس میں شرکت فرمائی۔ مولانا کے درس کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں :

"مولانا کے درس کے تین اہم بڑے مرکزی مضمون تھے؛ عقیدہ توحید کی وضاحت جو ہر قسم کے مشرکانہ اثرات ورسوم سے پاک تھی اور جس میں ان کا طرز مولانا اسماعیل شہیدؒ سے بہت ملتا جلتا تھا۔ یہ چونکہ خود اپنے خاندانی مسلک کی ترجمانی اور تائید تھی اس لئے دل نے اس کا خوب ذائقہ لیا اور دماغ نے اس کو پورے طور پر قبول کیا۔ دوسرا مرکزی مضمون اہل اللہ کے موثر اور دل آویز

(۱) پرانے چراغ اوّل تذکرہ مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ۔ ص ۱۴۰-۱۴۱

www.abulhasanalinadwi.org

واقعات بالخصوص جب وہ اپنے سلسلہ کے مشائخ کا دلنشیں ودلپذیر تذکرہ کرتے تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ان کے دل کا ساز چھیڑ دیا ہے، قدرۃً اس کا اثر سننے والوں پر پڑتا تھا اور بجلی کے کرنٹ کی طرح جسم وجان میں دوڑ جاتا تھا۔ تیسرا مرکزی مضمون جذبہ جہاد، بغض فی اللہ کا ہوتا تھا۔''(۱)

خود مولانا کے حال کے بارے میں فرماتے ہیں :

''اسی کے ساتھ زیادہ قیام اور قرب کی وجہ سے مولانا کی زاہدانہ اور مجاہدانہ زندگی ہمارے سامنے آئی جس کی نظیر کم سے کم میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

مولانا کے گھریلو حالات اور ان کے زہد وتقشّف، ورع واحتیاط اور قناعت واستغنا کے واقعات ان کے معتمد خاص رفیق زندگی اور انجمن خدام الدین کے سکریٹری خلیفہ شہاب الدین صاحبؒ سے سننے میں آتے تھے جو مجھ پر خصوصی کرم فرمانے لگے تھے۔ خلیفہ صاحب نے غالباً مولانا ہی کے ساتھ ہجرت کی تھی اور کابل وبخارا پھر وہاں سے ترکی گئے تھے، وہ مولانا کے محرمِ راز اور خلوت وجلوت کے آشنا تھے، ان ذرائع سے مولانا کی زندگی کے جو حالات، ان کے زہد، ورع، روشن ضمیری، قوتِ ادراک اور باطنی کمالات کا جو اندازہ ہوا اس سے مولانا سے اصلاح وتربیت کے مستقل تعلق کا داعیہ پیدا ہوا اور میں نے ایک دن مولانا سے درخواست کردی۔ مولانا نے فرمایا ابھی میرے شیخ ومرشد حضرت خلیفہ غلام محمد صاحبؒ حیات ہیں میں آپ کو ایک تعارفی خط دے دیتا ہوں آپ دین پور چلے جائیں اور ان سے بیعت ہوجائیں، میرے لئے تعمیل ارشاد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، سخت گرمی کا زمانہ تھا اور غالباً جون کا مہینہ، دین پور ریاست بھاولپور میں خان پور سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے جو لاہور کراچی لائن کا ایک مشہور اسٹیشن ہے اور تقریباً سندھ کی سرحد پر واقع ہے، میں

(۱) پرانے چراغ، اوّل ۱۴۱ باختصار

www.abulhasanalinadwi.org

نے وہاں جانے کا عزم کرلیا۔''(۱)

حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوریؒ سے بیعت

''غرض ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء کے جون کی کوئی تاریخ تھی کہ میں کراچی میل سے خانپور کے لئے روانہ ہوا، ایک رفیق درس اور دوست مولوی محمد موسیٰ سندھی رفیق سفر تھے جو خود بڑے صاحب صلاح اور قوی الاستعداد نوجوان تھے۔ مغرب کو ہم لوگ خان پور پہونچے، وہاں سے دین پور کی طرف روانہ ہوئے۔ غالباً رات ہی کو حضرتؒ کی زیارت ہوگئی، ایسا منور چہرہ غالباً اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا، نہایت کم گو اور کم سخن بزرگ تھے، گفتگو بھی فرماتے تو ٹھیٹھ ریاستی زبان میں جو ملتانی وسندھی کا مجموعہ ہے، اور جس سے میں بالکل نا آشنا تھا۔ دین پور کی دنیا ہی نرالی تھی، وہ صحیح معنی میں دین پور تھا، قادری طریقہ پر ذکر جہر سے مسجد و خانقاہ اور بستی ہر وقت گونجتی رہتی تھی، اگر کوئی کسی کو آواز بھی دیتا تو پکارنے والا بھی اِلا اللہ کہتا اور جواب دینے والا بھی اِلا اللہ سے اسکا جواب دیتا، اس طرح اذان، ذکر جہر اور صدائے الا اللہ کے سوا کوئی اور بلند آواز سننے میں نہ آتی، یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں صرف حضرتؒ اور حضرتؒ کے متعلقین آباد تھے، نیم خام پختہ چند مکانات جن کی تعداد شاید ۵-۷ سے زیادہ نہ ہوگی، ایک سادہ سی مسجد، چند خام حجرے ذاکرین کے لئے، کچھ کھجوروں کے درخت جن کو دیکھ کر عرب کے بادیہ کی بستیاں یاد آتی ہیں، آب و ہوا بھی بادیہ عرب سے ملتی جلتی تھی، مقیمین خانقاہ کے لئے ایک لنگر تھا، جس میں خالص سندھی اور بہاولپوری مذاق کا ایسا کھانا تیار ہوتا تھا جو قوت لا یموت کا صحیح مصداق تھا، اور ہم اودھ کے نازک مزاج مہمانوں کے لئے اس کا کھانا بڑا مجاہدہ اور امتحان تھا، گرمی شدت کی تھی، دن بھر لو چلتی، رات کسی قدر ٹھنڈی ہوتی۔

---

(۱) پرانے چراغ، اول ص۱۴۶

www.abulhasanalinadwi.org

یہ تھا دین پور کا نقشہ جہاں عمر میں صرف دو مرتبہ جانا ہوا۔ ایک اسی ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں۔ دوسرے ۱۹۵۸ء یا اس کے بعد خلیفہ صاحبؒ کی وفات کے عرصہ کے بعد ایک شب کیلئے جانا ہوا۔ حضرت خلیفہ صاحبؒ (۱) کی عمر اس وقت بھی ۹۰ سال سے متجاوز تھی، مولانا احمد علی صاحب کا خط آپ کو سنایا گیا جس میں غالباً حضرت سید صاحبؒ کی نسبت سے میرا تعارف تھا۔ حضرت نے سلسلہ میں داخل فرمایا اور ذکر قلبی کی تلقین کی۔'' (۲)

حضرتؒ نے یہ واقعہ بھی بارہا سنایا کہ ''بیعت کے بعد مجھے کچھ خدمت کرنے کا شوق ہوا، اس وقت چھت کے ان پنکھوں کا رواج تھا جو ہاتھ سے کھینچے جاتے تھے۔ میں نے وہ کھینچنا شروع کیا، تھوڑی دیر میں احساس ہوا کہ یہ میرے بس سے باہر ہے مگر چونکہ اپنے شوق سے لیا تھا اسلئے نہ ہی وہ چھوڑتے بنتا اور نہ کھینچتے بنتا۔ حضرت خلیفہ صاحبؒ کو غالباً بطریق کشف احساس ہوگیا، انھوں نے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ پانی پلادو، میں پانی لیکر حاضر ہوا، حضرت خلیفہ صاحبؒ نے کچھ پانی پیا، بقیہ مجھے دیکر کہا کہ تم پی لو، میں نے وہ پی لیا، اسطرح میں ندامت سے بچ گیا۔''

حضرتؒ تین چار دن دین پور ٹھہر کر لکھنؤ تشریف لے آئے، اس کے بعد حضرت خلیفہ صاحبؒ کا وصال ہوگیا۔ اور حضرتؒ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کو ہی اپنا شیخ و مربی سمجھتے رہے، اور ان سے مراسلت کا سلسلہ بھی جاری رہا اور تعلق بھی بڑھتا گیا۔

دیوبند کا قیام

۱۹۳۲ء کے کسی قیام میں ایک دن ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرتؒ کو بطور خاص

(۱) حضرت خلیفہ صاحب سلسلہ قادریہ کے نامور مشائخ میں تھے، جمال کا غلبہ تھا، بڑے صاحب سکینت اور تمکین تھے، چہرہ مبارک گلاب کی طرح سرخ اور آفتاب کی طرح پرانوار تھا، معاصر مشائخ ان کے علوئے مرتبت اور قوت نسبت اور بزرگی کے قائل تھے۔ حضرت مدنیؒ کو بھی ان کی طرف سے اجازت تھی، حضرت تھانوی سے بھی بڑا ربط و تعلق تھا اور کسی سفر میں وہ کراچی سے واپسی پر خلیفہ صاحب کی زیارت و ملاقات کے لئے دین پور ٹھہرے تھے۔ حضرت رائپوری بھی بڑے احترام و عقیدت سے ان کا نام لیتے تھے۔

(۲) پرانے چراغ ص ۱۴۸ تا ۱۵۰

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت مدنیؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت مدنیؒ نے کچھ عرصہ کیلئے دیوبند قیام کا مشورہ دیا، اس کی تعمیل میں ربیع الاول یا ربیع الثانی کی کسی تاریخ کو حضرتؒ دیوبند تشریف لے گئے، حضرت مدنیؒ نے اپنا مہمان بنایا(۱)۔ حضرتؒ نے درس میں بھی شرکت فرمائی اوراس کے علاوہ بھی حضرت مدنی سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہا، خاص طور سے قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کو سمجھنے کے لئے حضرتؒ نے مولانا مدنیؒ سے خصوصی وقت چاہا، مولانا نے جمعہ کا وقت دیا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس سے مولانا کے تدبر قرآن کا اندازہ ہوا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کو جب حضرتؒ کے باقاعدہ قیام کا علم ہوا، تو انھوں نے حضرتؒ سے دارالاقامہ میں رہنے اور مطبخ سے کھانا جاری کرا لینے کی ہدایت کی۔ حضرتؒ نے اجازت چاہی تو حضرت مدنیؒ نے کسی قدر ناگواری اور مجبوری کے ساتھ اجازت دی، لیکن فرمایا ناشتہ ساتھ ہوا کریگا۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے فرزند مولانا حبیب اللہ صاحبؒ بھی اس زمانہ میں دیوبند میں طالب علم تھے، مولانا سے تعلق کی وجہ سے ان سے بھی خاص ربط رہا۔

حضرتؒ نے اسی زمانہ میں مولانا اعزاز علی صاحبؒ (شیخ الادب دارالعلوم دیوبند) کے درس ''شرح نقایہ'' میں بھی شرکت فرمائی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ

''مجھے اس درس سے بہت فائدہ ہوا، مولانا اس وقت سے مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے تھے اور یہ شفقت اخیر تک قائم رہی، جب میری کتاب مختارات چھپ کران کے پاس پہونچی، تو بعض حاضرین مجلس سے بلند الفاظ میں اسکا تعارف اور تعریف فرمائی۔''(۲)

---

(۱) یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب دیوبند میں حضرت مدنی سے ملاقات ہوئی تو حضرت مدنیؒ نے حضرت کو بیعت کرنے کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر پھر خود ہی فرمانے لگے ''آپ کسی سے بیعت تو نہیں ہیں؟'' حضرت نے فرمایا کہ ''حضرت خلیفہ سے بیعت کی ہے'' اس پر فرمایا کہ ''مجھے ان سے اجازت حاصل ہے۔''

(۲) کاروانِ زندگی اول ص ۱۳۱

www.abulhasanalinadwi.org

اسی زمانہ قیام میں ایک مرتبہ مولانا انور شاہ صاحبؒ ڈابھیل سے تشریف لائے، ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کی زیارت و ملاقات اور سلام پہونچانے کی ہدایت کی تھی۔ حضرت نے سلام پہونچایا تو انھوں نے پہچان لیا، اور خیریت وحالات دریافت کئے۔ دو تین مرتبہ حضرت ان کی عصر کی مجلس میں شریک ہوئے۔ اسی زمانۂ قیام میں حضرت نے قاری اصغر علی صاحب سے قرأت حفص بھی پڑھی۔ حضرتؒ دیوبند کے اس قیام کے بارے میں فرماتے ہیں :

''دارالعلوم کے اس چار ماہ کے قیام میں میری دلبستگی کا سامان اور میرے اُنس وعقیدت کا مرکز مولانا مدنیؒ کی ذات تھی اور اصل مناسبت انہیں سے تھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ صبح کبھی اپنے خاص لہجہ میں مجھ سے مخاطب ہوتے اور فرماتے : ''کہئے مولوی علی میاں صاحب! آج اخبار میں آپ نے کیا پڑھا؟'' تو مجھے دن بھر اس کا مزہ آتا رہتا اور دل مسرت سے معمور بلکہ مخمور رہتا۔ بقول شاعر ؎

بہر تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش تیرے ابرو میں تھی (۱)

دارالعلوم میں امتحانات کی تیاری شروع ہوئی اور کتابیں ختم ہوئیں تو حضرتؒ شعبان ہی میں لکھنؤ واپس ہوئے۔

لاہور کا سفر اور حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے درس کی تکمیل

حضرتؒ نے دیوبند ہی کے قیام میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے درس میں شرکت اور اسکی تکمیل کا ارادہ فرمالیا تھا۔ دیوبند سے واپس ہوتے ہی چند روز قیام کے بعد حضرت لاہور روانہ ہوگئے۔ وہاں قیام کی تفصیل حضرت ہی کے الفاظ میں نقل کی جاتی ہے :

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۳۰

www.abulhasanalinadwi.org

"۱۳۵۱ھ کے شعبان کے آخر یا رمضان کے اوائل میں (۱۹۳۲ء کے غالباً دسمبر میں) میں نے لاہور کے لئے رخت سفر باندھا، اور مدرسہ قاسم العلوم کا باقاعدہ طالب علم بن گیا۔ اس درس میں جس میں پورا قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا، صرف مدارس عربیہ کے فارغین یا منتہی طلبہ شریک ہوتے تھے، یہ "علماء کلاس" کہلاتی تھی، آخر شعبان سے شروع ہوکر وسط ذیقعدہ تک اس کا سلسلہ جاری رہتا۔ میں جب پہونچا ہوں تو اس درجہ میں پچاس کے قریب طلبہ تھے، جن میں اکثریت دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی تھی۔ انہیں میں ہمارے درس حدیث کے ساتھی مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاریؒ بھی تھے۔ یہ درس بڑی محنت اور قوی حافظہ کا طالب تھا کہ ہر رکوع کا خلاصہ اور اسکا مآخذ تیار کرنا پڑتا تھا، اور نیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا امتحان ہوتا تھا، اور جس کی جس رکوع کی باری آجائے اس کو اس کا خلاصہ مولانا سندھی کے مقرر کئے ہوئے لفظوں میں اور اس کا قرآنی مآخذ سنانا پڑتا تھا۔ میرا حافظہ خاندانی طور پر کمزور ہے، اس لئے مجھے بڑی محنت پڑی، پھر لاہور کی سردی اور میری جسمانی کمزوری، اور ہوسٹل کے بجائے گھر کے کھانے اور زندگی کی عادت۔ لاہور کا قیام اچھا خاصا مجاہدہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی۔ اوائل ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ اور شروع مارچ ۱۹۳۳ء میں امتحان ہوا، مولانا کی دعوت پر خواجہ عبدالحی صاحب فاروقیؒ دہلی سے کاپیاں جانچنے کے لئے آئے۔ تقدیری بات کہ انھوں نے مجھے سب سے زیادہ نمبر دئے، جو غالباً ۷۰ یا اس سے کچھ اوپر تھے، رفقاء نے جو سب مدارس کے فضلاء تھے ایک احتجاجی جلسہ کیا جس میں ممتحن صاحب پر نمبر دینے میں ناانصافی اور جنبہ داری کا الزام لگایا، اس پر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ نے خود کاپیوں کے دیکھنے کا اعلان کیا۔ قسمت کی بات کہ جب انھوں نے کاپیاں دیکھیں تو سب شرکائے امتحان کے نمبروں میں تھوڑا تھوڑا اضافہ کیا، اور میرے نمبر بڑھا کر ۹۸ کر دیئے۔ ۱۵/ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ ۱۲/مارچ ۱۹۳۳ء کو

www.abulhasanalinadwi.org

مدرسہ قاسم العلوم میں جو ہم لوگوں کی قیام گاہ تھی اور جو انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور کے زیرنگرانی وسرپرستی تھا، تقسیم اسناد کا جلسہ منعقد ہوا، مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ مولانا کی خاص دعوت پر تشریف لائے، اور اپنے دست مبارک سے وہ سند عطا فرمائی جس کا عربی مضمون علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ آخر میں خود ان کے مولانا مدنیؒ کے اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ امیر انجمن خدام الدین لاہور کے مبارک دستخط ہیں۔"(۱)

یہاں یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت مدنیؒ جب حضرتؒ کو سند دینے لگے اور انھوں نے نمبرات ملاحظہ فرمائے تو اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے "دو نمبر کم کیوں رہ گئے؟"

لاہور کا دوبارہ سفر اور شاہی مسجد میں قیام

۱۹۳۴ء کو غالباً اپریل کے مہینہ میں حضرتؒ نے دوبارہ لاہور کا سفر کیا، یہ سفر حضرت لاہوریؒ کی ہدایت وایماء پر انکی صحبت وتربیت میں رہنے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر وشغل کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ حضرتؒ نے حضرت لاہوریؒ کے ایماء پر ان کے شیخ سے تعلق بیعت تو دوسرے سفر میں ہی قائم فرما لیا تھا اور حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کی توجہ وتربیت کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن باقاعدہ اس کے لئے کچھ عرصہ قیام اور یکسوئی کی نوبت نہیں آسکی تھی۔

لاہور میں پھوپھی صاحبہ موجود تھیں، جو بڑی شفقت فرمانے والی تھیں، لیکن حضرت لاہوریؒ کی ہدایت کے مطابق حضرتؒ نے شاہی مسجد کے ایک حجرہ میں قیام فرمایا، حضرت لاہوریؒ کی یہ بھی ہدایت تھی کہ سوائے ذکر وشغل نوافل اور تلاوتِ قرآن کے دوسرا کوئی مشغلہ نہ رہے۔ تقریباً تین ماہ حضرتؒ نے اسی طرح گزارے، دن بھر

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۳۲-۱۳۳

www.abulhasanalinadwi.org

میں صرف ایک سبق حاجی عبدالواحد صاحبؒ کو پڑھانا ہوتا تھا، جو حضرت لاہوریؒ سے ہی بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے، اس کے سوا سارا وقت ذکر و تلاوت اور نوافل میں گزرتا، یہ پورا وقت بڑی ریاضت و مجاہدہ میں گزرا۔ لق دق مسجد، رات کو ایک دو آدمی آگئے تو آگئے۔ اسی زمانہ کا حضرتؒ یہ واقعہ بھی بیان فرماتے تھے کہ "ایک مرتبہ کوئی مغلوب العقل شخص اندر آگیا میں جب رات کو اٹھا تو وہ مجھ پر حملہ آور ہوا اور میرا ہاتھ اس زور سے پکڑا کہ معلوم ہوتا تھا کہ توڑ دے گا۔ میں بہت گھبرایا کوئی دوسرا ایسا نہیں تھا جو چھڑا سکے۔ اللہ کا فضل ہوا کہ خود ہی اس نے ہاتھ چھوڑ دیا اور میں اس سے محفوظ رہا۔"

حضرتؒ اسی زمانہ کا یہ عبرت آموز واقعہ بھی بیان فرماتے تھے کہ "ایک مرتبہ میں رات کو کسی ضرورت سے باہر نکلا تو دیکھا کہ دروازہ پر ایک مضبوط و توانا شخص گھوڑے پر سوار ہے، مجھے دیکھ کر کہنے لگا کہ مولوی جی مولوی جی! یہ بتاؤ کہ کہیں جہاد ہو رہا ہے؟ اس وقت میرے علم میں کہیں باقاعدہ جہاد کی کوئی مہم نہیں چل رہی تھی۔ میں نے کہا کہ میرے علم میں تو نہیں ہے۔ اس پر وہ کہنے لگا میری دادی کہتی تھیں کہ جب تمہارے دادا کا انتقال ہونے لگا تو کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکل رہا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ میں حضرت سید احمد شہید کے خلاف یار محمد خاں کے لشکر میں شامل تھا، یہ اسی کی نحوست ہے۔ میں نے یہ عزم کیا ہے کہ جہاد کرتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر جان دونگا۔"

www.abulhasanalinadwi.org

حضرتؒ لاہوری کی ہدایت پر حضرتؒ مسلسل تین ماہ اسی ریاضت و مجاہدہ کے ساتھ شاہی مسجد میں مقیم رہے (۱) اور اخیر جون تک لکھنؤ واپسی ہوئی۔

(۱) حضرت لاہوریؒ نے حضرتؒ کو یہ بھی ہدایت فرمائی تھی کہ مسجد میں واقع حوض کی منڈیر پر سویا کریں تا کہ غفلت کی نیند نہ آسکے، ایک عرصہ تک یہ معمول بھی رہا۔

پانچواں باب

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں باضابطہ تدریس کے دس سال، سیرت سیّد احمد شہید کی تصنیف، نصاب تعلیم کی ترتیب نو اور دیگر پیش آنے والے اہم حوادث وواقعات

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے باضابطہ تعلق

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے حضرت کا خاندانی وموروثی تعلق تھا، حضرت کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی تنہا وہ ذات تھی جن پر تمام ذمہ داران ندوہ کا اتفاق ہوا تھا اور وہ تاحیات اس کے ناظم رہے۔ ان کی وفات کے چند ہی سال گزرے تھے کہ اراکین ندوہ کی نظر انتخاب حضرت کے برادر بزرگوار ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ پر پڑی اور وہ ناظم بنائے گئے۔ اس خاندان کا ذہنی وفکری طور پر بھی ندوۃ سے گہرا ارتباط وتعلق اور ہم آہنگی تھی۔ حضرت نے تعلیم کی تکمیل بھی دارالعلوم ہی میں فرمائی تھی، اور اس وقت دارالعلوم کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب حضرت کے بڑے شفیق ومحبّ استاد تھے۔

۱۹۳۱ء کے اواخر میں علامہ تقی الدین ہلالیؒ کی ہمرکابی میں اعظم گڑھ کا سفر ہوا، اور دارالمصنّفین میں کئی روز قیام کی نوبت آئی۔ اسی زمانہ میں حضرتؒ کو وہاں قیام کر کے کچھ خدمت کرنے کا خیال پیدا ہوا کہ وہاں رہ کر علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سرپرستی میں علمی وتصنیفی کام آسان تھا۔ حضرتؒ نے ہلالی صاحبؒ سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی

www.abulhasanalinadwi.org

فرمایا، لیکن انھوں نے فرمایا کہ "تمہارے لئے دارالعلوم زیادہ موزوں جگہ ہے۔
حضرت فرماتے ہیں کہ

"اس میں حکمت الٰہی تھی کہ

خواجہ خود روش بندہ پروری داند

مجھے اگر دارالمصنّفین میں قبول کرلیا جاتا تو میری زندگی کا سانچہ کچھ اور ہوتا اور شاید میری تمام سرگرمیاں اور ٹوٹی پھوٹی صلاحیتیں تصنیف وتالیف کے دائرہ میں محدود رہ جاتیں۔" (۱)

دارالمصنّفین کے اسی زمانۂ قیام میں سید صاحبؒ کو ندوہ سے ایک عربی رسالہ کے اجراء کا خیال آیا، ہلالی صاحبؒ سے مشورہ کے بعد اس کا فیصلہ کرلیا گیا، اور ندوہ کے لائق فرزند، ادیب وانشاء پرداز مولانا مسعود عالم ندویؒ کو اس کا مدیر منتخب کیا گیا، حضرتؒ اعزازی طور پر اس کی ادارت میں شریک ہوئے اور اس میں مستقل مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع فرمایا، اس دور کے بعض مضامین اہم اور مشہور عربی رسائل میں بھی شائع ہوئے، اور مشہور عرب اہل قلم ادباء نے ان مضامین کو قدر کی نگاہ سے دیکھا، ان میں خاص طور پر استاد محبّ الدین خطیب نے اپنے رسالہ "الفتح" میں ان کو شائع کیا، اس طرح عالم عربی سے رابطہ قائم ہوگیا۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری تھا اور حضرت آزادانہ طور پر خدمت انجام دے رہے تھے کہ اچانک ایک لطیفۂ غیبی پیش آیا اور حضرت کا دارالعلوم سے باضابطہ تعلق ہوگیا۔ اس اجمال کی تفصیل حضرت یوں بیان فرماتے ہیں :

"۱۹۳۴ء کی ابتداء میں ہلالی صاحب دارالعلوم سے علاحدہ ہوکر زبیر (عراق چلے گئے) اور وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ مسعود صاحب پر یہ جدائی بہت شاق گزری کہ ان کو ابھی فاضل استاد سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا، انھوں نے اس کا عزم کرلیا کہ وہ دارالعلوم سے چھٹی لے کر کچھ عرصہ کے لئے

---

(۱) کاروان زندگی اوّل ص۱۳۶-۱۳۷

ہلالی صاحبؒ کے پاس ''زبیر'' میں قیام کریں گے اور ان سے مزید استفادہ کریں گے۔ میں لاہور میں تھا اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب کی ہدایت کے مطابق شاہی مسجد کے ایک حجرہ میں مقیم تھا کہ اچانک مسعود صاحب کا یہ خط میرے نام آیا، خط پر ۷ محرم ۱۳۵۴ھ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔

''ہلالی صاحب ''زبیر'' میں قیام پذیر ہیں، میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ ایک سال کے لئے ہو آؤں، ڈاکٹر صاحب راضی ہیں اور پوری تائید کے ساتھ، مسعود صاحب پہلے متامل تھے مگر رات راضی معلوم ہوتے تھے مگر ان کا پہلے مطالبہ یہ ہے کہ علی میاں کو بلا کر ''الضیاء'' سپرد کر دو، اس کے بعد رُخ کر سکتے ہو۔ سید صاحب کو خط لکھا ہے اب صرف ان کے جواب کا انتظار ہے اگر حسب توقع انھوں نے اجازت دے دی تو میرا سفر صرف آپ کے اختیار میں رہے گا، ادارت و ترتیب کا آپ ذمہ لے لیں، دوڑ دھوپ کا کام کوئی صاحب کر لیں گے۔''(۱)

حضرتؒ نے یہ پیش کش قبول فرمالی، مگر اتفاق سے بعض ایسی قانونی رکاوٹیں پیش آئیں کہ مولانا مسعود عالم صاحب سفر نہ کر سکے لیکن یہ واقعہ دارالعلوم سے حضرت کے باضابطہ تعلق کی تمہید اور ذریعہ بن گیا۔

مولانا مسعود علی صاحب ندویؒ دارالعلوم کی مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں عرصہ سے دارالعلوم میں مقیم تھے، اللہ نے ان کو بڑی انتظامی صلاحیت عطا فرمائی تھی، وہ چاہتے تھے کہ دارالعلوم کے فارغین میں نوجوان فضلاء کا انتخاب کیا جائے اور تعلیمی و تربیتی او رانتظامی حیثیت سے ایسے افراد مہیا کئے جائیں جو نئے جذبہ اور پورے حوصلہ کے ساتھ دارالعلوم کی خدمت کر سکیں، اس سلسلہ میں ان کی نظر جن نوجوان فضلاء پر پڑی ان میں حضرتؒ کی ذات گرامی بھی تھی۔ انھوں نے جلسۂ انتظامی مورخہ ۱۵ر جولائی

---

(۱) کاروانِ زندگی اول ۱۳۷-۱۳۸

www.abulhasanalinadwi.org

۱۹۳۴ء میں حضرت کا نام تدریس کے لئے پیش کیا، ڈاکٹر صاحب بھائی ہونے کی وجہ سے خاموش رہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تائید اور ارکان کے اتفاق سے یہ تجویز منظور کر لی گئی اور یکم اگست ۱۹۳۴ء سے حضرت کا بحیثیت استاد تفسیر و ادب تقرر ہو گیا۔

ذہنی وفکری ہم آہنگی

حضرت فرماتے ہیں :

''میرا ذہنی سانچہ جس کی تشکیل میں دادیہالی اور نانیہالی اثرات، خاندانی ماحول اور روایات، تین پشتوں کے تصنیفی اور ادبی ذوق حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان و جماعت سے انتساب کے نتیجہ میں قلب و نظر کی وسعت اور دین کی حمایت و حمیت، پھر سب سے بڑھ کر اپنے برادر بزرگوار و مربی مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ (جنھوں نے قدیم وجدید تعلیم کی بہترین خصوصیات کو اپنے اندر جذب کیا تھا اور جو مشرقی و مغربی علوم کے مجمع البحرین تھے جن کے متعلق کہنا صحیح ہوگا ''مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان'') کی صحبت و تربیت نے برابر کا حصہ لیا تھا، اپنی علمی بے بضاعتی اور کم حیثیتی کے باوجود جو اس سن وسال کا قدرتی تقاضہ بھی تھا، ندوۃ العلماء کے اس دینی وفکری مزاج اور جس ثقافت کا وہ نمائندہ اور علم بردار تھا اس سے فطری مناسبت رکھتا تھا، اسلئے اسکو اپنے کو اس ماحول میں فٹ کرنے کے لئے کوئی ذہنی ہجرت اور کوئی طویل سفر کرنا نہیں پڑا، اس کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے ہی گھر کے ایک گوشہ یا ایک کمرہ سے منتقل ہو کر دوسرے گوشہ اور کمرہ میں آ گیا ہے، اس میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ اس کا ذہنی و علمی نشو ونما شروع سے ندوہ ہی کے ماحول میں ہوا تھا، اور بچپن ہی سے اس کے کان میں وہ باتیں پڑی تھیں جو اس کو ندوہ کی تاریخ سے واقف، اس کے جلیل القدر بانیوں سے آشنا اور اسکے خیالات سے مانوس کرتی تھیں، اس کے مربی اور ولی نعمت برادر بزرگؒ اس کے محبوب و شفیق استاد

www.abulhasanalinadwi.org

شیخ خلیل عربؒ اور اسکی ایک طرح کی ذہنی تربیت کرنے والے اور اسکے ایک دوسرے استاد و اتالیق مولانا سید طلحہ صاحبؒ سب ندوہ ہی کے تعلیم یافتہ اور خوشہ چیں تھے۔

ان فکری و علمی مناسبتوں اور قدیم رشتوں کے علاوہ دارالعلوم میں بحیثیت استاد و معلم کے آنے میں اللہ کی یہ بھی بڑی حکمت تھی کہ اس ماحول میں مجھے آزادی سے کام کرنے، اپنی ٹوٹی پھوٹی صلاحیتوں سے کام لینے اور ان کو ترقی دینے کا جو موقع تھا وہ کسی اور درسگاہ میں ملنا مشکل تھا۔ ندوۃ العلماء کے ناظم میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ تھے۔ معتمد تعلیم مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے، جو والد صاحب سے تلمذ اور بھائی صاحب سے محبت و اتحاد کے رشتہ سے ایک خاندانی بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے مہتمم و شیخ الحدیث میرے شفیق استاد مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ تھے۔ نیابت اہتمام اور دفتر کی سربراہی میرے رفیق درس اور دوست مولانا حافظ محمد عمران خاں ندویؒ کرتے تھے۔ اساتذہ و مدرسین میں متعدد میرے درس کے ساتھی اور دیرینہ دوست و رفیق تھے، مثلاً مولانا مسعود عالم صاحب ندویؒ، مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ، شیخ محمد العربیؒ، کچھ عرصہ کے بعد مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندویؒ، مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندویؒ، اور مولانا اویس صاحب ندویؒ بھی اس گروہ میں آکر شامل ہوگئے۔ اس لئے یہاں تعلیم و تدریس کا فرض انجام دینے، طلبہ سے قریبی رابطہ رکھنے اور اگر کبھی ذہن میں آئے تو کوئی نیا تعلیمی تجربہ کرنے بلکہ نصاب کے بارے میں بھی حقیر معروضات پیش کرنے اور مشورہ دینے میں کوئی انتظامی دقت اور دفتری اور حاکمانہ رکاوٹ حائل نہیں تھی۔"(۱)

تدریس و تعلیم کا آغاز اور دارالعلوم میں قیام

تدریس کی ابتداء ہوئی تو حضرت نے باقاعدہ دارالعلوم ہی میں قیام پسند فرمایا

(۱) کاروانِ زندگی اوّل ۱۴۴-۱۴۵

www.abulhasanalinadwi.org

تا کہ پوری توجہ وانہماک کے ساتھ تدریس وتعلیم میں مشغول ہوسکیں۔ جس کمرہ میں حضرت کا قیام تھا، اس میں مولانا مسعود عالم صاحب ندویؒ بھی مقیم تھے، اس طرح وہ رہائش گاہ بھی تھا اور ''الضیاء'' کا دفتر بھی۔ مولانا مسعود صاحب اگر چہ دار العلوم میں دورانِ تعلیم ایک سال آگے تھے لیکن ان سے بڑی ذہنی وفکری مناسبت اور اتحاد تھا۔ پہلے ہی سال حضرتؒ کو درجہ ششم میں ترمذی شریف کا نصف ثانی اور قرآن کے ابتدائی دس پاروں کی تفسیر پڑھانے کے لئے دی گئی، اس کے علاوہ ادب میں دیوان حماسہ کا کچھ حصہ اور خُضری کی ''تاریخ الامم الاسلامیة'' اور ابتدائی درجات میں بھی کوئی ایک عربی ریڈر حصہ میں آئی۔

درس تفسیر کی تیاری کے سلسلہ میں حضرت تحریر فرماتے ہیں :

''میں کتب خانہ سے تفسیر کی قدیم بڑی کتابیں اور اہم بنیادی مآخذ لے آیا، ان میں سے بعض تفسیریں مثلاً ''کشّاف''، ''معالم التنزیل'' بغوی و مدارک تقریباً لفظاً لفظاً پڑھیں۔ جدید تفاسیر میں سے ''تفسیر المنار'' پھر مولانا آزاد کی ''ترجمان القرآن'' سے پورا استفادہ کیا۔ تدریس اور طلباء کے سوالات کے جواب میں علامہ آلوسی کی ''رُوح المعانی'' سے سب سے زیادہ مدد لی، جدید معلومات اور تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبد الماجد دریابادیؒ سے خط وکتابت شروع کی اور سوالات کے حل میں ان سے مدد لی، اس کے لئے کئی بار دریاباد حاضر ہوا اور مولانا سے استفادہ کیا۔''(۱)

دار العلوم کا ادبی وفکری رنگ

اس وقت دار العلوم پر ادبی وتاریخی ذوق سایہ فگن تھا۔ اور پورے دار العلوم پر عربی زبان وادب، انشاء وخطابت اور اُردو ادبیات وتاریخ کے مطالعہ کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ اس کے متعدد اسباب تھے، جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ دار العلوم کے ماحول میں

(۱) کاروان زندگی اوّل ص ۱۴۷

www.abulhasanalinadwi.org

سب سے بڑی مثالی شخصیت علامہ شبلی نعمانیؒ کی سمجھی جاتی تھی، انہیں کو دارالعلوم کا اصل بانی اور معمار سمجھا جاتا تھا اور طلبہ کے منتہائے پرواز وتخیل میں ان ہی کی ذات لائق تقلید واتباع تھی، اور ہر ذہین طالب علم مصنف، مورخ، ادیب وناقد بننے ہی کا خواب دیکھتا تھا۔ اس کا یہ ایک خوش کن پہلو تھا تو دوسری طرف اس کے بعض بڑے دوررس نقصانات بھی تھے کہ اس وقت کوئی دینی ودعوتی فضا نہیں تھی۔ دارالعلوم کے داعی اوّل اور بانی حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے رشتہ بڑی حد تک منقطع ہو چکا تھا، جس کی بے برکتی اور نقصانات ظاہر تھے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی اس کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا اور ڈاکٹر صاحبؒ بھی اس صورت حال سے بہت دل گیر تھے۔

دوسری طرف علامہ تقی الدین ہلالیؒ کی آمد سے عربی زبان وادب کا بھی ذوق پیدا ہونے لگا تھا۔ ''الضیاء'' کے اجراء سے اس میں مزید حرکت پیدا ہوئی، پھر ان فاضل نوجوان اساتذہ کے اثر سے جو براہ راست طلبہ پر اثر انداز تھے اس میں مزید ترقی ہوئی۔ الضیاء کے تبادلہ میں متعدد عربی رسائل آنے لگے، جن میں مصر کا ''المنار'' و''الفتح'' ڈاکٹر احمد حسن زیات کا ''الرسالہ'' ڈاکٹر احمد امین کا ''الثقافہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں :

''اس وقت ہمارا یہ چھوٹا سا کمرہ اور محدود ماحول بحر ہند کا ایک عربی جزیرہ بنا ہوا تھا۔''(۱)

اسی زمانہ کا ایک واقعہ بھی حضرت نے تحریر فرمایا ہے جس سے اس وقت زبان وادب کے ذوق پھر اس کی سطح کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

''اسی زمانہ کا دلچسپ واقعہ ہے کہ انجمن الاصلاح میں عربی کا ایک بڑے معرکہ کا ادبی مباحثہ ہوا، جس کا موضوع تھا''من هو أكبر رجل في العالم الاسلامي ؟!'' عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کون ہے؟ نوعمر مقررین جوش وخروش اور سنجیدگی واصرار کے ساتھ اس بحث میں حصہ لے رہے تھے گویا

(۱) کاروانِ زندگی اوّل ۱۴۸

www.abulhasanalinadwi.org

عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کا انتخاب اسی وقت کرنا ہے اور اس کے سر پر خلافت یا عظمت کا تاج رکھنا ہے۔ اس بحث میں شام کے ایک اخبار نویس محمود خیر الدین دمشقی بھی (جو ان دنوں آئے ہوئے تھے) شریک تھے۔ مسعود صاحبؒ کے رجحان اور اس وقت کے صدر اجلاس (راقم سطور) کے فیصلہ نے امیر شکیب ارسلانؒ کا پلڑا بھاری کر دیا اور حاضرین کی اکثریت نے ان کے حق میں فیصلہ کیا، ہم لوگوں نے تازہ اس وقت "**حاضر العالم الاسلامی**" کا مطالعہ کیا تھا اور "**الفتح**" میں امیر کے ولولہ انگیز و اسلامی مضامین پڑھتے تھے، اس لئے وہی ہمارے دل و دماغ میں رچے بسے ہوئے تھے۔ اس جلسہ کی صدائے بازگشت مصر میں بھی سنی گئی۔ امیر شکیب ارسلان نے مسعود صاحب کو ذاتی خط لکھا، جس میں اپنے نادیدہ معتقدین کے حسن ظن کا شکریہ ادا کیا، لیکن صفائی سے لکھا کہ یہ جامہ حقیقتاً عصر حاضر کے نامور مجاہد، غازی عبدالکریم الریفی کے قامت بلند پر راست آتا ہے جنھوں نے اپنی خداداد جنگی قابلیت اور عبقریت سے فرانس اور اسپین کے چھکے چھڑا دیئے۔ امیر مرحوم نے اپنی کتاب "**السید رشید رضا أو إخاء أربعين سنة**" (علامہ رشید رضا یا چالیس سال کی اخوت ومحبت) میں اس جلسہ کا تذکرہ کیا۔ اس سے ہم لوگوں کی اس وقت کی ذہنی سطح اور ذوق مطالعہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔"(۱)

یہ ادبی ذوق زبان پر قدرت ومہارت اور عربی واُردو پر یکساں عبور وہ امتیازات ہیں جو اس وقت دارالعلوم کو حاصل تھے، لیکن کوئی ایسی تحریک یا دعوت نہیں تھی جو اس کو بروئے کار لاتی اور ان وسائل کا حصول مقصد کے لئے استعمال ہوتا۔ جزوی طور پر یہ عمل جاری تھا، لیکن اس کو تحریک کی شکل دینے کی ضرورت تھی، اس کے لئے ضروری تھا کہ خالص دینی ماحول پیدا ہو اور دعوتی فضا بنے۔ حضرت نے دارالعلوم کے اس ادبی ماحول میں رہ کر جو فائدہ اٹھایا، اس سے دعوتی میدانوں میں کام لیا۔ فرماتے ہیں:

---

(۱) ملخصاً از پرانے چراغ حصہ اوّل ص ۲۲۴-۲۲۵

www.abulhasanalinadwi.org

"اس نظام اور فضا کی بدولت میں مصر وشام کے اہل قلم اور صاحب اسلوب ادیبوں اور اپنا مستقل دبستان فکر رکھنے والے فضلاء واہل فکر سے اتنا ہی واقف اور مانوس ہوگیا جیسے ہندوستان کے ادباء، شعراء اور ناقدین ومفکرین سے واقف تھا بلکہ بعض خصوصیات کی بنا بران غیر ملکی ادیبوں اور اہل فکر وقلم سے اس وقت زیادہ واقف تھا، ہم لوگ بے تکلف ان کے محاسن اور ان کی کمزوریوں اور ذہنی ودینی بے راہ روی پر تبصرہ کرتے تھے اور ان کے درجوں ومراتب کی تعیین کرتے تھے، اس کا فائدہ مجھے پورے طور پر اس وقت محسوس ہوا جب میں ۱۹۵۱ء میں مصر گیا، وہاں میرے لئے کوئی شخصیت نئی سحر انگیز اور مرعوب کن نہ تھی، نہ مجھے وہاں کسی نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ باہر کے ان ملکوں میں (جن کی تہذیب وترقی وعلم کا طلسم دل ودماغ پر چھایا ہوتا ہے) دین کے ایک داعی اور خادم کے لئے یہ بات بڑی اہمیت وافادیت رکھتی ہے کہ وہاں جانے سے پہلے وہاں کے ادب وانشاء کا تنقیدی مطالعہ کر چکے ہوں اور وہاں کے رگ وریشہ سے واقف ہو چکے ہوں۔"(۱)

حضرت نے دارالعلوم سے باضابطہ تعلق کے بعد آہستہ آہستہ اپنی اس دعوتی فکر اور جذبہ کو دارالعلوم کی چہار دیواری کے اندر منتقل کرنا شروع کیا۔ پھر معاصر کبار مشائخ کی آمد اور دارالعلوم میں ان کے قیام سے جو فضا قائم ہوئی اس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ صفحات کا موضوع ہوگی۔

رشتۂ ازدواج

دارالعلوم کے قیام کے پہلے ہی سال میں حضرتؒ کی شادی حقیقی ماموں زاد بہن سیدہ طیب النساء صاحبہؒ سے ہوئی جو حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی پوتی اور مولانا سید عبدالرزاق کلامی، "صاحبِ صمصام الاسلام" کی نواسی تھیں۔ حضرت مولانا حیدر حسن خاں

(۱) کاروانِ زندگی اوّل ۱۴۸-۱۴۹

www.abulhasanalinadwi.org

صاحبؒ نے نکاح پڑھایااورڈاکٹر صاحب نے بڑے اہتمام سے ولیمہ کاانتظام فرمایا۔

تعلیم وتدریس میں حضرتؒ کی دلسوزی اورمحنت

عربی زبان وادب حضرت کا خاص موضوع تھا، اس میں یہ بھی اہتمام تھا کہ سبق اس طرح پڑھایا جائے کہ وہ غذا بن جائے اور طلبہ اس سے مانوس ہوں۔ حضرت فرماتے ہیں :

''اس وقت اپنے درجوں کے طلبہ سے ایسا تعلق پیدا ہوگیا تھا جو افادہ واستفادہ کے لئے شرط ہے۔ گھول کر پلادینے کا جذبہ جو اپنے شفیق استاد شیخ خلیل عربؒ سے ملا تھا اس وقت سینہ میں موجزن تھا، ضوابط وقواعد نپے تلے وقت اور مقام کی کوئی قید نہ تھی، طلبہ کو ہر طرح مشق کرانے اور عربی سکھانے کا اہتمام رہتا تھا اس کے لئے ہم لوگ نئے نئے طریقہ اختیار کرتے اور ذہنی اُپج سے کام لیتے تھے۔''(۱)

استاذ تقی الدین ہلالی کے چھوٹے بھائی شیخ محمد العربی بھی اس وقت دارالعلوم میں مدرس تھے انکے بارے میں حضرت فرماتے ہیں کہ

''ان سے بڑی مدد ملتی تھی، پھر ان ہی کے مشورہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ عربی زبان کی تعلیم کا بطرز مستقیم (Direct Method) کے اصول پر تجربہ کیا جائے۔ طلبہ کی ایک جماعت ہمارے حوالہ کی گئی اور الحمد للہ خاطر خواہ نتائج سامنے آئے۔ اس سے طلبہ کو بھی فائدہ ہوا اور اس سے زیادہ ہم پڑھانے والوں کو ہوا۔ عربی زبان میں طلاقت وروانی اور بولنے اور تقریر کرنے کی مشق ہوئی جو ان خدمتوں کی بنیاد بنی جو دعوت کے میدان میں فضل خداوندی سے نصیب ہوئیں۔''(۲)

دوسری زیر درس کتابوں میں بھی حضرت کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہوتی کہ طلبہ

---

(۱) کاروان زندگی حصہ اوّل ص ۱۵۱

(۲) کاروانِ زندگی اوّل ۱۵۱

www.abulhasanalinadwi.org

اصل مضمون سے براہ راست مستفید ہوں۔ایک درجہ میں منطق پڑھانے کی بھی نوبت آئی۔فرماتے ہیں''میں اس کی مثالیں روزمرہ کی چیزوں اور مشاہدات سے دیتا تھا''۔

تدریس کے دوسرے ہی سال سے درجہ ہفتم میں تاریخ ادب عربی کا گھنٹہ مستقل حضرت کے حصہ میں آ گیا،اور کئی سال احمد حسن زیات کی''**تاریخ الأدب العربی**''پڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔

تدریس کے آخری سالوں میں کئی سال تک بخاری شریف کی کتاب الوحی، کتاب الایمان اور کتاب العلم پڑھائی۔فرماتے ہیں کہ''اس میں خوب جی لگا''۔ایک سال کچھ عرصہ تک **حجة الله البالغة** بھی زیر درس رہی۔

سفرِ بمبئی اور ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوت اسلام

۱۹۳۵ء کے اواخر کی بات ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر کے متعلق یہ شہرت ہوئی کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے لئے صحیح مذہب کی تلاش میں ہیں۔ڈاکٹر صاحب اور عرب صاحب دونوں کا اصل اور فطری ذوق غیر مسلموں میں تبلیغ کا تھا۔ان کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ بمبئی کا سفر کریں اور ان کو دعوت اسلام دیں۔تدریس شروع کئے ہوئے حضرت کو ایک ہی سال ہوا تھا اور حضرت کی عمر بھی صرف اکیس سال کی تھی مگر شاید اس وجہ سے کہ حضرت ان دونوں کے مزاج و مذاق سے واقف اور اس درد کے شریک تھے،انھوں نے حضرت کا انتخاب کیا۔اکتوبر کی کسی تاریخ میں یہ سفر ہوا۔اس کی تفصیل حضرت ہی کی زبان میں ملاحظہ ہو :

''میں نے اس وقت لاہور کے علاوہ کوئی طویل سفر نہیں کیا تھا۔بمبئی میرے لئے ایک جدید و عظیم اور مولانا دریابادی کی اصطلاح میں''یاجوجی''شہر تھا۔میں وہاں سوائے شرف الدین کتبی صاحب کے جن کا مکتبہ قیمہ بھنڈی بازار میں عربی کتابوں کا واحد مکتبہ تھا،کسی سے واقف نہ تھا۔میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی اور مولوی رئیس احمد صاحب جعفری عرصہ تک

www.abulhasanalinadwi.org

اخبار ''خلافت'' میں کام کر چکے تھے اور خلافت ہاؤس میں ان کا قیام رہ چکا تھا۔ مولانا عبد السلام کو جب معلوم ہوا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں تو انھوں نے مولانا محمد عرفان صاحب جو آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری اور خلافت ہاؤس کے ناظم اعلیٰ تھے ایک تعارفی خط لکھ دیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت میرے ایک دوست و رفیق مولانا ابراہیم عمادی ''خلافت'' میں کام کرتے تھے اور خلافت ہاؤس ہی میں مقیم تھے۔ بمبئی پہنچ کر میں سیدھا خلافت ہاؤس پہنچا جو لولین بائیکلہ میں واقع ہے۔ مولانا عرفان صاحب نے مجھے خلافت ہاؤس میں ٹھہرالیا، اور مولانا عمادی صاحب نے اپنا مہمان بنالیا، لیکن میں جب کسی سے اس مہم کا ذکر کرتا تو اس کو ہنسی آجاتی اور مجھ کو سر سے پاؤں تک دیکھتا

ع اس حوصلہ کو دیکھئے اور ان کو دیکھئے

میں نے بڑی احتیاط اور رازداری کے ساتھ ڈاکٹر امبیڈکر کے مکان کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ دادر میں ان کا بنگلہ ہے۔ اس وقت بمبئی میں ٹرام چلتی تھی، میں ان دعوتی رسائل کو جو لکھنؤ سے لایا تھا، ساتھ لے کر ٹرام پر سوار ہو گیا اور دادر اتر کر ان کے بنگلہ پر پہنچا۔ صبح ۷-۸ بجے کا وقت ہوگا۔ معلوم ہوا کہ وہ ہوا خوری (Walk) کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ انتظار کے کمرہ میں میں نے دیکھا کہ ملاقات کے لئے آنے والے بہت سے حضرات قطار در قطار بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے سوچا ان اہم ملاقاتیوں اور آنے والوں میں، میں ان کی نظر میں کیا جچوں گا اور وہ کیا میری طرف توجہ کریں گے لیکن میں اللہ کا نام لے کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر میں وہ مکان میں داخل ہوئے، دوہرا بدن، میانہ قد، رنگ کھلتا ہوا، ہاتھ میں چھڑی، مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور مجھے اشارہ کیا کہ آپ آیئے۔ وہ مجھے اوپر لیکر اپنے ریڈنگ روم میں پہنچے اور بیٹھنے کا اشارہ کیا، میں نے دیکھا کہ میز پر جو کتابیں تھیں، ان میں پکتھال صاحب کا ''ترجمۃ القرآن'' بھی تھا جس میں نشانی رکھی ہوئی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں تک پڑھا

ہے۔میں نے اپنی گفتگو کا نقشہ (پلان) بنالیا تھا۔میں اپنی حیثیت اور قابلیت سے واقف تھا، اس لئے میں نے طے کرلیا تھا کہ میں ایک سیدھے سادے مسلمان اور خالص داعی کی حیثیت سے صاف صاف گفتگو کروں گا، جس میں کسی سیاسی معاشرتی ترغیب کی آمیزش نہ ہوگی۔میں نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا ڈاکٹر صاحب! آپ سے مختلف مذاہب کے بڑے بڑے لوگ ملے ہوں گے، انھوں نے اونچی اونچی باتیں کہی ہوں گی، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی اور اپنی برادری (Community) کی نجات کی فکر ہے اور خلوص کے ساتھ صحیح مذہب کی تلاش ہے تو میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور اسکے لئے کوئی رشوت یا ترغیب یا لالچ نہیں دیتا۔ پوری گفتگو تو یاد نہیں ہے لیکن گفتگو کی روح اور جان یہی تھی۔انھوں نے بڑی سنجیدگی اور احترام کے ساتھ میری بات سنی اور جواباً کہا کہ معاملہ بڑا سنجیدہ اور غور طلب ہے۔ میں مطالعہ بھی کررہا ہوں اور غور بھی۔اس کے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گا۔میں یہ لکھنا بھول گیا کہ چلتے وقت عرب صاحب نے میرے کان میں کہا تھا کہ اگر بات اس پر آکر رک جائے کہ ہم لوگوں کو رشتہ کون دے گا؟ تو کہہ دینا کہ ایک خالص عربی النسل شریف انصاری خاندان ہے، وہ آپ کو اپنی بیٹی دینے کو تیار ہے۔اور میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ تم میری طرف سے وعدہ کرلینا۔ مجھے یاد ہے کہ عرب صاحب نے بڑے رقت انگیز طریقہ پر یہ بات کہی تھی اور وہ اس کے لئے ضرور تیار ہوجاتے۔میں نے جب دیکھا اب مزید گفتگو کی گنجائش نہیں تو وہ انگریزی لٹریچر پیش کیا اور ان سے درخواست کی کہ اس کا مطالعہ ضرور کرلیں۔انھوں نے مجھے احترام کے ساتھ رخصت کیا، اور میں چلا آیا۔اب یہ تقدیری بات ہے 'إنک لا تھدی من أحببت و لکن اللہ یھدی من یشاء' کی تفسیر معلوم ہوتی ہے کہ اس اعلان کے بعد انھوں نے اپنی اور اپنی کمیونٹی کے لئے بودھ مت کا انتخاب کیا۔غالبًا ان کو اپنی زندگی ہی میں اپنی اس

www.abulhasanalinadwi.org

انتخاب کی غلطی اور ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کے انجام کا احساس ہوگیا۔ اور اگر ان کو نہیں ہوا تو ان کی (Community) اور پڑھے لکھے صاحب فکر اچھوتوں کو اب شدت سے یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ اس تبدیلی سے ان کی تقدیر نہیں بدلی، جیسا کہ مسٹر V.T. Rajshekar کی کتاب Ambedkar and His Conversion کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔''(۱)

حضرت کا بمبئی میں مزید ہفتہ عشرہ قیام رہا لیکن اچانک ملیریا نے حملہ کیا اور بخار کا سلسلہ شروع ہوگیا اور لوگوں کی رائے وطن واپسی کی ہوئی۔ حضرت فرماتے ہیں :

''لکھنؤ پہنچ کر دو اطلاعیں ملیں؛ ایک بڑی خوش کن اور مسرت افزا اور ایک غم آگیں اور افسوسناک۔ خوش کن اطلاع تو برادر زادۂ عزیز محمد الحسنی کی ولادت کی خبر تھی، میرے لکھنؤ پہنچنے سے پانچ ہی سات روز پہلے ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ان کی ولادت ہوئی۔ افسوسناک خبر میرے حقیقی ماموں زاد بھائی سید محمد مصطفیٰ مرحوم کی اچانک وفات جو غالباً سانپ کے کاٹنے سے ہوئی تھی، وہ مجھ سے تین چار سال بڑے تھے اور حقیقی بھائیوں کی طرح ہم لوگ ساتھ رہے اور کھیلے تھے۔''(۲)

دو اہم واقعات

اکتوبر ۱۹۳۵ء کو علامہ سید سلیمان ندویؒ شدید طور پر علیل ہوئے، اہل تعلق عیادت کے لئے دار المصنفین حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اعظم گڑھ کا اسی لئے سفر کیا اور تشخیص یہ کی کہ سید صاحب کا ذہن مستقل مشغول رہتا ہے اور کسی وقت راحت نہیں ہوتی اس لئے مرض میں تخفیف دشوار ہورہی ہے۔ یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ اس کی صرف تین شکلیں ہیں، ایک تو یہ کہ شطرنج کھیلیں، دوسرے یہ کہ الیکشن میں کھڑے ہوجائیں اور تیسری شکل یہ ہے کہ

(۱) تلخیص از کاروان زندگی اول ص ۱۵۶-۱۶۰
(۲) کاروان زندگی اول ص ۱۶۴

www.abulhasanalinadwi.org

شاعری شروع کر دیں تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائیں گے اور ذہن یکسو ہو جائے گا۔ حضرتؒ اور حضرتؒ کے رفقاء مولانا عبدالسلام صاحب قدوائیؒ اور مولانا مسعود عالم ندویؒ صاحب بھی حاضر خدمت ہوئے۔

صحت یابی کے بعد جب سید صاحبؒ کی لکھنؤ تشریف آوری ہوئی تو اس تقریب میں دارالعلوم میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں شہر کے معززین بھی شریک ہوئے، حضرت نے اساتذہ کی جانب سے سپاس نامہ پیش کیا، جو حضرت کی تحریروں میں ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے بارے میں حضرت فرماتے ہیں :

''میں نے سپاس نامہ میں اس کی خاص رعایت کی کہ سید صاحب کی تمام اہم تصنیفات کا نام ان کی فہرست پیش کئے بغیر تلمیحات میں آجائے اور اس میں بحمد اللہ کامیاب رہا۔ ان کو خطاب بھی پیرایہ بیان بدل بدل کر کیا گیا۔ سپاس نامہ اب بھی دارالمصنفین میں کسی جگہ آویزاں ہے۔''(۱)

۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جبلی منعقد ہوئی۔ ندوہ کے وفد میں حضرت بھی شامل تھے۔ کانفرنس کے روح رواں صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی تھے جو ندوہ اور اہل ندوہ کے بھی سرپرست اور بزرگ تھے۔ حضرت کا یہ علی گڑھ کا پہلا سفر تھا، قیام مولانا ابوبکر صاحب فاروقی (ناظم شعبہ دینیات) کے یہاں ہوا، جن سے پشتوں سے گوناگوں تعلقات تھے۔(۲)

حضرت فرماتے ہیں :

''نواب صدر یار جنگ مرحوم نے جب اس پر شکایت کی اور بزرگانہ عتاب فرمایا کہ میں ان کے یہاں کیوں نہ ٹھہرا، تو میں اخیر میں کچھ وقت کے لئے حبیب منزل چلا گیا۔''(۳)

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۶۵

(۲) مولانا کے والد مولانا ابوالخیر مکی حضرت کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی کے مرید با اختصاص تھے اور دادا مولانا سخاوت علی جونپوری حضرت سید صاحب کے خلفاء میں تھے۔

(۳) کاروان زندگی اول ص ۱۶۶

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت کی خاص طور پر شعبہ مدارس کے جلسہ میں شرکت ہوئی جس کی صدارت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرما رہے تھے۔ کاروان زندگی میں تحریر فرماتے ہیں :

''مولانا ابوبکر صاحب کی خیر مقدمی تقریر کا یہ جملہ ابھی تک یاد ہے''ابھی آپ کو نوجوانوں کے چھپے ہوئے ٹخنوں کی شکایت ہے وہ وقت قریب ہے کہ آپ کو نوجوانوں کے کھلے ہوئے گھٹنوں کی شکایت ہوگی۔ ان کا اشارہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب اور اس ہندوانہ تہذیب کی طرف تھا جو اس انقلاب کی جلو میں آ رہا تھا''(۱)

حضرت سید احمد شہیدؒ کی ذات سے شغف و تعلق اور سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف کا آغاز

خاندان کی نمایاں شخصیات کی امتیازی صفات و خصوصیات کا نسل میں منتقل ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ حضرتؒ کی حیات و شخصیت پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان کے بزرگوں کے اوصاف و کمالات کو حضرتؒ نے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ خاندان کی جن شخصیتوں نے حضرتؒ پر گہرے نقوش چھوڑے ان میں سر فہرست حضرت امیر المؤمنین سید احمد شہیدؒ کی ذات والا صفات ہے، جس نے ذہنی و فکری طور پر سب سے زیادہ متاثر کیا اور حضرتؒ نے تجدید و اصلاح کی جو کوششیں فرمائیں ان میں اس کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اس خاندان کے وہ بدر کامل ہیں جن کی کرنوں سے ایک عالم ضیاء بار ہوا۔ خاندان میں ان کے حالات و کمالات کا چرچا ہونا ایک قدرتی امر تھا، پھر حضرت کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ اور برادر بزرگوار مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبد العلیؒ کو حضرت سید صاحبؒ سے خصوصی عقیدت و مناسبت تھی۔ مولانا عبد الحی صاحبؒ کے (دہلی اور اس کے اطراف) کے سفر نامے سے اس عقیدت و محبت بلکہ عشق و وارفتگی کا جا بجا اظہار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۶٦

www.abulhasanalinadwi.org

بارے میں حضرتؒ سے یہ بارہا سنا کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ بھائی صاحب کو حضرت سید صاحب سے ہی سب سے زیادہ عقیدت ہے۔ حضرت شہیدؒ کا نام بچپن سے ہی حضرت کے کانوں میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی فکر و توجہ سے اس میں جلا پیدا ہوئی اور حضرتؒ کو سید صاحبؒ کی ذات اور انکی سیرت و دعوت سے گہرا تعلق پیدا ہوا۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر صاحب کی تربیت کے خاص انداز اور حضرت کی مضمون نگاری کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ والد ماجد مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ کا سفر نامہ گھر کی کتاب تھی جو ایک قلمی رسالہ کی شکل میں ان کے مسودات میں محفوظ تھی اس کا نام انھوں نے ''ارمغان احباب'' رکھا تھا۔ جو بعد میں ''دہلی اور اسکے اطراف'' کے نام سے شائع ہوئی، اسکے مطالعہ نے گہرا اثر ڈالا۔ حضرتؒ خود تحریر فرماتے ہیں کہ ''مجھے سب سے زیادہ جس تحریر نے سید صاحب کی شخصیت سے متعارف اور متاثر کیا وہ یہی روزنامچہ یا سفرنامہ ہے۔''(۱)

بالآخر وہ زمانہ اور مبارک موقع بھی آیا جو حضرتؒ کے الفاظ میں زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ایک نئے اور مبارک دور کا آغاز۔ ۱۹۳۶ء کی گرمیوں کی تعطیل میں حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کی دعوت پر ٹونک کا سفر ہوا، ٹونک سے خاندان کے قریبی روابط تھے، اعزہ کی بڑی تعداد کا وہ مسکن تھا۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کے قریبی اہل خاندان اور بقیہ مجاہدین نے اس کو اپنا مستقر بنالیا تھا۔ حضرتؒ نے جس زمانہ میں ٹونک کا سفر کیا اس وقت وہاں حضرت سید صاحبؒ کے حقیقی نواسہ کے صاحبزادہ سید محمد اسماعیل صاحب موجود تھے جو حضرت کے رشتہ میں چچا ہوتے تھے۔ دوسرے نواسہ کے صاحبزادہ حافظ سید محمد یونس صاحب کی صاحبزادی بھی وہاں موجود تھیں، جو حضرت کے دوسرے رشتہ کے چچا سید عبدالحفیظ صاحبؒ کی اہلیہ تھیں۔ اگرچہ حضرت کا زیادہ تر قیام داعی و میزبان حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کے یہاں رہا، جو بڑے محبت کرنے والے اور شفیق استاد تھے لیکن یہ اعزہ بھی

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۶۷

www.abulhasanalinadwi.org

محبت و تعلق میں کم نہ تھے، خاص طور پر اہلیہ سید عبدالحفیظ صاحب نے بزرگانہ شفقت فرمائی۔ حضرتؒ اکثر ان کے یہاں مہمان رہتے، ان ہی کے گھر سے بعد میں حضرتؒ کو سید صاحبؒ کے حالات و وقائع کا سب سے زیادہ مستند و ضخیم مرقع ''وقائع احمدی'' کئی جلدوں میں ملا۔

وقائع احمدی، سیرت سید احمد شہید کا بڑا مآخذ ثابت ہوئی اور بعد کے ایڈیشن میں اس سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا۔ اس کے مطالعہ سے حضرت پر گہرا اثر پڑا۔ اسکے بارے میں حضرتؒ سے راقم نے خود سنا ہے کہ دارالعلوم کے مہمان خانہ میں راتوں کو لالٹین جلا کر میں اس کے مطالعہ میں محو ہو جاتا، بعض بعض مرتبہ معلوم ہوتا تھا کہ رحمت الٰہی کا کوئی جھونکا آیا، رقت طاری ہو جاتی اور خود بخود دعا کے لئے ہاتھ اٹھ جاتے۔ اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی سنایا کہ رائے بریلی کے سفر میں یہ کتاب مطالعہ میں تھی، جب اسٹیشن پر اترا تو سواری والے دریافت کرنے لگے کہاں جاؤ گے ہم پر اتنا گریہ طاری تھا کہ جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔

اسی سفر میں سیرت سید احمد شہیدؒ کی تالیف کا آغاز ہوا۔ اس کا واقعہ خود حضرت کے الفاظ میں نقل کیا جا رہا ہے :

> ''ایک دن جب میں مولانا کے ساتھ دریائے سئی کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا، جہاں سید صاحبؒ اور ان کے پاکباز مجاہدین نے بارہا وضو کیا ہوگا، صبح کے سہانے وقت طلوع آفتاب سے پہلے ایک پتھر پر بیٹھ کر دریا میں پاؤں ڈال کر ''سیرت سید احمد شہید'' کا مقدمہ لکھا، جس پر مئی ۱۹۳۶ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے، جو ''سید صاحب کی سیرت پر ایک اجمالی نظر'' کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔''(۱)

حضرت سید صاحب کے مجاہدانہ، مجددانہ کارناموں سے حضرت کے تأثر کا اندازہ اس مختصر سے ٹکڑے سے بھی کیا جا سکتا ہے، جو حضرت نے اس وقت تحریر فرمایا

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۶۹

www.abulhasanalinadwi.org

تھا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس تحریر کا لکھنے والا کوئی سن رسیدہ پختہ کار مصنف نہیں بلکہ صرف ۲۳ سال کا نوجوان ہے جس نے ابھی تصنیف وتالیف کے میدان میں قدم رکھا ہے، اس سے نوعمر مصنف کے طرز تحریر اور انداز فکر کا بھی اندازہ ہوگا :

''کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں لیکن ایمان ویقین اور خلوص وللّٰہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم میں، کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی۔ نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم وتوکل، جوش جہاد، ایمان واحتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے۔ آدم گری، مردم سازی، اصلاح وانقلاب کے ایسے محیر العقول واقعات اصلاح وتربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔''(۱)

حضرت فرماتے ہیں :

''یہ بڑا مبارک آغاز تھا اور اس سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، مجھے خود اندازہ نہ تھا کہ یہ اقدام خود میری زندگی میں انقلاب انگیز بلکہ عہد آفریں ثابت ہوگا، اور یہ کتاب ہندوستان میں اتنی مقبول اور دینی حلقہ میں میرے تعارف اور بزرگوں کے یہاں قرب کا ذریعہ بنے گی۔ بقول شاعر

حکایت از قد آں یار دل نواز کنیم
بایں بہانہ، مگر عمر خود دراز کنیم''

''تعطیل گرما کے اختتام پر جون کی آخری تاریخوں میں ٹونک سے واپسی ہوگئی۔ راستہ میں مولانا نے ہمیں جے پور اور آمیر (۲) کے قلعہ کی سیر کرائی اور میں سیرت سید احمد شہید کی تکمیل کا عزم اور تحفہ لے کر لکھنؤ واپس ہوا۔''(۳)

حضرت سید صاحبؒ کی عقیدت ومحبت اور عظمت وبزرگی کا جو تخم بچپن میں پڑ گیا

---

(۱) سیرت سید احمد شہید اول ص ۵۴
(۲) راجگان جے پور کا قدیم پایہ تخت
(۳) کاروان زندگی اول ص ۱۷۰

www.abulhasanalinadwi.org

تھا وہ برگ و بار لاتا رہا۔ اخلاص وللّٰہیت، دینی حمیت، جوش دعوت، جذبۂ اصلاح و تجدیداور امت کا جو درد حضرتؒ کے دل میں تھا اس کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی، جب حضرتؒ کا سید صاحبؒ کی ذات اور ان کی تحریک اصلاح وتجدید سے تعارف ہوا تھا۔ اس کی تعمیر وترقی میں اگر چہ بعض دوسرے حضرات کا بھی بڑا حصہ ہے لیکن حضرت سید صاحب کی زندگی اور کارناموں کا جو اثر ابتداء میں حضرت پر پڑا تھا اس کی چھاپ ساری زندگی رہی۔

دارالعلوم میں مالی بحران اور اس کیلئے فکر اور بعض اسفار

ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے ابتدائی دورِ نظامت میں دارالعلوم کی مالی حالت بہت سقیم تھی۔ حضرتؒ کو بھی اس کی فکر تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے حکم سے حضرت اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ لوکو شاپ ریلوے کے دروازے پر جا کر کھڑے ہو جاتے اور جو لوگ ہفتہ کا چٹھا لیکر آتے ان سے چندہ لیتے، کوئی چار آنہ دیتا تو کوئی آٹھ آنہ، اس پر بھی دو دو، تین تین مہینہ کی تنخواہیں قرض ہو جاتیں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ڈاکٹر صاحبؒ ہی کی ہدایت پر اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کی سر پرستی میں یکم مئی ۱۹۳۷ء کو ایک وفد مدراس کے لئے روانہ ہوا، حضرت بھی اس میں شامل تھے۔ بھوپال، ناگپور ہوتا ہوا یہ وفد مدراس پہنچا۔ ناگپور میں تو کچھ کامیابی ہوئی، لیکن مدراس میں جو اس سفر کی اصل منزل تھی، توقع کے مطابق کامیابی نہ ہوئی اور مختصر قیام کے بعد یہ وفد واپس ہوا۔ حضرت فرماتے ہیں :

''اہل مدراس کو اس وفد کی آمد کا علم زیادہ نہیں ہوا، اور انھوں نے اس کا کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا، افسوس ہے کہ ان کو مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ جیسے جلیل القدر عالم ومحدث کے اس شہر میں تشریف لانے کی اہمیت بھی زیادہ معلوم نہیں ہوئی جو اپنی علمی و اخلاقی بلندی اور طویل خدمت حدیث کے علاوہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے براہ راست ارادت واجازت

www.abulhasanalinadwi.org

کی نسبت رکھتے تھے۔''(۱)

حضرت تھانویؒ کی لکھنؤ تشریف آوری اور انکی مجالس میں شرکت

اگست ۱۹۳۸ء کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے، چالیس روز قیام فرمایا، ڈاکٹر صاحب التزاماً ظہر اور عصر بعد کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور حضرت کو بھی پابندی سے اپنے ساتھ لے جاتے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں :

''قسمت سے اس وقت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا رسالہ ''القول المنصور'' زیر طبع تھا، اور مولانا کی توجہ ودلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا، اس میں طویل طویل عربی کی عبارتیں تھیں، وصل بلگرامی صاحب نے اس کی تصحیح ومقابلہ کا کام میرے سپرد کر دیا، اس تقریب سے مزید قرب وحضوری کا موقع ملا۔''(۲)

۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک عصر بعد ڈاکٹر صاحبؒ سے فرمانے لگے کہ آپ کے گھر جانے کو جی چاہتا ہے۔ پھر مسجد خواص سے پاپیادہ گوئن روڈ ڈاکٹر صاحبؒ کے مکان میں تشریف لائے، مطب میں جو مکان ہی کے ایک حصہ میں تھا، کچھ دیر تشریف رکھ کر اس خصوصیت کا اظہار فرمایا جو سارے علماء ومشائخ دیوبند کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے رہی ہے۔

لاہور کا سفر اور علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات

علامہ اقبال سے تعارف وملاقات لاہور کے پہلے سفر میں ہو چکی تھی۔ حضرت نے ان کے کلام میں سے ''بانگ درا'' کا مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کی بعض نظموں کے ترجمے بھی کئے تھے، لیکن جب ان کے دوسرے کلام کے مجموعے نظر سے گزرے تو اس

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۷۳

(۲) ایضاً ص ۱۷۴

www.abulhasanalinadwi.org

نے گہرا اثر ڈالا اور ادب و شاعری و فکر کے اعتبار سے ان کی شخصیت سے حضرتؒ نے وہ اثر قبول کیا جو کسی معاصر شخصیت کا نہیں کیا تھا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں :

''سب سے بڑی چیز جو مجھے انکے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا۔ میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہیں تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تسخیر انفس و آفاق کے لئے ابھارتا ہے، جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد ﷺ کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔''(۱)

کلام اقبال سے تاثر اور سرشاری کا یہی زمانہ تھا کہ غالباً مدرسۃ البنات جالندھر کی دعوت پر حضرت نے پنجاب کا سفر کیا، اور وہاں سے لاہور تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ پھوپھی صاحبہ اور مولانا طلحہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن مولانا کی معیت میں علامہ مرحوم سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ اس کی تفصیل حضرت کی زبانی نقل کی جاتی ہے :

''۱۶؍رمضان ۱۳۵۶ھ ۲۲؍نومبر ۱۹۳۷ء کو مولانا سید طلحہ صاحبؒ کی معیت میں علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس موقع پر میرے عزیز بھائی سید ابراہیم حسنی بھی ساتھ تھے، کئی گھنٹے نشست رہی ''دل را بہ دل رہیست'' معلوم نہیں کیا بات ہے کہ علامہ مرحوم نے غیر معمولی طریقہ پر بڑا وقت دیا، باوجود علالت کے (جو آخری علالت ثابت ہوئی) ان کی طبیعت میں اول سے آخر تک بڑا انبساط اور شگفتگی رہی، ان کو طویل مرض کی نقاہت تھی، اور ان کے خادم خاص علی بخش چاہتے تھے کہ یہ مجلس برخاست ہو اور وہ آرام کریں۔ انھوں نے کئی مرتبہ آکر اس کی درخواست کی مگر ہر مرتبہ علامہ مرحوم نے اس کو نظر انداز

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۷۶

www.abulhasanalinadwi.org

کیا اور گفتگو میں منہمک رہے۔ اس موقعہ پر مولانا مدنیؒ کا تذکرہ بھی آیا، میں نے مولانا کی مدافعت اور صفائی میں کچھ عرض کیا، عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو قومیت متحدہ کی تردید میں کچھ عرصہ پہلے اپنے مشہور شعر کہہ چکے تھے، سن کر خاموش ہو گئے اور کوئی لفظ تنقید کا نہیں فرمایا۔ میں نے اس مجلس کی روئداد واپسی پر ''عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے'' لکھ کر جالندھر سے نکلنے والے رسالہ ''پیغام'' کو دے دی اور وہ اس میں شائع ہوئی، ''روائع اقبال'' اور اس کے اردو ترجمہ ''نقوش اقبال'' میں اس کا خلاصہ آ گیا ہے۔ آخر میں ہم ہی لوگوں نے مناسب سمجھا کہ اجازت لی جائے اور علامہ کو آرام کا موقع دیا جائے۔ مجھے اس کے اگلے دن سفر بھی کرنا تھا اور رمضان کا مہینہ تھا۔ ہم لوگ رخصت ہوئے۔ یہ آخری ملاقات تھی، اس ملاقات کے صرف پانچ مہینہ بعد ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو انھوں نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔''(۱)

۱۹۳۸ء کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے پٹنہ کا سفر ہوا۔ پٹنہ کے قیام کے دوران ایک دن معزز مہمانوں کو خدا بخش لائبریری مدعو کیا گیا۔ مولانا مسعود عالم صاحب کی خاص دعوت پر حضرت مولانا بھی تشریف لے گئے، مہمانوں کے سامنے لائبریری کے نوادرات رکھے گئے۔ صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی میر مجلس تھے۔ قیمتی مخطوطات پر تبصرہ بھی فرماتے جاتے تھے۔ اسی اثنا میں عصر کا وقت ہوا، لائبریری کے سبزہ زار پر جانمازیں بچھا دی گئیں، علامہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے اساطین علم کی موجودگی کے باوجود نواب صاحب نے فرمایا ''سیّد علی نماز پڑھاؤ'' اس سے نواب صاحب کے تعلق خاص کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سفر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت مولانا صادق پور بھی تشریف لے گئے جو حضرت سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز رہا تھا، اور جس نے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قربانیاں دی تھیں۔ مولانا یحییٰ علی صاحب کے فرزند مولانا محمد موسیٰ صاحب کی بھی زیارت ہوئی۔ پورے سفر میں حضرت کے مخلص دوست

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۷۸

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا مسعود عالم صاحبؒ نے رفاقت اور رہبری فرمائی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیلئے دینیات کی ایک کتاب کی ترتیب اور وہاں قیام

۱۹۳۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے بی۔اے کلاس کے لئے حضرتؒ نے وہاں کے صدر شعبہ دینیات مولانا سلیمان اشرف صاحب کی خواہش پر دینیات کی ایک کتاب تیار فرمائی، مولانا نے کتاب پسند کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کچھ عرصہ کے لئے علی گڑھ قیام ہو جائے تو اس کتاب کے سلسلہ میں کچھ تبادلۂ خیال بھی ہو، اور کہیں ترمیم واضافہ کی ضرورت ہو تو وہ کیا جا سکے۔ حضرتؒ نے اس کو منظور فرمایا اور ڈیڑھ دو مہینہ کے لئے علی گڑھ تشریف لے گئے، روزآنہ عصر بعد کی مجلس میں اس سلسلہ میں گفتگو ہوتی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں "مجھے ان کے وسیع وطویل تدریسی تجربے انکے گرانقدر مشوروں اور رہنمائی سے بڑا فائدہ ہوا۔"(۱)

اس کتاب کی تیاری پر یونیورسٹی کی طرف سے پانچ سو روپیہ اکرامیہ بھی دیا گیا جو حضرت نے قبول فرمالیا۔ کتاب کی منظوری اور اس کے اکرامیہ پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے دو خطوط میں مکرر مبارکباد دی۔

حضرتؒ اس زمانہ کے طلبہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس وقت احساس یہ ہے کہ طلباء میں تہذیب اور علماء کا احترام تھا، ایسا کم اتفاق ہوا ہوگا کہ مجھے سلام میں سبقت کا موقع ملا ہو۔"(۲)

مسلم لیگ اور خاکسار تحریک کا زور اور حضرتؒ کا اس پر تنقیدی مضمون

۳۷-۳۸ء ہی کی بات ہے، مسلم لیگ کی تحریک زور پر تھی، جمعیۃ العلماء سے اختلاف کی بنا پر لیگیوں نے علماء کو ہدف ملامت بنا رکھا تھا۔ "خاکسار تحریک" نے اس

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۸۲ (۲) کاروان زندگی اول ص ۱۸۴

www.abulhasanalinadwi.org

کو اور ہوا دی، لوگوں کی زبانیں بے لگام ہوگئیں جس کے جی میں جو آتا کہتا اور لکھتا، ان حالات کو دیکھ کر حضرت مولانا نے ''خاکسار تحریک'' کے خلاف قلم برداشتہ ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا جو الفرقان میں شائع ہوا۔ حضرت اپنے اسلوب نگارش کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''میں نے علمی انداز میں اس تحریک کا محاسبہ کیا تھا، اور خوارج اور باطنیوں کی مثال سامنے رکھ کر اس سے اس کا موازنہ کیا تھا اور ثابت کیا تھا کہ محض نظم و اتحاد، جوش و خروش، قربانی، ڈسپلن اور نظام حتیٰ کہ کثرت عبادت بھی (جو خوارج کا طرۂ امتیاز تھا) حقانیت اور مقبولیت عند اللہ کی ضامن نہیں اصل چیز صحت اعتقاد، مقصد کا درست ہونا، اور اتباع شریعت ہے۔''(۱)

اسی صورت حال میں حضرت نے سیرت سیّد احمد شہید تصنیف کی جس نے حالات کی تبدیلی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

سیرت سید احمد شہیدؒ کی طباعت اور اس کی مقبولیت

سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف کا آغاز ٹونک کے سفر میں ہوگیا تھا۔ ۱۹۳۸ء ختم ہو رہا تھا کہ یہ کتاب طباعت کیلئے تیار ہوگئی اور ۱۹۳۹ء کی ابتداء میں شائع ہوئی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس پر دل کھول کر مقدمہ لکھا جس میں سید صاحبؒ کی تحریک کا اچھوتے اسلوب میں تعارف کرایا۔ یہ مقدمہ خود سید صاحب کی تحریروں میں امتیاز رکھتا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں حضرت مدنیؒ اور مولانا عبد الماجد صاحب دریابادیؒ کے مختصر تاثرات بھی شامل ہیں۔ اس ایڈیشن کو حضرتؒ نے اپنے شفیق ماموں، مولوی حافظ سید عبد اللہ صاحبؒ کے نام معنون کیا تھا، جن کی چند مہینہ پہلے وفات ہوئی تھی۔

یہ حضرتؒ کی با قاعدہ پہلی تصنیف تھی، جو منظر عام پر آئی۔ حضرت سید صاحب کی مقبولیت عند اللہ، پھر حضرت کا سوز دروں اور اخلاص اور پھر وقت کی ضرورت کہ یہ

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۸۵

www.abulhasanalinadwi.org

کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی، عقیدت وقدر کی نگاہ سے پڑھی گئی، مسجدوں اور مجلسوں میں پڑھ کر سنائی گئی۔ حضرت فرماتے ہیں :

''گمنام ونوعمر مصنف کے نام گہرے تأثر اور اعتراف وتحسین کے ایسے خطوط آئے جو اس کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھے، بعض ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جو اسلام کی مسیحائی سے مایوس اور الحاد وکمیونزم کا شکار ہوگئے تھے، دینی رجحان اور ایمانی شعور کے بیدار ہونے کی اطلاع ملی۔'' (۱)

معاصر مشائخ، خاص طور پر مشائخ دیوبند نے اس کو قدر ومنزلت اور عقیدت کے ساتھ قبول کیا، اور یہ اس حلقہ میں حضرت کے مزید تعارف وقرب کی ایک تقریب اور ان حضرات کی خصوصی توجہ والتفات کا ایک ذریعہ بن گئی۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کو اسکا نسخہ ارسال فرمایا تو حضرت تھانویؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ :

''اس ہدیہ سے قلب پر دو اثر ہوئے، ایک مسرت کا دوسرے خجلت کا، وہ خجلت یہ کہ کتاب دیکھ کر اپنی ناکارگی سامنے آجاتی ہے کہ ہم میں نہ ہمت، نہ غیرت، بہائم کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں، بجز خواب وخور کے کوئی شغل نہیں ....اللہ تعالیٰ اپنے بزرگوں کا اتباع نصیب فرمائے۔''

حضرت تحریر فرماتے ہیں :

''اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں جب ۱۹۴۲ء کے موسم گرما میں تھانہ بھون حاضر ہوا (جب کتاب کی طباعت پر تقریباً ڈھائی تین سال گزر چکے تھے) تو میں نے دیکھا کہ مولانا کے ڈکس پر جو کہ سامنے تھا، اور جس پر آئی ہوئی ڈاک اور لکھنے کے کاغذات رکھے ہوئے تھے ''سیرت سید احمد شہید'' رکھی ہوئی تھی، چونکہ اس کی جلد پر سونے کی ڈائی تھی اور نام سونے کے پانی کی وجہ سے چمک رہا تھا، اسلئے دیکھنے میں اشتباہ نہ تھا۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ۱۸۹

مولانا عبدالباری صاحبؒ لکھنؤ سے حیدرآباد جارہے تھے، میں نے ان کی خدمت میں کتاب پیش کی، ٹرین ہی پر انھوں نے اس کا مطالعہ فرمایا اور حیدرآباد پہونچ کر حسب ذیل مکتوب تحریر فرمایا :

''عثمانیہ کالج ڈاک خانہ لالہ گوڑہ، حیدرآباد دکن

۱۲/ مارچ ۳۹ء

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سید صاحبؒ کے حالات میں آپکی کتاب سفر میں ختم کی، بلکہ کہنا چاہئے یہ سفر کاملین ایمان کی مجلس وصحبت میں تھا، اسلام وایمان انہیں بزرگوں کا تھا، باب چہارم پڑھ کر تو یہ سنگ دل بھی اپنی آنکھوں کو خشک نہ رکھ سکا جو ہمیشہ تری کو ترسا کرتی ہیں۔ واقعی مسلمانوں کے اندر ایمان کو زندہ رکھنے کے لئے ایسے ہی احوال وسوانح کی ضرورت ہے۔ **فجزاکم اللہ عن المسلمین**۔ میرے تو اس یقین کو بھی آپ کی کتاب نے اور مضبوط کردیا کہ مسلمانوں کا کام آج کی انجمن بازیوں اور انجمن سازیوں سے ہرگز نہ چلے گا، اس کا کام کسی سربکف مومن کامل فرد ہی سے چلے گا جسکے گرد خود ہی ہر خدمت وصلاحیت کے مخلصین جمع ہوجائیں گے اور ایمانیوں کی سچی انجمن وہی ہوگی۔''(۱)

علامہ سید سلیمان ندوی اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''کتاب ملی، جابجا سے پڑھی، بعض حصہ تو بہت موثر ہے۔ جن کو پڑھ کر آنکھیں پرآب ہوگئیں۔ آپ کا انداز بیان اور انشاء بھی دلپذیر ہے۔''(۲)

سید صاحبؒ کی رفاقت میں ایک تاریخی سفر

سیّد صاحب کو حضرت کے خاندان سے قدیم تعلق تھا۔ سیرت سیّد احمد شہید کے مطالعہ اور پھر اس پر مقدمہ تحریر فرمانے کے بعد وہ بہت بڑھ گیا، سیّد صاحب نے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۹۰-۱۹۱ (۲) کاروان زندگی اول ص ۱۹۰

www.abulhasanalinadwi.org

مقدمہ کے ساتھ ہی مکتوب بھی ارسال فرمایا جس میں ''سیرت'' سے اپنے خاص تاثر کا اظہار تھا اور کرنال کے ایک سفر میں رفاقت کے لئے حضرت مولانا کے انتخاب کا بھی تذکرہ تھا۔

حضرت مولانا پرانے چراغ میں اس سفر کا تذکرہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں :

''یہ میرا پہلا سفر تھا جو سید صاحب کی معیت میں ہوا۔ یہ سفر کئی حیثیتوں سے یادگار اور میرے لئے سرمایہ عزت وافتخار تھا۔ سید صاحب کے پایہ کے ایک عالم ومحقق وادیب کی ہمہ وقت صحبت، دینی وعلمی مرکزوں کا سفر، تاریخی مقامات اور آثار قدیمہ کی سیر، بڑے بڑے اہل علم وفضل سے ملاقات۔ علمی وادبی مجلسیں ہر حیثیت سے یہ سفر میرے لئے وسیلۃ الظفر بن گیا۔''(۱)

رسالہ ''الندوۃ'' کا اجراء

رسالۃ الندوۃ دو مرتبہ جاری رہ کر بند ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں سید صاحب نے پھر اسکے اجراء کی تحریک فرمائی۔ اس کی ادارت حضرت اور مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کے سپرد کی گئی اور کچھ ہی عرصہ میں وہ ملک کا ایک سنجیدہ، باوقار، معلومات افزا، فکرانگیز، علمی ودعوتی رسالہ شمار ہونے لگا۔ اسی رسالہ میں حضرت نے مشاہیر اہل علم کی محسن کتابوں کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع فرمایا۔ جس میں اس وقت بعض کبار علماء و مشاہیر نے مضامین تحریر کئے۔ خود حضرت مولانا نے بڑا وقیع اور معلومات افزا مضمون تحریر فرمایا جو دریا بکوزہ کا صحیح مصداق ہے۔(۲) افسوس ہے کہ فروری ۱۹۴۲ء میں یہ رسالہ ملک کی ناقدری اور خریداروں کی کمی کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔

۱۹۳۸ء میں مولانا محمد ناظم صاحب ندوی بحیثیت استاد اعلیٰ ادب عربی، دارالعلوم تشریف لے آئے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان سے ایسی رفاقت رہی جو کم

---

(۱) پرانے چراغ اول ص ۲۹

(۲) سیّد احمد شہید اکیڈمی نے یہ مضمون مفید اضافوں کے ساتھ ''میری علمی ومطالعاتی زندگی'' کے عنوان سے شائع کردیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

دوستوں کے ساتھ رہی ہوگی :

''۱۹۳۹ء کو مولانا شاہ حلیم عطا سلونی کا تقرر بحیثیت استاد حدیث ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے وطن تشریف لے جانے کے بعد وہی شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ حضرت فرماتے ہیں : ''وہ سلف کے حافظہ، ذوق علمی اور شوق مطالعہ کی ایک نشانی تھے۔ ہندوستان میں امام ابن تیمیہ، ابن رجب، ابن عبدالہادی اور ابن جوزی کی تصنیفات وتحقیقات پر شائد کسی کی نظر اتنی وسیع اور گہری ہو جیسے ان کی تھی۔ مجھے تدریسی خاص طور پر تحقیقی کاموں میں شاہ صاحب سے بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی۔''(۱)

عربی زبان وادب کی نئی کتابوں کی ترتیب

ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں یہ بات بھی داخل تھی کہ نصاب تعلیم کو زمانہ اور بدلے ہوئے حالات کے جائز اور فطری تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جائے اور اس میں ایسی تبدیلی کی جاتی رہے جو زمانہ کا ساتھ دے سکے، لیکن یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ ندوۃ العلماء اپنے ابتدائی دور میں جن ناساز گار حالات سے گذرا، وہ ایسے سخت اور دشوار تھے کہ اس کو اپنی ضرورت کے مطابق جدید نصاب کی تیاری کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کا باقاعدہ آغاز دارالعلوم کے ناظم سادس مولانا حکیم سید عبدالعلی صاحبؒ کے دور میں ہوا جو قدیم وجدید کے سنگم کا بہترین نمونہ تھے، ایک طرف ندوہ اور دیوبند سے فیض یافتہ اور دوسری طرف طب جدید وطب قدیم کے علوم سے آراستہ تھے۔ وہ دور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی معتمدی کا تھا جن کا ان کو پورا تعاون واعتماد حاصل تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اس سلسلہ کی سب سے پہلے باقاعدہ کوشش فرمائی۔ جسکے نتیجہ میں مصر سے شائع شدہ زبان وادب کی بعض کتابیں داخل نصاب ہوئیں، لیکن ابھی اسکی شدید ضرورت تھی کہ زبان وادب کی ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے دینی واخلاقی اثرات بھی مرتب ہوں، اور زبان وادب کی تعلیم بھی ان کے ذریعہ سے دی جاسکے۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۹۶

حضرتؒ کو بھی شدت سے اسکا احساس تھا۔

مختارات

۱۹۳۹ء کا قصہ ہے کہ حضرت نے ڈاکٹر صاحبؒ کی اجازت سے سب سے پہلے ''مختارات'' کی تالیف فرمائی، جس میں مختلف ادوار میں نثر کے اعلیٰ ادبی نمونوں کو جمع کیا گیا ہے۔ کتاب سید صاحبؒ کی اجازت سے پہلی مرتبہ ۱۹۴۲ء میں چھپی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کو سہولت وصعوبت کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ اس کے متعدد ایڈیشن نکلے اور عالم عربی کی بعض موقر یونیورسٹیوں میں داخل نصاب کی گئی۔ خود سعودی عرب کی وزارت تعلیم نے کالجوں کے نصاب میں اس کو داخل کیا۔ نامور ادیب وانشاء پرداز شیخ علی طنطاویؒ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

> ''اگر کسی ادیب کے ذوق کی دلیل اس کا انتخاب ہے تو قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے کچھ عرصہ ہوا ادبی منتخبات اور نمونوں کے مجموعوں کو جمع کیا تاکہ ان میں سے کسی کو ثانویات شرعیہ کے طلباء کے سامنے رکھیں۔ ہماری کمیٹی کے ممبران نے (جو سب ادباء میں سے تھے) علیحدہ علیحدہ تلاش وجستجو شروع کی اور اس موضوع کی کتابوں کا جائزہ لیا، آخر میں ہم سب متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ درسی منتخبات کے مجموعوں میں سب سے بہتر ابوالحسن علی ندوی کا مرتب کردہ مجموعہ ''مختارات'' ہے جو زبان کی اصناف اور ادب کے متنوع نمونوں کا سب سے جامع مجموعہ ہے۔''(۱)

القراءة الراشدة اور قصص النبیین

مختارات کی تالیف کے بعد حضرت کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسی عربی ریڈریں تیار کی جائیں، جو ان مصری کتابوں کی جگہ لے سکیں جن پر مصری تہذیب کی

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۱۱-۲۱۲

www.abulhasanalinadwi.org

چھاپ ہے اور جو اصلاً مصری بچوں کے لئے مرتب کی گئی ہیں۔ اور دوسری طرف کامل کیلانی کی "**حکایات للاطفال**" کی جگہ جو دینی روح اور اخلاقی تعلیمات سے یکسر خالی ہیں۔ حکایت للاطفال کا ایسا سلسلہ مرتب کیا جائے جو اسکی جگہ داخل نصاب کیا جا سکے اور بچوں کے لاشعور میں ان کے ذہنوں کی دینی آبیاری کر سکے۔ اس کے لئے ایک طرف تو حضرت نے "**القراءة الراشدة**" تین حصوں میں تیار فرمائی جس میں یہ التزام کیا گیا کہ کوئی سبق کسی دینی موعظت سے خالی نہ ہو، لیکن اس طرح کہ طالب علم کو یہ محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے لادی جا رہی ہے یا کوئی خارجی انجکشن دیا جا رہا ہے۔ اور دوسری طرف "**قصص النبیین**" کا مبارک سلسلہ شروع فرمایا(۱) جس کے تین حصہ تو جلدی مکمل ہو گئے، لیکن بعد کے دو حصہ کئی سالوں کے بعد تالیف فرمائے۔ یہ دونوں کتابیں داخل نصاب ہوئیں، اور ہاتھوں ہاتھ لی گئیں لیکن ان میں خاص طور پر "**قصص النبیین**" کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت عطا فرمائی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں :

"یہ کام جو غالباً ۴۴-۱۹۴۳ء کے درمیان شروع ہوا اور اس کا سلسلہ سفر و حضر میں، ریل پر، کسی سڑک کے کنارے سواری کے انتظار میں، لاہور، سوہاوہ اور نظام الدین کے قیام میں نقل و حرکت اور انتشار کی حالت میں بھی جاری رہا، خدا کی توفیق سے مکمل ہوا۔ اس کو شروع کرنے کے بعد ایسا احساس ہوا کہ خدا نے اس کو میرے لئے ایسا آسان کر دیا ہے کہ قلم برداشتہ بے تکلف اس طرح لکھتا جاتا جیسے باتیں کر رہا ہوں۔"(۲)

مولانا عبدالماجد صاحبؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ اس کتاب کے ذریعہ بچوں کا "علم کلام" تیار ہو گیا۔

عالم عربی میں اس کتاب کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور وہاں کے نصاب میں داخل کی گئی۔

---

(۱) قصص النبیین کی تالیف میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریک کو بھی بڑا دخل تھا، جنھوں نے بذریعہ مراسلت اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی۔

(۲) کاروان زندگی ج اول ص ۲۱۶

www.abulhasanalinadwi.org

سید قطبؒ نے کھل کر اس کی داد دی اور اس کے امتیاز کو تسلیم کیا۔ وہ لکھتے ہیں

''میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں اور جن میں انبیاء کرام کے حکایات وقصص بھی شامل ہیں، خود ایک سلسلہ کتب کی ترتیب میں، میں نے شرکت کی جو ''القصص الديني للاطفال'' کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کا مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ''قصص النبيين للاطفال'' کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصے کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آ گئے ہیں جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔(۱)

''مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی''

دار العلوم ندوۃ العلماء میں درس قرآن کا سلسلہ شروع سے ہی جاری تھا اور کئی سال سے ابتدائی دس پاروں کی تفسیر حضرتؒ کے ذمہ تھی۔ ۴۰-۱۹۳۹ء کا قصہ ہے کہ حضرتؒ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ طلباء مطالعہ قرآن اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کے بہت سے مقدمات اور اصول ومبادی سے ناواقف ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ قرآن مجید سے پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ ضرورت ہے کہ ایسے مضامین تیار کئے جائیں جو اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوں۔ اس کے لئے حضرت نے ایک سلسلہ مضامین تحریر فرمایا جو قسط وار ''الندوہ'' میں شائع ہوا اور بعد میں ''مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی'' کے نام سے یہ کتاب مکتبہ اسلام سے شائع ہوئی۔ اس میں ایسے مضامین ہیں جو قرآن مجید سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے بہت مفید، ضروری اور بصیرت افروز ہیں۔

(۱) مقدمہ قصص النبیین جزء ثالث مطبوعہ دار الکتاب العربی مصر ۱۳۷۳ھ

www.abulhasanalinadwi.org

چھٹا باب

دعوتی واصلاحی کوششوں کا آغاز، دعوتِ فکر ونظر سے لیکر عملی جد وجہد تک

دعوتی واصلاحی فکر

www.abulhasanalinadwi.org

حضرتؒ کے خاندان حسنی وقطبی کی ہزار سالہ تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں اس خاندان میں مصلحین، علماء ومشائخ اور حاملین دعوت پیدا ہوتے رہے۔ اسی خاندان میں حضرت سید احمد شہیدؒ جیسا صاحب عزیمت مجدد ومجاہد پیدا ہوا جنکی مجاہدانہ و مجددانہ کوششوں نے کم سے کم برصغیر میں تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ اخیر دور میں حضرتؒ کے جد مادری حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ نے رائے بریلی اور اس کے قریبی اضلاع میں دعوتی واصلاحی کوششیں فرمائیں اور ان کے فیض یافتہ حضرت مولانا سید محمد امین صاحب نصیرآبادیؒ کی اصلاحی تحریک سے رائے بریلی سے لے کر جونپور اور اعظم گڑھ تک ایک دینی فضا قائم ہوئی۔ خود حضرت کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی صاحبؒ نے اسی فکر کے نتیجہ میں ''انجمن آل ہاشم'' کی بنیاد ڈالی تھی جس کا بنیادی مقصد ہی خاندان میں دعوت واصلاح کا کام تھا، اسی کی خاطر انھوں نے تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم سے وابستگی اختیار کی۔ حضرت کے اندر اس کی چنگاریاں موجود تھیں، اور خاندانی وموروثی طور پر اسکے اثرات زندگی پر نمایاں تھے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ دار العلوم میں تدریس کے دوران دار العلوم کی سطح پر وہاں کے

طلبہ میں دینی ذوق پیدا کرنے اوران کی صحیح دینی اور فکری رہنمائی کرنے کا حضرت کو ہمیشہ اہتمام رہا، پوری دلسوزی کے ساتھ اس کی کوششوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن تدریسی دور کے آخری سالوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اس محنت کے بعد جن نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے وہ سامنے نہیں آتے، اور بڑی حد تک یہ کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں طبیعت لگے بندھے نظام سے عاجز آنے لگی۔ حضرت اس کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں:

''دارالعلوم کی تدریس کے آغاز (۳۴ء سے ۳۹ء) تک میری سب سے بڑی لذت اور دلچسپی طلباء کے پڑھانے، ان میں قرآن مجید اور عربی زبان وادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں تھی، ذہین اور ذی استعداد اور سعادت مند طلباء سے ایسا تعلق پیدا ہوجاتا تھا، اوران کے پڑھنے پڑھانے میں ایسی قلبی مسرت اور روحانی طاقت محسوس ہوتی تھی کہ بڑی تعطیلات کے آنے پر بجائے خوشی کے رنج اور فکر پیدا ہوتی تھی، اوران کی جدائی کا صدمہ اور طویل خلا کا احساس تکلیف دیتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آخری دنوں میں یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ جس دلسوزی اور جانفشانی کے ساتھ تدریس کی خدمت انجام دی جاتی ہے، طلباء کی علمی، اخلاقی و دینی اصلاح وترقی کی کوشش کی جاتی ہے اور جس طرح سبق بالخصوص قرآن مجید کے درس میں بعض اوقات کلیجہ نکال کر رکھ دیا جاتا ہے، جس طرح خدا کی طرف سے اس کام میں مدد ہوتی ہے اور مضامین کا ورود ہوتا اس کے بقدر طلباء پر (باستثنائے چند) فائدہ مرتب ہوتا نظر نہیں آتا، بعض مرتبہ خیال ہوتا تھا کہ آج کے درس سے شاید درودیوار پر بھی نشان بن گئے ہوں، لیکن نوجوان طلباء کے دل ودماغ پر اس کے نقوش مرتسم نظر نہیں آتے تھے۔

اس سے ایک طرف یہ احساس بیدار ہونے لگا کہ خارجی ماحول کا فساد، عام فضا میں پھیلے ہوئے انتشار انگیز وتخریبی اثرات (جو مطالعہ کی کتابوں، لٹریچر

www.abulhasanalinadwi.org

اوراخبارات، ناولوں اور ترقی پسند لادینی ادب کے ذریعہ آنکھوں اور کانوں کے راستے سے طلباء کے دل ودماغ میں نفوذ کرتے رہتے ہیں) اور جتنی صالح خوراک طلباء کو درجے میں دی جاتی ہے، اس سے کئی گنا انکے اندر مختلف راستوں سے پہونچ جانے والا زہر ان کوششوں کو بار آور نہیں ہونے دیتا۔"(۱)

آغاز تدریس کے تین چار سال بعد ہی حضرتؒ نے بعض ان اہم کتابوں کا مطالعہ فرمایا جن سے فکر ونظر میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور عالم اسلام کے مسائل اور تحریکات سے دلچسپی پیدا ہونا شروع ہوئی، جن میں خاص طور پر "**حاضر العالم الاسلامی**" اور اس پر امیر شکیب ارسلان کے طاقتور حواشی، عبدالرحمٰن الکواکبی کی "**موتمر أم القری**" قابل ذکر ہے۔ ان میں محبّ الدین الخطیب کے ہفتہ وار رسالہ **الفتح** کو بھی بڑا دخل ہے جس کے مضامین بڑے طاقت ور اور ولولہ انگیز ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی جنگ آزادی اور سیاسی تحریکات پر لکھی ہوئی کتابوں کا بھی اسی زمانہ میں مطالعہ فرمایا اور بعض ان انگریزی مآخذ کا بھی براہ راست یا ترجمہ کی مدد سے مطالعہ کیا جن کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں کہ

"ان کتابوں نے میرے بعد کی تحریروں اور مضامین کے لئے مستحکم بنیادی اور قیمتی مواد فراہم کیا نیز مغربی تہذیب اور نظام حیات کے تشکیلی عناصر اور پس منظر کو سمجھنے میں مدد دی، ان میں خاص طور پر "ڈریپر" کی کتاب (Conflict Between Religion & Science) کا ترجمہ "معرکہ مذہب وسائنس" مولانا ظفر علی خاں کے جادو نگار قلم سے، لیکی کی (History of European Morals) کا شستہ ورفتہ ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے قلم سے، گبّن (**Gibbon**) کی شہرۂ آفاق کتاب Decline and Fall of Roman Empire کے بعض حصوں کا

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۲۸-۲۲۹

www.abulhasanalinadwi.org

براہ راست مطالعہ اور ہوفڈنگ کی ''تاریخ فلسفہ جدید'' پڑھی۔"

مزید فرماتے ہیں :

''اسی زمانہ میں نومسلم فاضل محمد اسد صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب Islam at the Crossroads تقریباً سبقاً سبقاً پڑھی اور ان کے پراز اعتماد اقدامی طرز تحریر، مغربی تہذیب کے پوسٹ مارٹم اور اسکے اور اسلامی تہذیب کے تضاد، پھر سنت کی طاقتور حمایت سے دل و دماغ متاثر ہوئے۔ ان سب چیزوں نے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموج پیدا کر دیا۔''(۱)

مولانا محمد منظور نعمانیؒ صاحب سے تعارف وارتباط اور پنجاب و بلوچستان کا ایک تاریخی سفر

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ سے حضرتؒ کی سب سے پہلی ملاقات اس زمانہ میں ہوئی جب مولانا دارالمبلغین میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حاجی محمد سعید صاحب نصیر آبادی نے جن کا ساتھ دارالعلوم دیوبند کے قیام میں رہا تھا ایک دعوت میں مولانا سے ملایا تھا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ''ابتدائی تعارف اور ملاقاتوں کے بعد متعدد مشترک باتوں کی وجہ سے بہت جلد مناسبت و ربط پیدا ہو گیا۔(۲)

اسی زمانہ میں سیرت سید احمد شہیدؒ تازہ تازہ چھپ کر آئی، حضرتؒ نے اس کا ایک نسخہ مولانا کو بھی بھیجا، مولانا نے اس پر بڑے تاثر کا خط لکھا، اس میں یہ بھی لکھا کہ عملی طور پر کچھ کرنے کا ارادہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ حضرت نے اس کا اثبات میں جواب دیا تو مولانا خود رائے بریلی تشریف لائے۔ مولانا اس زمانہ میں چاہتے تھے کہ خاکسار تحریک کے متوازی کوئی ایسی عملی تنظیم بنائی جائے جس سے نوجوانوں کو مربوط کیا جا سکے اور اس طرح ''خاکسار تحریک'' کے فتنہ سے لوگوں کو بچایا جا سکے۔ مولاناؒ نے حضرتؒ سے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا اور یہ بھی اصرار کیا کہ حضرت اس کی قیادت

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۳۰-۲۳۱ ملخصاً
(۲) کاروان زندگی اول ص ۲۳۴

قبول فرمائیں، حضرت نے صاف لفظوں میں معذرت فرمائی اور اس کام کے لئے حاجی عبدالواحد صاحب (۱) کا نام پیش کیا اور فرمایا کہ

''وہ صاحب عزیمت شخص ہیں، انگریزی پر انہیں پوری قدرت ہے اور ایسی تحریک کے قائد کے لئے اس کی ضرورت بھی ہے، ضروری حد تک دین کا علم رکھتے ہیں، صحیح العقیدہ اور صحیح الفکر شخص ہیں، اپنے بزرگوں سے ان کا تعلق ہے اور عرصہ سے دین وملت کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں، لیکن وہ بلوچستان کے محکمہ تعلیم سے منسلک ہیں اور یہاں سے بہت دور فورٹ سینڈیمن میں ان کا قیام ہے، ان کو آمادہ کرنا ہوگا۔'' (۲) مولانا منظور نعمانی صاحبؒ پر اس فکر کا ایسا غلبہ تھا کہ انھوں نے سفر کا ارادہ فرمالیا، اور حضرت کو بھی رفاقت پر آمادہ کرلیا، اگست ۱۹۳۹ء کو روانگی ہوئی، پہلی منزل لاہور تھی، حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے یہاں قیام رہا۔ اسی سفر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ لاہور سے کوئٹہ ہوتے ہوئے فورٹ سینڈیمن پہنچے۔ حاجی عبدالواحد صاحب وہاں ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے، ان سے ملاقات ہوئی، اور یہ طے ہوا کہ پہلے ان مراکز کا دورہ کرلیا جائے جہاں اجتماعی وتنظیمی کام پہلے سے ہورہا ہے، اگر ان میں سے کسی تحریک، دعوت یا تنظیم سے ذوقی اتحاد اور عملی شرکت ممکن ہو، تو اسی کو مفید مؤثر بنانے کی کوشش کی جائے اور اس کا تعاون کیا جائے۔ اس لئے سہارنپور، رائے پور، دہلی، دیوبند، تھانہ بھون کے مراکز کا دورہ طے کرلیا گیا۔

دینی مرکزوں کا دورہ اور حضرت رائے پوریؒ سے پہلی ملاقات

۱۹۳۹ء کی آخری تاریخوں میں اس تاریخی سفر کا آغاز ہوا۔ سہارنپور اس سفر کی پہلی منزل تھی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب تشریف نہیں رکھتے تھے اسلئے کچھ دیر سہارنپور میں مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم کے یہاں قیام

(۱) لاہور کے قیام میں حاجی عبدالواحد صاحب سے تعارف ہوا تھا۔ حضرت کے شاہی مسجد میں مسلسل تین ماہ کے قیام میں انہوں نے حضرت سے باقاعدہ عربی پڑھی تھی۔

(۲) کاروان زندگی اول ص ۲۳۵-۲۳۶

www.abulhasanalinadwi.org

کر کے رائے پور روانگی ہوئی۔ حضرتؒ رائے پور حاضری کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''پانچ میل کی مسافت پیادہ پا طے کر ہم لوگ رائے پور کی خانقاہ اس وقت پہنچے جب حضرت کھانے سے فارغ ہوچکے تھے، اور آرام کے لئے تشریف لے جانے والے تھے۔ حضرت نے ہم لوگوں کا پرتپاک خیرمقدم فرمایا اورسابقہ تعارف کے بغیر بڑی گرم جوشی اور بزرگانہ شفقت سے ملے۔ حضرت کے خادم خاص بھائی الطاف کا بیان ہے کہ حضرت نے مجھ سے معانقہ کیا تو فرمایا ''میں تو آپ کا منتظر ہی تھا'' لیکن یہ بات مجھے یاد نہیں۔ رائے پور میں ایک شب و روز قیام رہا، حضرت نے پوری شفقت اور ذرہ نوازی فرمائی۔ جب ہم لوگوں نے اپنے عزائم کا ذکر کیا تو اپنی معذوری اور ضعیف العمری کے باوجود دعا اور ممکن تعاون کا اطمینان دلایا، یہ بھی فرمایا کہ یہ جگہ بھی حاضر ہے۔ اپنے ایک معتمد خاص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نومسلم رائے پوری سے بھی ملایا جو بعض تنظیمی کوششیں کرچکے تھے لیکن مشورہ دیا کہ پہلے ہم لوگ نظام الدین جاکر حضرت مولانا الیاس صاحبؒ سے ملیں (جن کو حضرتؒ، حضرت دہلوی کے نام سے یاد فرماتے تھے۔) اور ان کے عظیم الشان تبلیغی کام کو دیکھیں اور اگر شرح صدر ہو تو اس میں شریک ہوں۔''(۱)

خانقاہ رائے پور اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ سے اپنے تأثر کا اور ان کے امتیازی وصف کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''شہر سہارن پور سے ۲۰-۲۱ میل کے فاصلہ پر کوہ شوالک کے دامن میں رائے پور نامی ایک قصبہ ہے، جو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر مدظلہ (خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ) کی اقامت گاہ ہے۔ ہم نے ایک دن اور دو راتیں بڑے حظ و کیف کے ساتھ اس گمنام یا کمنام خانقاہ میں

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۳۸-۲۳۹

www.abulhasanalinadwi.org

گذاریں اور ان زندہ خانقاہوں کا نمونہ دیکھا جو اس عہد انقلاب میں بھی مسلمانوں کے لئے مفید اور بعض دینی و اصلاحی وجوہ سے ضروری ہیں۔ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب ایک باخبر، روشن ضمیر، اور روشن دماغ، جامع عالم اور شیخ طریقت ہیں اور زمانہ حاضر کے ان مخصوص بزرگوں اور روحانی پیشواؤں میں سے ہیں جن کے انفاس و برکات اور رہنمائی کی مسلمانوں کو ضرورت ہے، مولانا کی حالات زمانہ سے مکمل باخبری، سیاسی فہم وفراست، دینی و دنیوی جامعیت اور جذبہ عمل سے اس خانقاہ میں سنوسی خانقاہوں کی جھلک پیدا کردی ہے اور مولانا کے کریمانہ اخلاق، بزرگانہ شفقت، تواضع اور مسافرنوازی نے مشائخ سلف کے اخلاق کریمانہ کی (جن میں صاحب خلق عظیم کا پرتو ہوتا ہے) یادتازہ کردی۔"(۱)

رائے پور سے دہلی کا سفر ہوا، حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی تحریک و دعوت کا تذکرہ پہلے کانوں میں پڑ چکا تھا، اور سفر سے چند ماہ قبل مولانا مودودی نے نظام الدین کے ایک سفر کے بعد "ایک دینی تحریک" کے عنوان سے بڑا طاقتور اور موثر مضمون لکھا تھا، جو ماہ شعبان ۱۹۳۸ء کے "ترجمان القرآن" میں شائع ہوا تھا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ اس مضمون کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے تھے۔" اس کے علاوہ بھی بعض قریبی اہل تعلق سے حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کا نام اور ان کی تبلیغی کوششوں کا ذکر آچکا تھا، جن میں خاص طور پر الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری قابل ذکر ہیں، جو مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ کے بڑے عزیز ومحبّ دوست تھے۔

دہلی پہونچ کر مولانا محمد منظور نعمانیؒ اہلیہ صاحبہ کی شدید علالت کی وجہ سے بریلی تشریف لے گئے۔ حضرت اور حاجی عبدالواحد صاحب نظام الدین اور میوات حاضر ہوئے۔ مولانا الیاس صاحب سے تعلق اور جماعت سے وابستگی کی تفصیلات انشاء اللہ مستقل باب میں آئیں گی، حضرت کے الفاظ میں وہ ایک مستقل دور کی کہانی اور تاریخ

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۴۰

کا ایک اہم باب ہے۔ وہاں سے واپسی پر حضرت نے اپنے ایک مضمون میں جس تاثر کا اظہار فرمایا اس کا ایک اقتباس یہاں پر نقل کیا جاتا ہے :

''اس سفر میں ہم نے جو سب سے حیرت انگیز چیز دیکھی اور جس سے ہم کو لازوال مسرت اور شادمانی حاصل ہوئی وہ میوات کے علاقہ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا تبلیغی کام اور نظام ہے، ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بیسویں صدی عیسوی کا منظر نہ تھا بلکہ پہلی صدی ہجری کا نقشہ معلوم ہوتا تھا، عہد بعثت کی اصلاح و انقلاب حال اور قرن اول کے نومسلموں کے جوش و جذبہ اور تبلیغ کے ذوق وشوق کے جو قصے ہم نے سیرت اور تاریخ اسلام میں پڑھے تھے۔ گوڑ گانو کی جامع مسجد اور قصبہ نوح اور شاہ پور کی گلیوں میں اس کا ایک نمونہ دیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ چشتی درویش، اور مجددی عالم، قدیم غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اشاعت اسلام اور حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت شہید رائے بریلویؒ کی حفاظت اسلام کی سنت زندہ کر رہا ہے۔''(۱)

''جماعت اسلامی'' میں شرکت اور اس سے علاحدگی

مولانا مودودیؒ سے پہلی ملاقات لاہور کے ایک سفر میں ہو چکی تھی، ان کے مضامین سے واقفیت اور مطالعہ کا سلسلہ بھی ۳۵-۱۹۳۴ء سے جاری تھا۔ حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ''میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تاثر اور وابستگی کی بنیاد مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے جو انھوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات اور موجودہ مادی نقطۂ نظر کے خلاف لکھے تھے۔''

۱۹۴۱ء کی ابتدا میں وہ لکھنؤ تشریف لائے اور دارالعلوم کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی تحریک پر حضرتؒ باقاعدہ جماعت

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۴۱

www.abulhasanalinadwi.org

کے رکن بنے اور حلقۂ لکھنؤ کے ذمہ دار قرار پائے۔(۱) اسکے بعد مولانا کا ایک سفرِ لکھنؤ اور ہوا جس میں انھوں نے حضرت کی خواہش پر دار العلوم میں ''نیا تعلیمی نظام'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ۱۹۴۲ء میں حضرتؒ نے جماعت کے جلسہ عاملہ میں شرکت کے لئے لاہور کا سفر کیا اور اسی سال فروری میں دہلی میں عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں حضرتؒ شریک ہوئے۔ وہاں سے مولانا کے ساتھ ہی حضرت علی گڑھ تشریف لے گئے اور ایک دو روز ساتھ ہی قیام رہا۔ حضرت فرماتے ہیں :

''میں نے یونیورسٹی کے حلقہ میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ کیا جو اس وقت کے حالات اور مسلمان نوجوانوں کی ذہنی بے چینی اور روحانی پیاس کا عین تقاضا تھا۔''(۲)

تقریباً تین سال حضرت باقاعدہ جماعت سے وابستہ رہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ

''اس عرصہ میں میرے اندر تین احساسات پیدا ہوئے جنھوں نے مجھے جماعت سے وابستگی اور انتساب پر از سرِ نو غور کرنے پر مجبور کیا۔

ایک یہ کہ میں دیکھتا تھا کہ مولانا کی شخصیت کے بارے میں جماعت کے افراد میں بڑا غلو پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ وہ انکے علاوہ کسی اور مفکر، مصنف اور داعی کے متعلق بلند خیال قائم کرنے، اس پر اعتماد کرنے اور ان کی تحریروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان میں تنقید کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے اور علماء و دینی حلقوں کے بارے میں ان کی زبانیں بے باک ہو رہی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان میں دین کے ذوق و عمل میں کوئی ترقی، اصلاح

---

(۱) ڈاکٹر صاحب کو حضرتؒ کی جماعت اسلامی سے وابستگی پر انشراح شروع سے نہیں تھا اور انہوں نے اسی وقت یہ بلیغ جملہ فرمایا تھا کہ ''مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں مجھے تجدد کی بو محسوس ہوتی ہے'' اسی لئے علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی تردد تھا۔

(۲) کاروان زندگی اول ص ۲۴۳

نفس کا کوئی نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی تھی۔"(۱)

مزید فرماتے ہیں :

"پھر مولانا الیاس صاحبؒ کی ملاقات، وہاں کی آمد و رفت اور ان کے حالات سے جتنا تاثر بڑھتا گیا جو مجھے مزاج نبوت، سیرت طیبہ اور دین کی دعوت کی روح سے قریب تر نظر آئے، میری ذہنی کشمکش بڑھتی گئی، یہاں تک کہ خود میں نے اس کی اطلاع مولانا کو دی۔ اور مجھے مولانا نے یکسو ہو جانے کا مشورہ دیا۔"

حضرتؒ مزید فرماتے ہیں : "علاحدگی کے بعد بھی میرے تعلقات دو قدیم شریف دوستوں کے ساتھ تعلقات تھے، جن میں بنیادی خیالات کا اختلاف اور طریق کار کا فرق پایا جاتا تھا۔"(۲)

جامعہ ملیہ میں مذہب و تمدن پر مقالہ

سیرت سید احمد شہید کی طباعت پھر اس کی اشاعت و مقبولیت کے نتیجہ میں کم از کم ہندوستان گیر پیمانہ پر حضرتؒ کی شہرت ہو چکی تھی۔ اس زمانہ کے کبار علماء و مشائخ نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اس وقت عمر صرف چھبیس، ستائیس سال کی تھی۔ اس نوعمری میں ایسی محبوبیت کم ہی کسی کے حصہ میں آئی ہوگی۔

اسی مقبولیت و شہرت کا اثر تھا کہ جامعہ ملیہ میں شعبہ دینیات کی طرف سے مقالہ پڑھنے کی پیش کش ہوئی، اور اس کے لئے خود صدر شعبہ مولانا خواجہ عبد الحی صاحب فاروقی نے اصرار کے ساتھ دعوت بھیجی جو خود حضرتؒ کے باقاعدہ استاذ بھی رہ چکے

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۴۳-۲۴۴ ملخصاً۔ اس سلسلہ میں حضرتؒ نے "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی جس میں مولاناؒ کی دعوتی خدمات کے اعتراف کے ساتھ انکی فکری لغزشوں اور تحریری فروگذاشتوں کو مثبت اور معروضی انداز میں پیش فرمایا ہے۔

(۲) ایضاً ص ۲۴۵ ملخصاً

www.abulhasanalinadwi.org

تھے۔ ۱۹۴۲ء کا آغاز تھا کہ حضرتؒ نے مذہب وتمدن کے عنوان سے وہاں ایک موقر مجلس میں مقالہ پیش فرمایا(۱)۔ یہ مقالہ علمی استقرائی انداز میں لکھا گیا تھا اور مغربی مآخذ کو سامنے رکھ کر اس میں انسانوں کے خود ساختہ تمدنوں کی حقیقت دو، دو چار کی طرح واضح کردی گئی تھی۔ پھر وحی الٰہی سے ماخوذ تمدن وطریقۂ حیات اور انبیاء کرام کی تعلیمات، اسلامی زندگی کی خصوصیات، اور دنیا کے تمدن پر اس کے مثبت اثرات کا ذکر ایسے اسلوب میں کیا گیا تھا جس سے ایک صاحب علم اور صاحب فکر کا متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔

اس موقر مجلس میں شیخ الجامعۃ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے علاوہ متعدد فضلاء و دانشور موجود تھے۔ جلسہ کی صدارت مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے فرمائی۔

خوددار ضمیر اور حساس دل پر ایک چوٹ

حضرت مولاناؒ کی ایک بڑی امتیازی صفت ان کی قوت ادراک اور بصیرت و حساسیت ہے۔ عمر کے اس مرحلہ میں جس کو مراہقت فکری کا زمانہ کہا جاتا ہے، مولانا کے یہاں ایسی فکری بصیرت وپختگی نظر آتی ہے کہ مشکل سے اس کی مثال ملے گی۔

۱۹۴۲ء میں جب کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑو'' کا نعرہ دیا تو عمومی طور پر اور عوامی سطح پر ہندو اکثریت سامنے آئی، مسلمان علماء نے تو بلاشبہ اس میدان میں مساویانہ بلکہ قائدانہ کردار ادا کیا لیکن عوام خاموش تماشائی بنے رہے۔ وہ برادران وطن کی قربانیوں پر ہنستے اور ان کی مصیبتوں پر خوش ہوتے، حضرت مولاناؒ پر ان حالات کا بڑا اثر پڑا، انہوں نے شدت کے ساتھ یہ بات محسوس کی کہ جس طبقہ کی طرف سے قربانیاں زیادہ ہونگی کل آزادی کے بعد اسی طبقہ کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہوگی، اور اگر مسلمانوں نے اس سلسلہ میں کوتاہی کی تو کل وہ اس سرزمین پر سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہ رہیں گے۔

---

(۱) مذہب وتمدن کے نام سے یہ کتاب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام نے شائع کی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اپنے طور پر حضرت مولانا نے یہ فکر عام کرنے کی کوشش کی اور لوگوں کو توجہ دلائی، اسی زمانہ کے اپنے درد و فکر کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''مسلمانوں کے اس طرز عمل سے میرے حساس دل کو چوٹ لگی کہ ہندوستان کی سلطنت انگریزوں نے مسلمانوں سے ہی چھینی تھی، وہی انگریزوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں قائدانہ مقام رکھتے تھے، انہیں کو برطانوی اقتدار اور غلبہ سے (جو ایک جاہلی تہذیب، لادینی نظام تعلیم اور ایسے مادی فلسفۂ زندگی کا حامل ہے جس کا اسلام سے پورا تضاد ہے) اس وقت سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے، انہیں مغربی طاقتوں نے جن کا سب سے بڑا نقیب اور نمائندہ برطانیہ ہے، خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کیا، اور تمام عرب و مسلم سلطنتوں کو اپنا غلام یا دست نگر بنایا، اس لئے ان کے اصل حریف و رقیب مسلمان تھے اور انہیں کو اصل میں میدان میں آنا اور قائدانہ کردار ادا کرنا چاہئے تھا کہ قومیں اور ملتیں، دلیری اور جان بازی، قربانی و خطر پسندی اور قائدانہ کردار ادا کرنے ہی سے عزت و سرفرازی حاصل کرتی ہیں۔''(۱)

یہ ایک عمومی صورت حال تھی مگر مخصوص طور پر بقول حضرتؒ کے علماء نے اس میں نہ صرف یہ کہ حصہ لیا بلکہ قائدانہ کردار ادا کیا جس کے نتیجہ میں آج مسلمان اپنے دینی اداروں کی آزادی، پرسنل لاء کے تحفظ، اردو زبان اور دینی تعلیم کی بقا و حفاظت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

ادارہ ''تعلیمات اسلام'' کا قیام اور درس قرآن کا سلسلہ

۱۹۴۳ء میں مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندویؒ نے بعض مجبوریوں کے پیش نظر دار العلوم سے علاحدگی اختیار کی۔ مولانا اپنے طور پر لکھنؤ کے ایک محلّہ میں درس قرآن دیتے تھے جس میں شہر کے بعض با اثر اور سربراہ آوردہ لوگ شریک ہوتے

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۰

www.abulhasanalinadwi.org

تھے۔ان کو جب مولانا کی یکسوئی کا علم ہوا تو انھوں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''انجمن تعلیمات اسلام'' کی بنیاد ڈالی۔اس ادارہ میں ہفتہ واری درس قرآن کا انتظام کیا گیا اور حضرت نے اس کی ذمہ داری قبول فرمائی۔حضرت اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''اس درس میں (جس میں اپنے استاد اور مربی روحانی مولانا احمد علی صاحبؒ کے درس کے اس اصلاحی ودعوتی طرز کو اختیار کیا گیا تھا جو وہ تعلیم یافتہ طبقہ کو دیتے تھے) تعلیم یافتہ طبقہ اور اعلیٰ مسلمان عہدیداروں اور دینی ذوق رکھنے والے مسلمانوں کا ایسا رجوع ہوا کہ درس کے وقت اگر لکھنؤ میں کسی دینی ذوق رکھنے والے مسلمان افسر یا اعلیٰ عہدیدار کو تلاش کیا جاتا تو شاید جواب یہی ملتا کہ وہ اس وقت ادارہ تعلیمات اسلام کے درس قرآن میں ہوں گے۔'' اس کا سلسلہ ۴۷ء کے بعد تک جاری رہا اور مرجعیت بڑھتی گئی۔''

۱۹۴۸ء کو اسی ادارہ کی طرف سے ''تعمیر'' کے نام سے ایک دینی دعوتی وفکری رسالہ کا اجراء عمل میں آیا۔مولانا قدوائی اور حضرتؒ ہی اس کے مدیر تھے۔اس رسالہ میں حضرت نے بڑے فکر انگیز اور ایمان افروز مضامین تحریر فرمائے۔اسی رسالہ میں ''ہماری قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو'' کے عنوان سے حضرتؒ نے ایک ناقدانہ مضمون تحریر فرمایا جس میں کھل کر مسلمانوں کی عمومی کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی تھی اور مسلمانوں کی بے حسی پر شکوہ کیا گیا تھا جس کی چوٹ حضرت اپنے حساس دل پر محسوس کر رہے تھے۔یہ مضمون رسالہ کی شکل میں شائع ہوا اور حقیقت پسند اسلامی حلقوں میں قدر واعتراف کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

اس ادارہ کے مقاصد میں سے قرآن مجید کے ذریعہ کم سے کم قواعد کی مدد سے عربی سکھانا بھی تھا۔اس کے لئے بھی حضرت نے بعض رسائل تیار فرمائے تھے۔جس میں اسلامی تاریخ کے موثر واقعات کو آسان سلیس عربی میں قلمبند کیا گیا ہے۔بعد میں یہ مجموعہ بعض اور دوسرے مضامین کے ساتھ ''قصص من التاریخ الاسلامی'' کے

www.abulhasanalinadwi.org

نام سے شائع ہوکر مدارس میں داخل نصاب ہوا۔

عربی زبان میں دعوتی وفکری مضامین کا آغاز

اب تک عربی میں حضرت کے قلم سے خالص ادبی مضامین نکلے تھے۔ "دعوتان متنافستان" کے مضمون سے حضرتؒ نے ان مبارک، مفید اور انقلاب انگیز مضامین کا سلسلہ شروع فرمایا جن کی چھاپ پورے عالم اسلام پر پڑی۔ یہ دعوتی و فکری اسلوب جس میں درد و تاثیر بھی ہو اور زور قلم بھی، زبان کی حلاوت اور سلاست بھی ہو، اور دعوت کی طاقت بھی، اس کا کوئی نمونہ حضرت کے سامنے نہیں تھا، لیکن یہ وقت کی ضرورت تھی اور پورا عالم اسلام ایسے طاقتور اور فکر انگیز مضامین کا پیاسا تھا۔ اس وقت عربی میں سوائے علمی یا خالص ادبی یا تنقیدی اور تحلیلی مضامین کے دوسرا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ اخوان تحریک کے اثرات بھی اس وقت تک محدود تھے اور اسلامی مفکرین میں سے عربوں میں اس وقت تک کسی کا غلغلہ بلند نہیں ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو جس طرح عالمی سطح پر حضرتؒ سے اصلاحی وتجدیدی کام لینا تھا محض توفیق الٰہی تھی کہ حضرتؒ نے یہ اسلوب اپنے طور پر اختیار فرمایا۔ حضرت کی زبان میں بقول شاعر ؎

نے پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

یہ ایک ایسا نیا طرز تحریر اور اسلوب تھا جس میں خود اعتمادی، جوش دروں اور حرارت ایمانی کے ساتھ استدلال کی قوت، قلم کی متانت اور زبان کی حلاوت بھی تھی۔ توفیق الٰہی سے یہ ڈاکٹر صاحبؒ کی تربیت اور عربی النسل اساتذہ کی تعلیم وتوجہ اور خصوصی شفقت کا فیض تھا کہ ہندوستان کے عجمی ماحول میں رہ کر عربی زبان پر حضرت مولانا کو ایسی قدرت اور روانی حاصل ہوئی کہ عرب بھی ان کی تحریریں پڑھ کر مسحور ہوئے اور داد دینے پر مجبور ہوئے۔

حضرتؒ خود تحریر فرماتے ہیں :

www.abulhasanalinadwi.org

''میں نے جب یہ سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت اپنے اس طرز تعلیم اور عربی زبان و ادب کے اس نصاب اور ماحول کی قدر آئی جو ہندوستان میں ایک نیا تجربہ تھا اور جس کی بظاہر اس وقت کوئی ضرورت اور معقولیت سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک ایسے دور میں کہ ہندوستان کے نہ عالم عربی سے سیاسی، ثقافتی، اور معاشی روابط تھے، نہ آمد و رفت کی سہولتیں تھیں، نہ وفود کے تبادلہ نہ سفارت خانوں کے قیام اور ممالک عربیہ کی دانش گاہوں سے ربط و تعلق کا دور شروع ہوا تھا، ایک ایسے خاندان کے (جس میں اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا رواج تھا) فرد کو عربی زبان و ادب کی اس پیمانہ اور معیار پر تعلیم دی جائے اور اس کو انشاء و تحریر و گفتگو کی مشق کرائی جائے جس سے مدارس عربیہ بھی نا آشنا تھے اور دینی و علمی حلقے نہ صرف بیگانہ بلکہ اس کو اضاعت وقت کا مرادف سمجھتے ہوں گے، عربی زبان کو صدیوں سے یہاں صرف دینی کتب کے سمجھنے سمجھانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ جب میں نے دعوتی تحریر کا یہ کام شروع کیا اور پھر جب تقدیر الٰہی نے ۱۹۵۱ء میں مشرق وسطیٰ کے سفر کا سامان کیا تو اس وقت اپنے مربی اور ولی نعمت مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کی فراست اور دور بینی اور دینی بصیرت کی قدر آئی کہ انھوں نے میرے لئے یہ راستہ انتخاب کیا اور مجھے تعلیم و تعلم کے مروجہ طریقوں سے الگ کر کے عربی زبان و ادب اور عربی تحریر و انشاء اور خطابت کے ذریعہ عالم عربی کو خطاب کرنے اور ان کو ''بضاعتکم رُدت إلیکم'' کہہ کر جھنجھوڑنے اور ان کے جذبات خوابیدہ کو بیدار کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا موقعہ دیا۔''(۱)

اس سلسلہ کا دوسرا تفصیلی مضمون ''المد و الجزر فی تاریخ الاسلام'' کے عنوان سے لکھا گیا جو کتابی شکل میں مصر اور ہندوستان سے شائع ہوا۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۴-۲۵۵

www.abulhasanalinadwi.org

ایک انقلاب انگیز کتاب کی تالیف

''مسلمان تاریخ کے ایک ایکٹر (Actor) نہیں، ایک طاقتور تاریخی بلکہ تاریخ ساز عامل (Factor) کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے تاریخ انسانی وابستہ ہے۔ انکے عروج واقتدار سے اوران کے قائدانہ اورموثر رول ادا کرنے کے مقام پر فائز ہونے سے پورے عالم انسانی کا رخ بدل رہا تھا اور انسانیت سعادت سے ہم کنار ہورہی تھی، اورانکے زوال سے (جوخودان کالایا ہوا اور پیدا کیا ہوا تھا) انسانیت لاوارث، علم وتہذیب آوارہ، قومیں اور سلطنتیں شتر بے مہار، مساعی بے نتیجہ، علمی وصنعتی ترقیات باعث ہلاکت اور خودکشی کا سامان بن گئیں، اوردنیا اجتماعی اور منظّم طریقہ پر ہلاکت وتباہی کے غار کی طرف رواں دواں ہوگئی۔ اب پھر اگر صحیح منزل کی طرف بازگشت کی کوئی امید اور نجات کا راستہ ہے تو وہ یہی ہے کہ مسلمان پھر منصب قیادت پر فائز ہوں اور دنیا کی رہنمائی اسلام کے حصہ میں آ جائے۔''(۱)

اس دور میں جبکہ مفکرین ومصنّفین کا عمومی رجحان اور فکر صرف یہ تھا کہ دنیا میں پیش آنے والے واقعات کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑتا ہے، ان کے نزدیک مسلمانوں کی حیثیت تاریخ کے عامل کی نہیں بلکہ معمول کی تھی، یہ ایک انقلاب انگیز فکر اور تعجب خیز رجحان تھا، حضرت پر یہ فکر ورجحان ایسا غالب ہوا کہ اس کو ایک کتاب کے قالب میں ڈھالنے کا عزم فرمالیا۔ اس وقت تک اگر چہ دین پر مکمل اعتماد اوراس کے تمام شعبوں کو زندگی سے منطبق کرنے کی صلاحیت پیدا ہوچکی تھی اور یہ حقیقت آشکارا ہوچکی تھی کہ تنہا اسلام ہی دنیا کی قیادت کرنے اوراس کو اپنی صحیح ڈگر پر لانے کی اپنے اندر صلاحیت اور پیغام رکھتا ہے۔ مطالعہ بھی خاصا وسیع ہو چکا تھا لیکن یہ موضوع ایسا اہم اور بالغ نظری کا طالب تھا کہ بقول حضرتؒ کے :

''اس کے لئے زیادہ پختگی اور بالغ نظری اُس سے زیادہ وسیع وعمیق

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۷

مطالعہ اور اس سے زیادہ کہنہ مشق قلم کی ضرورت تھی۔ میرے جیسے آدمی کے لئے اس موضوع پر لکھنا ایک ''جرأت رندانہ'' یا ''ادائے قلندرانہ'' سے کم نہ تھا''۔

لیکن پھر حضرت ہی فرماتے ہیں :

''انسانی کوششیں ہمیشہ منطق و ریاضی کے تابع نہیں ہوتیں اور اسی میں خیر ہے، ورنہ انسان ایک بے جان مشین بن کر رہ جائے۔ میں اس خیال سے ایسا سرشار اور اس کے تقاضے سے ایسا مغلوب ہوا کہ میں نے نہ صرف اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت کی بلکہ عربی میں لکھنے کا فیصلہ کیا''(۱) بقول شاعر مشرق علامہ اقبال ؎

اچھا ہے تیرے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرتؒ نے جب یہ کام شروع فرمایا تو اس وقت صرف تیس (۳۰) سال کی عمر تھی، اسکی تکمیل و تذئیل کا سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا، اور اللہ تعالیٰ کی ایسی کھلی مدد ہوئی جو عام طور پر بلند مقاصد کو پیش رکھنے والے مخلص مصنفین کے ساتھ ہوتی ہے۔

جاہلیت عالمیہ کے باب میں خاص طور سے حضرت فرماتے ہیں :

''یہ مواد علاحدہ علاحدہ ملکوں کی تاریخ اور کئی زبانوں میں منتشر ہے اور اکثر ان موضوعات کے ماتحت ہے جہاں مشکل سے نظر جاتی ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں ایک نئے سفر کا آغاز کرنا پڑا جسکی منزلیں پہلے سے معلوم اور متعین نہیں تھیں لیکن توفیق الٰہی سے (جس کا اس کتاب کی تالیف میں بار بار اور حیرت انگیز تجربہ ہوا) وہ کڑیاں ملتی چلی گئیں جن کی ضرورت تھی۔''(۲)

اس سلسلہ میں حضرت نے ایک دلچسپ واقعہ بھی کاروان زندگی میں نقل فرمایا ہے یہاں بھی اس کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہیں :

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۸
(۲) کاروان زندگی اول ص ۲۵۹

www.abulhasanalinadwi.org

''۱۹۷۴ء میں میرا مدینہ طیبہ میں قیام تھا اور میں اس کتاب کی تکمیل و تحسین میں مشغول تھا، مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یورپ میں جو اخلاقی مکتب خیال، رواقی، لذتی وغیرہ قائم ہوئے ان کی تاریخ معلوم ہو اور عربی میں ان کے لئے کیا اصطلاحات و تعبیرات استعمال کی جاتی ہیں ان کا علم ہو۔ میرے پاس کوئی ماخذ نہیں تھا۔ میں ایک دن اپنی قیام گاہ پر آیا تو گھر والوں نے بتایا کہ ایک عرب صاحب آئے تھے، وہ بہت دیر تک تم کو آواز دیتے رہے، جب کوئی جواب نہیں ملا تو دروازہ کی دراز سے یہ کتاب اندر ڈال گئے۔ میں نے دیکھا تو استاد جاد المولی بک کی کتاب تاریخ و فلسفہ اخلاق پر تھی جس میں میری وہ تمام مطلوب معلومات موجود تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لانے والے میرے ایک ترک نوجوان دوست علی علوی ترکی تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اس کا کیسے خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میری اس کتاب پر نظر پڑی تو میرے دل میں آیا کہ شاید یہ کتاب آپ کی دلچسپی اور کام کی ہوگی اس لئے میں آپ کے گھر چھوڑ آیا۔ مصنّفین کو جو کبھی نیک مقصد کے لئے قلم اٹھاتے ہیں، ایسے بہت تجربے ہوئے ہوں گے۔''(۱)

کتاب تکمیل کو پہنچی تو اس کی طباعت کا مسئلہ پیش آیا۔ اس وقت تک حضرت نے عالم عربی کا کوئی سفر نہیں کیا تھا، اور ہندوستان میں اسکی طباعت کا مرحلہ دشوار بھی تھا، پھر اس سے بڑھ کر عربوں تک کتابوں کی منتقلی کا مسئلہ تھا۔ حضرتؒ کو محسوس ہوا کہ شاید طباعت میں دیر لگے، تو حضرت نے خود اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور ''مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا'' کے نام سے کتاب شائع ہوگئی۔ اہل فکر نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، خاص طور پر علامہ سید سلیمان ندویؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ حضرت مدنیؒ نے ''نقش حیات'' میں اس کے بعض اقتباسات بھی حوالہ سے نقل فرمائے۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۹

www.abulhasanalinadwi.org

۱۹۵۱ء میں جب حضرت نے حجاز کا سفر کیا تو اس وقت حرم مکی کے خطیب و امام شیخ عبد الرزاق حمزہ نے کتاب دیکھ کر سب سے پہلے اس کی داد دی اور بلند الفاظ میں اپنا تاثر ظاہر کیا اور یہ بھی تاکید کی کہ یہ کتاب جلد ہی طبع ہونی چاہئے۔

حضرت نے اس کی طباعت کے لئے مصارف کا تخمینہ مکہ مکرمہ کے ایک تجارتی مطبع سے حاصل کیا اور ایک افریقہ کے مخیّر مسلمان تاجر سے ملاقات کی، اور کتاب کا تعارف کرایا۔ وہ اس کی افادیت اور ضرورت کو محسوس نہ کر سکے اور ایک معمولی رقم اس کی طباعت کے لئے دی۔ حضرت فرماتے ہیں :

''میں نے قبول تو کر لی، مگر بہت دل شکستہ ہوا، میرا وضو تھا، میں سیدھا حرم شریف گیا اور اس دل شکستگی کی عالم میں ملتزم پر کتاب کی طباعت کے سامان ہونے اور قبولیت کی دعا کی۔''(۱)

کتاب کی اہمیت و ضرورت اور افادیت اپنی جگہ مسلّم تھی، مگر اس دعا کا اثر یہ ہوا کہ اس کتاب نے خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ پر ایک انقلابی اثر ڈالا اور موجودہ صدی کی تصنیفات میں اس کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔

حجاز سے واپسی پر حضرتؒ نے اس کی طباعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر احمد امین سے مراسلت فرمائی جو مصر کے ایک اشاعتی و تصنیفی مرکز کے ذمہ دار تھے۔ انھوں نے کتاب دیکھ کر پسند کی اور لکھا کہ ''کتاب کیا بلحاظ زبان کیا بلحاظ مواد ہر طرح سے مکمل ہے اور ہماری کمیٹی نے اس کی طباعت کا فیصلہ کیا ہے۔''

یہ منظوری کا خط ایسے موقع پر ملا جب حضرتؒ، حضرت رائے پوریؒ کے ساتھ موٹر میں دار العلوم سے نکل کر تحصیل فتح پور کسی دعوتی دورہ میں تشریف لے جا رہے تھے۔ حضرت فرماتے ہیں :

''مجھے یاد ہے کہ میری زندگی میں چند دن جو انتہائی مسرت کے گذرے ہیں ان میں ایک دن وہ بھی تھا جب عزیزی محمد رابع سلّمہٗ نے مجھے چلتی کار میں

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۶۴

www.abulhasanalinadwi.org

وہ خط دیا۔''(۱)

مزید فرماتے ہیں :

''حقیقت میں اس کتاب کی اشاعت نے میرے دعوتی کام میں وہ آسانی اور مشرق وسطیٰ کے علمی ودینی حلقہ میں میرے تعارف کا وہ کام کیا جو سیرت سید احمد شہیدؒ کی اشاعت نے ہندوستان میں کیا تھا۔''(۲)

کتاب شائع ہوگئی لیکن حضرت کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کا بھی دلچسپ واقعہ پیش آیا جو مضمون کی مناسبت سے یہیں ذکر کیا جاتا ہے :

''میں نے جنوری ۱۵ءء کی ابتدائی تاریخوں میں جب مکہ معظّمہ میں طویل قیام رہ چکا تھا، مصر کے سفر کا عزم کیا تو شام کو بھی اس پروگرام میں شامل کرنے کا ارادہ ہوا۔ میں شامی سفارت خانہ جدہ میں شام کا ویزا لینے گیا، عزیزان مولوی معین اللہ صاحب ندویؒ (حال نائب ناظم ندوۃ العلماء) اور مولوی عبد الرشید ندوی جو سال ڈیڑھ سال سے دعوت وتبلیغ اور میرے دعوتی رسائل کو اہل علم تک پہنچانے کے لئے مکہ میں مقیم تھے اس سفر میں میرے ساتھ جانے والے تھے، میرے ساتھ سفارت خانہ گئے۔ مجھے جب شام کا ویزا مل گیا تو میں نے شامی سفیر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، حسن اتفاق سے اس وقت اس عہدہ پر استاد جواد المرابط متعین تھے، جو خود فاضل و ادیب تھے اور ''**المجمع العلمی العربی دمشق**'' کے رکن، انھوں نے ہم لوگوں کو اوپر بلا لیا، ادبائے مصر اور وہاں کے اہل قلم پر بات نکلی تو انھوں نے کہا ''ہندوستانی علماء ومصنفین کی تحریر میں ہم کو جو اثر اور دلآویزی محسوس ہوتی ہے وہ ان کے یہاں نہیں پائی جاتی مثلاً میں ابھی مصر گیا تھا وہاں ایک مکتبہ میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی ''**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**'' میں لے آیا، اور پڑھ کر بہت متاثر ہوا''۔ میرے اندر یہ سن کر ایک بجلی سی دوڑ گئی اور میں نے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۶۶ (۲) ایضاً

www.abulhasanalinadwi.org

بڑے اشتیاق واضطراب کے ساتھ پوچھا کیا یہ کتاب آپکے پاس ہے اور ہمیں دکھا سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں اور الماری میں سے نکال کر دی۔ میں نے چند دن کیلئے اس کو ان سے مستعار لے لیا۔"(۱)

کتاب پر ڈاکٹر احمد امین نے کچھ زیادہ ہی محتاط انداز میں مقدمہ لکھا جو عام طور پر پسند نہیں کیا گیا۔ پھر بعد میں سید قطب شہیدؒ نے پرزور اور طاقتور مقدمہ تحریر فرمایا۔ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ بھی ازخود ایک مقدمہ لکھ چکے تھے، وہ کتاب کے بڑے مداح اور قدرداں تھے، کتاب انھوں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی اور سرورق پر یہ جملہ لکھا "ہر ایسے شخص کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لازم ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی ترقی چاہتا ہو۔"

یہ کتاب ان دونوں مقدمات اور شیخ احمد الشرباصی کے تعارف مصنف کے ساتھ بار بار شائع ہوئی۔ اور اس وقت محتاط اندازہ کے مطابق اس کے تقریباً سو اڈیشن نکل چکے ہیں، اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

یہاں اس واقعہ کا تذکرہ مناسب ہے کہ ایک مرتبہ حضرتؒ نے بعض طلبہ سے اس کتاب کے مطالعہ کے بارے میں دریافت فرمایا۔ ان طلبہ نے کہا ابھی مطالعہ کی نوبت نہیں آئی۔ حضرت نے برجستہ فرمایا "عالم عربی میں جو یہ کتاب نہ پڑھے وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں سمجھا جاتا" حضرت فرماتے تھے کہ میں نے یہ جملہ کہہ تو دیا مگر خود مجھے احساس ہوا کہ اسطرح کا تبصرہ میں نے کہیں نہیں سنا۔ حسن اتفاق کہ علامہ یوسف القرضاوی سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "جب ہم مصر میں پڑھتے تھے تو عام طور پر یہ جملہ زبان زد تھا کہ جس نے یہ کتاب نہیں پڑھی وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے۔"

تھانہ بھون کی حاضری

۱۹۳۴ء کے حضرت کے قیام لاہور کے زمانہ میں ڈاکٹر صاحبؒ نے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ واپسی میں تھانہ بھون ہوتے ہوئے آئیں اور جانے سے پہلے حضرت

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۶۷

www.abulhasanalinadwi.org

تھانویؒ کو اپنے تھانہ بھون آنے کی اطلاع بھی کر دیں، اپنا تعارف بھی کرا دیں اور سفر کا مقصد اور مدت قیام بھی لکھ دیں۔ حضرتؒ نے اس پر عمل فرمایا، حضرت تھانویؒ نے جواب تحریر فرمایا ''سر آنکھوں پر تشریف لائیں۔'' حضرت نے حضرت تھانویؒ کو اس کے جواب میں پھر خط لکھا اور اس میں حضرت تھانویؒ اور حضرت لاہوریؒ کے علمی و نظریاتی اختلاف کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے یہ بھی تحریر فرمایا کہ ''میرے نزدیک یہ اختلاف باپ چچا کے اختلاف کی طرح ہے۔'' حضرت خود تحریر فرماتے ہیں کہ ''میں نے بلاضرورت یہ جملہ لکھ دیا اور مجھے یہ احساس ہوا کہ شاید اب اس کا یہ جواب آئے گا کہ آپ یہاں آنے کی زحمت نہ فرمائیں آپ کو کوئی نفع نہ ہوگا۔'' لیکن حضرت جب لکھنؤ تشریف لائے تو حضرت تھانویؒ کا گرامی نامہ ملا جس کو بڑے اہتمام سے بھیجا گیا تھا، پتہ بھی حضرت تھانویؒ نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا تھا۔ اس میں یہ عبارت تحریر فرمائی تھی :

مشفق مکرم مولوی ابوالحسن علی صاحب سلّمہٗ

بتوسط جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سلّمہٗ

۳۷ امین آباد، لکھنؤ۔

مکتوب گرامی کا ایک اقتباس بھی نقل کیا جاتا ہے جو حضرت تھانویؒ کی شفقت و محبت اور قدر و اعتراف کا آئینہ دار ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :

''بخدمت مجمع الکمالات زید لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فرحت نامہ پہونچا، ہر ہر حرف حیات بخش تھا۔ جزاکم اللہ علیٰ هذه المحبة۔ آپکے صدق وخلوص وسلامت فہم کے اثر سے میری طبیعت بھی دفعتاً آپ سے بے تکلف ہوگئی .... آپکے لئے دعا کرتا ہوں اور دعا چاہتا ہوں۔''(۱)

---

(۱) پرانے چراغ اول ص ۱۲۲-۱۲۳

www.abulhasanalinadwi.org

حاضری کی نوبت ۱۹۴۲ء میں آئی۔ حضرتؒ، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ہمراہ شاہدرہ سے سہارنپور تشریف لے جارہے تھے، تھانہ بھون راستہ میں پڑتا تھا۔ حضرتؒ نے پہلے اپنی حاضری کی اطلاع ایک مکتوب کے ذریعہ سے فرمادی اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے اجازت لے کر تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ آگے کا حال حضرت ہی کی زبانی اختصار سے نقل کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ :

''میں خانقاہ میں داخل ہوا، گرمی اور دوپہر کی وجہ سے سناٹا تھا، ایک طرف سامان رکھ کر بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی۔ مولانا تشریف لائے۔ میں نے اس وقت اپنا تعارف مناسب نہیں سمجھا۔ ظہر کی نماز کے بعد مجلس شروع ہوئی میں بھی حاضر ہوا اور کنارے بیٹھ گیا۔ داخل ہوتے ہی اس ڈیسک پر نظر پڑی جو مولانا کے سامنے تھی، اس پر سیرت سید احمد شہید بھی رکھی ہوئی تھی، اس سے اجنبیت کے احساس میں بہت کمی ہوئی۔ مولانا خطوط کے جوابات دینے میں مصروف تھے۔ چند منٹ کے بعد خواجہ عزیز الحسن صاحب سے فرمایا کہ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی آنے والے تھے، آئے نہیں؟ میں آگے بڑھا اور عرض کیا کہ حاضر ہوں۔ فرمایا آپنے بتایا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت کے حرج کے خیال سے عرض نہیں کیا۔ فرمایا اس سے بڑھ کر کیا حرج ہوتا کہ مجھے آپ کی آمد کا علم نہ ہوتا، خجلت ہوتی، ندامت ہوتی، افسوس ہوتا، کئی لفظ فرمائے۔ خلاف معمول اپنا مہمان بنایا اور دونوں وقت پر تکلف کھانے کا اہتمام فرمایا۔ فرمایا کہ میں نے آپکی وجہ سے خطوط کا بہت سا کام پہلے کرلیا تھا تا کہ اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے۔ یہ حضرت کی طرف سے انتہائی اعزاز تھا۔''(۱)

ایک روز قیام کے بعد حضرتؒ اسی گاڑی سے جس پر مولانا محمد الیاس صاحبؒ کاندھلہ سے رامپور تشریف لے جارہے تھے، سوار ہوکر رامپور تشریف لے گئے۔ یہ حضرت کی تھانہ بھون کی پہلی اور آخری حاضری تھی۔

---

(۱) پرانے چراغ اول ص ۱۲۸-۱۲۹

www.abulhasanalinadwi.org

ساتواں باب

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت سے تعلق وارتباط، تبلیغی مساعی اور مولانا کے بعد حضرتؒ کا طرزِ فکر اور موقف

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں پہلی حاضری

گذشتہ باب میں گذر چکا ہے کہ حضرتؒ نے اپنے دو رفقاء حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور حاجی عبدالواحد صاحب ایم۔اے کے ہمراہ دینی مرکزوں کا دورہ فرمایا تھا، ۱۹۴۰ء کا آغاز تھا کہ یہ مبارک قافلہ دہلی میں داخل ہوا۔ مولانا نعمانیؒ تو اپنی اہلیہ کی علالت کی بنا پر وطن تشریف لے گئے، یہ دو حضرات نظام الدین حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کہیں سفر پر تشریف لے گئے تھے۔ مولانا احتشام الحسن صاحب نے ان حضرات کو میوات بھیج دیا۔ جس تاثر کیساتھ وہاں سے دہلی واپسی ہوئی اس کا ذکر بھی گذر چکا۔ مولانا کے انتظار میں یہ لوگ دہلی میں رہے۔ جس دن مولانا تشریف لانے والے تھے اس کے فارغ وقت میں حاجی عبدالواحد صاحب اپنے ایک غیر مسلم دوست سے ملنے گئے، حضرتؒ بھی ہمراہ تھے اس وقت حضرتؒ پر انجذاب کی جو غیر معمولی کیفیت طاری ہوئی اور پھر مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے پہلی ہی ملاقات میں جس خصوصی توجہ والتفات کا معاملہ فرمایا اس کا تذکرہ حضرت ہی کی زبانی کاروان زندگی سے نقل کیا جاتا ہے :

www.abulhasanalinadwi.org

''حاجی عبد الواحد صاحب اپنے پرانے دوست کے ساتھ گفتگو میں منہمک تھے، میرے اندر بے چینی کی ایک مبہم لیکن طاقتور کیفیت پیدا ہوئی اور میں اس سے ایسا مغلوب ہوا کہ قریب تھا کہ دیوانہ وار دروازہ کھول کر کے نظام الدین کی طرف دوڑوں، اسی کے ساتھ دعا وانابت کی بھی ایسی حالت پیدا ہوئی جو کبھی برسوں میں اور خاص روحانی فضا میں پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اپنے کو بہت سنبھالا کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھ پر دماغی دورہ پڑا ہے۔ اللہ اللہ کر کے وہ گفتگو اور ملاقات سے فارغ ہوئے اور ہم دونوں نظام الدین پہنچے، ہمارے پہنچنے کے کچھ دیر بعد مولانا تشریف لائے اور اس شفقت اور گرم جوشی سے ملے جیسے برسوں کی جان پہچان تھی یا انتظار ہی میں تھے۔ خاص طور پر جب ان کو معلوم ہوا کہ میں ''سیرت سید احمد شہید'' کا مصنف ہوں اور میرا صاحب سیرت سے خاندانی تعلق ہے، تو شفقت و محبت اور یگانگت میں اور اضافہ ہوا۔ سب سے پہلی چیز جس نے ہم لوگوں کو متأثر کیا اور جس کا کم سے کم مجھے اپنی عمر میں پہلا تجربہ ہوا وہ مولانا کی شفقت اور جذب دل کی خاص کیفیت تھی۔ پہلی ملاقات کے باوجود کہیں سے بھی کوئی اجنبیت، تکلف اور اپنی ذات اور مرتبہ کا احساس نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے دن صبح کی مجلس میں بھی وہی دل نوازی کی شان تھی جو روبہ ترقی تھی۔ میری رخصت کے دن جو میں نے دار العلوم سے لی تھی ختم ہو رہے تھے۔ دوسرے یا تیسرے دن مجھے واپس ہونا تھا۔ مولانا نے روانگی کے وقت ایسی طویل اور اثر میں ڈوبی ہوئی دعا کی کہ جس سے دل و دماغ متأثر ہوئے اور دوبارہ اور جلد حاضری کا عزم پختہ ہوا۔ مولانا نے غالباً اسی قیام کے زمانہ میں فرمایا کہ مولانا میں نے آپ کی کتاب (سیرت سید احمد شہید) پڑھی لیکن اس سے میری معلومات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، میں اپنے خاندان کی بیبیوں اور بزرگوں سے اس سے زیادہ ہی سن چکا ہوں۔ بات سے بات یاد آتی ہے، ایک مرتبہ میں مسجد کے بالائی حصہ میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں صاحبزادہ گرامی

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا محمد یوسف صاحب کا قیام رہتا تھا۔ مولانا چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں لے کر تشریف لائے، میری طرف پیالی بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ "مولانا ابھی تک ہم لوگ حضرت سید احمد شہید کی تجدید کے سایہ ہی میں ہیں۔" میں لکھنؤ واپس آ گیا لیکن دل کا حال وہ تھا جو شاعر نے بیان کیا ہے

ع دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے" (۱)

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے خصوصی انجذاب ومناسبت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت تحریر فرماتے ہیں :

"مولانا کی طرف انجذاب اور ان کے مقام سے ہلکی سی شناسائی میں اس کو بڑا دخل تھا کہ میں ان سے ملنے سے پہلے "مکتوبات امام ربّانی" "ازالۃ الخفا" "صراط مستقیم" اور "منصب امامت" پڑھ چکا تھا اور (اپنے تاریخی وادبی مطالعہ وذوق کے باوجود) اسکی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی کہ میں یہ سمجھ سکوں کہ ان دو دعوتوں اور کوششوں، قیادتوں اور طرز فکر وتفہیم میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جن میں سے ایک کا سرچشمہ، ذہانت مطالعہ، وسعت علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کا ردعمل ہوتا ہے۔ اور دوسرے کا سرچشمہ کثرت عبادت، انابت و دعا، قرآن مجید میں عمیق تدبر، سیرت نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اجتباء اور ہدایت ربانی ہوتی ہے۔ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو دیکھ کر اور ان کی صحبت میں رہ کر عارف شیرازی کے اس شعر کی تصدیق ہوئی ؎

ایں ہمہ مستی و مدہوشی نہ حد بادہ بود
با حریفاں انچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

دوسری طرف مولانا کی مجھ پر خصوصی عنایت اور تھوڑے وقت میں جو قرب واختصاص حاصل ہوا اس کی ایک وجہ تو وہ عجیب وغریب تعلق وعقیدت ہے جو سلسلۂ رشیدی کے تمام مشائخ کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ رہا ہے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۸۰

www.abulhasanalinadwi.org

اور جس کا اندازہ کرنا ان لوگوں کے لئے دشوار ہے جنھوں نے ان حضرات کو قریب سے اور زیادہ نہیں دیکھا۔"(۱)

لکھنؤ میں تبلیغی کام کا آغاز اور اس کے ثمرات

حضرتؒ نے لکھنؤ آتے ہی ان طلبہ کو لیکر جو ذاتی تعلق ومناسبت رکھتے تھے، کام شروع فرمادیا۔ جمعرات کو ضروری سامان لے کر بعد نماز عصر اکثر ملہور پیدل ہی جانا ہوتا جو تقریباً دس بارہ کلومیٹر ہے۔ وہاں سے جماعتیں تقسیم ہوجاتیں اور نواحی دیہاتوں اور قصبات میں جاتیں۔ حضرت ان کوششوں کی روداد بھی مولانا کی خدمت میں بھیجتے رہتے، جس کے جواب میں مولانا بڑی محبت وشفقت بلکہ بڑی عظمت و قدردانی کے خطوط ارسال فرماتے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کو گوہر مقصود حاصل ہوگیا جسکی ان کو تلاش تھی۔ ایک خط میں "عـمـدة الأمـال و الأمـانـي" کے ساتھ خطاب فرمایا، جس سے خصوصی محبت اور توقعات کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرتؒ نے جب والدہ صاحبہ اور ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ تحریر فرمایا کہ اس کام کو ان دونوں نے تائید وپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تو اس کے جواب میں مولانا نے لکھا :

> "یہ امر مجھ ناچیز تہی دست کے لئے ایک مبارک دامن تلے آنے کی جھلک دکھلا رہا ہے۔"

لکھنؤ میں دو تین سال تک اسی طرح طلبہ کے ذریعہ کام آگے بڑھتا رہا، طلبہ کی اس نقل وحرکت سے خود ان کے اندر دینی فکر اور اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا، دینی ترقی ہوئی، سادگی و جفاکشی کی عادت پڑی، آپس میں ربط وتعارف اور اساتذہ سے ذاتی تعلق کا فائدہ ہوا پھر عوام کی دینی پسماندگی اور جہالت سامنے آئی اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوا۔

دوسری طرف شہر میں بھی لوگوں کو توجہ ہوئی اور دینی ذوق رکھنے والے حلقہ میں

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۸۳-۲۸۴

www.abulhasanalinadwi.org

کام پھیلنے لگا، بڑی بڑی جماعتیں نظام الدین جانے لگیں اور ان حصہ لینے والوں کی زندگی میں بھی تغیر پیدا ہوا اور کھلی ہوئی دینی ترقی نظر آنے لگی۔

لکھنؤ کے اس کام میں اساتذہ میں سے خاص طور پر مولانا محمد ناظم صاحب ندوی نے رفاقت فرمائی، جو حضرت کے رفیق درس بھی تھے اور رفیق تدریس بھی، اور دونوں میں ذوق وفکر کی ہم آہنگی بھی تھی اور عمل کی یکجائی بھی۔

اسی زمانہ میں نظام الدین کے کسی زمانہ قیام میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ سے تعارف ہوا، اور شیخ نے غیر معمولی اپنائیت کا معاملہ فرمایا، پھر یہ تعلق یوماً فیوماً بڑھتا ہی رہا۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دارالعلوم میں آمد

حضرت نے لکھنؤ میں کام کی جو بنیاد ڈالی تھی الحمد للہ اس کے اثرات مرتب ہونے لگے تھے اور اہل لکھنؤ کو یہ استحقاق ہو گیا تھا کہ مولانا یہاں قدم رنجہ فرمائیں اور براہ راست اہل لکھنؤ کو مستفید فرمائیں۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں آپ نے دعوت منظور فرمائی اور ۱۸؍جولائی کو علماء واعیان کی ایک جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے اور دارالعلوم ہی میں قیام فرمایا۔ ایک روز قبل علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی تشریف لا چکے تھے۔ دوسرے روز حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور بعض دوسرے علماء و مشائخ بھی تشریف لائے۔ اسطرح دارالعلوم میں زہد وورع اور علم وفضل کی یہ کہکشاں ایک مدت کے بعد سجی۔ حضرت سید صاحب بھی اس کام کی طرف متوجہ ہوئے اور مولانا کو بھی دارالعلوم اور یہاں کے ذمہ داروں سے گہرا تعلق ہوا۔ مولانا نے خاص طور پر ڈاکٹر صاحب اور سید صاحب کا خصوصی اکرام فرمایا۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ

"ایک دن مجھ سے فرمایا مجھے ایسی جگہ لے چلو جہاں سے دارالعلوم کا پورا ماحول نظر آئے۔ مولانا کو دارالعلوم کی چھت پر جہاں سے ایک طرف دریا کا

www.abulhasanalinadwi.org

منظر اور دوسری طرف دارالعلوم کی مسجد، شبلی دارالاقامہ اور دوسری عمارتیں نظر آتی ہیں لے گیا، اس وقت صرف مولانا اور میں تھا۔ مولانا نے فرمایا حضرت میں دارالعلوم کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں، بتائیں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ اللہ تعالیٰ نے اس وقت رہنمائی فرمائی اور میں نے کہا صرف یہ کہ آپ دارالعلوم کو بھی اسی نظر عنایت واختصاص سے دیکھیں اور سرپرستی فرمائیں جس سے آپ مدرسہ مظاہر العلوم کو دیکھتے ہیں۔ مولانا نے دعائیہ الفاظ فرمائے اور نیچے تشریف لے آئے۔''(۱)

حضرتؒ دارالعلوم میں جو دینی رنگ دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے لئے کوشاں تھے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے اس قیام سے اس میں بڑی مدد ملی اور عمومی طور پر دینی فضا قائم ہوئی۔

آخری روز کچھ وقت کے لئے اپنے رفقاء کے ساتھ دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی تشریف لائے اور مسجد جا کر تلاوت میں مشغول رہے۔ حضرت شاہ علم اللہؒ کی قبر پر تشریف لے گئے اور بڑے بلند کلمات فرمائے۔ اسی روز لکھنؤ ہوتے ہوئے کانپور تشریف لے گئے اور دو تین روز ٹھہر کر دہلی واپسی ہوئی۔

حضرتؒ پر خصوصی شفقت وتوجہ

اس پورے عرصہ میں مولانا کی توجہ بڑھتی رہی۔ خطوط میں اس طرح خطاب فرماتے کہ اس سے صرف شفقت ومحبت ہی نہیں بلکہ عظمت وعقیدت کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''جناب کا گرامی نامہ کنول قلب کے کھلنے کا سبب ہوا۔'' ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''جناب کی تشریف آوری کا مژدہ روئیں روئیں کو تروتازہ کر رہا ہے، حق تعالیٰ ہمیں آپ کی ذات گرامی سے دارین میں

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۹۱، لکھنؤ کے سفر اور قیام کے مفصل حالات شہر کے اجتماعات اور علماء و اعیان شہر سے ملاقات کی تفصیل مولانا کی سوانح ''حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت'' میں ملاحظہ کی جائے۔ ص ۱۲۶-۱۳۰

www.abulhasanalinadwi.org

منتفع فرمائیں''۔ایک خط میں ''سیدی وسید عالم'' سے خطاب فرمایا۔

حضرت کا بھی حال یہ تھا کہ ہر مہینہ نظام الدین تشریف لے جاتے، اہم دوروں اور اجتماعات میں شرکت فرماتے۔ ڈاکٹر صاحبؒ بھی مولاناؒ اور ان کی دعوت وتحریک کے بڑے موید اور قدرداں تھے۔

نظام الدین حاضری اور پھر دوروں میں رفاقت کے موقعوں پر بھی مولانا بڑی محبت اور اکرام فرماتے۔ حضرتؒ کی محنت و جانفشانی کی بڑی قدر فرماتے۔ ایک دن فرمایا کہ ''مولانا میں آپکا شکریہ وتعریف کیا کروں، تعریف محبت کا اوچھاپن ہے۔''
ایک دن فرمانے لگے ''میں آپ سے کیا کہوں، اچھا دولت قرآن مبارک ہو!۔''

میوات کے کسی دورہ میں قیام گاہ پر کسی نے مولانا کی چارپائی اس طرح بچھادی کہ اس کا پائتانہ حضرتؒ کی چارپائی کے سرہانے کی طرف ہو رہا تھا، یہ دیکھ کر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ساتھ رہنے والوں سے فرمایا کہ ''تم اتنے دن ساتھ رہتے ہو مگر اتنی سی حس نہیں۔''

لکھنؤ تشریف آوری کے موقع پر پہلے قیصر باغ کے ایک سبزہ زار پر نوافل پڑھے، ایک رومال بچھا دیا گیا تھا، مولانا نے اس پر حافظ فخر الدین صاحب کو بٹھایا اور حضرتؒ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ فرمایا، حضرتؒ کو اتنے مجمع میں تکلف ہوا تو فرمایا کہ ''یہ حضرت سہارنپوری کا رومال ہے برکت کے لئے بیٹھ جائیے۔'' حضرتؒ نے تعمیل فرمائی۔

اس پورے عرصہ میں حضرت کو بار بار ترجمانی کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا اور مولانا کا اعتماد بڑھتا رہا۔ اہم اہم مواقع پر حضرتؒ کو خطاب کے لئے فرماتے۔ حضرت فرماتے ہیں :

''ایک مرتبہ لکھنؤ سے رات کو نظام الدین پہنچا، صبح مولانا نے مجھی کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ سلام پھیرنے کے بعد فرمایا کہ کچھ کہئے۔ میں نے دیکھا، سامنے پہلی صف میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، قریشی صاحب، ملک دین محمد (دہلی

www.abulhasanalinadwi.org

کے ممتاز ترین مسلمان ٹھیکیدار اور تاجر) بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں بالکل خالی الذہن ہوں۔ فرمایا آپ کہنا تو شروع کیجئے۔ میں نے کہنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ مولانا متوجہ ہیں اور مضامین کا ورود ہو رہا ہے۔ اسی اعتماد اور تجربہ کی بنا پر میں نے مولانا کے گرامی ناموں اور ارشادات کو سامنے رکھ کر جو میرے نام آئے تھے، ایک رسالہ ''ایک اہم دینی دعوت'' کے نام سے مرتب کیا۔ مولانا نے اسکو من اولہ الیٰ آخرہ لفظاً لفظاً سنا۔ چند جگہ خفیف سی لفظی ترمیمیں کیں، سننے کے بعد بہت دعائیں دیں۔

اسی مناسبت و اعتماد کی بنا پر حضرت زیادہ سے زیادہ قرب اور مجالس میں میری شرکت پسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ شہر کے کسی گشت یا قرب و جوار کے کسی نظام میں ذمہ داروں نے مجھے بھی بھیج دیا، مولانا کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ایک آدمی میری باتیں سمجھنے والا تھا، تم نے اس کو بھی بھیج دیا۔ اب میں کس سے بات کروں؟''(۱)

مارچ ۱۹۴۴ء کو ڈاکٹر صاحب بھی نظام الدین تشریف لے گئے، مولانا ڈاکٹر صاحب کی آمد سے بہت مسرور ہوئے، جب چلنے لگے تو فرمایا ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تبلیغ و دعوت میں انہماک

حضرت دہلویؒ کی شفقتیں بڑھتی رہیں، اور حضرتؒ کا دعوت و تبلیغ میں انہماک بڑھتا گیا، یہاں تک کہ حضرت نے دارالعلوم سے ضابطہ کا تعلق اور ملازمت ترک کرنے کا ارادہ فرمالیا۔ حضرت دہلوی کے سامنے جب حضرت نے اپنے اس رجحان کا ذکر فرمایا تو فرمانے لگے: ''ہمارے بزرگ کسی ذریعہ معاش اور ملازمت کو اس وقت

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۹۲-۲۹۳

www.abulhasanalinadwi.org

تک ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیتے جب تک اس کا نعم البدل مہیا نہ ہوجائے۔"
حضرت نے دوسری بار پھر عرض کیا تو مولانا نے وہی جواب دیا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں :

"غالباً مولانا میری طبیعت اورعزم و فیصلہ کی پختگی کا اندازہ فرمارہے تھے، فجر کی نماز اور تقریر کے بعد مجھ سے خود فرمایا کہ مولانا آپ کو دارالعلوم سے کیا ملتا ہے؟ میں نے کہا پچاس روپیہ۔ یہ سن کر بڑے جوش کے ساتھ فرمایا اجی حضرت! ایسے ہزاروں پچاس آپکے غلاموں کے قدموں پر نثار ہوں گے۔ یہ کہہ کر اجازت دے دی۔"(۱)

۱۹۴۳ء کے اختتام تک حضرت اعزازی طور پر دارالعلوم کی خدمت کرتے رہے، اس دوران تبلیغی دوروں کا سلسلہ پورے زور وشور سے جاری رہا، لیکن پھر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اصرار پر دوبارہ یکم دسمبر ۱۹۴۳ء کو دارالعلوم سے باضابطہ منسلک ہوگئے اور سید صاحب ہی کے حکم پر تنخواہ لینا بھی قبول فرمالیا جسکا سلسلہ صرف ایک سال جاری رہا۔ اور اس دوران بھی اگر اسفار کی وجہ سے طویل غیر حاضری ہوجاتی تو اسی کے بقدر تنخواہ وضع کروادیتے۔ پشاور سے ڈاکٹر صاحب کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"چونکہ یہ پورا مہینہ ہمارا دارالعلوم سے دور گزر رہا ہے اس لئے ہماری خواہش ہے کہ اس مہینہ کی تنخواہ ہم نہ لیں۔"(۲)

تبلیغ میں حضرت کے انہماک کا یہ حال تھا کہ آج کہیں کل کہیں۔ نہ کھانے کی فکر، نہ لباس کی، نہ سواری کی۔ دس دس پندرہ پندرہ کلومیٹر پیدل مٹی پانی میں پاؤں سنے جارہے ہیں مگر کسی چیز کی پرواہ نہیں، صحت متاثر، خونی پیچش ہورہی ہے لیکن دیہات کی مسجدوں میں قیام ہے جہاں پانی ملنا بھی مشکل۔ اس زمانہ کے ان مکتوبات سے جو شیخ کے نام لکھے گئے ہیں اسفار کی کثرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۹۴
(۲) مکتوبات اول ص ۱۳

www.abulhasanalinadwi.org

ان تبلیغی اسفار میں مختلف دینی مدارس میں بھی جانا ہوتا، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدارس کے درمیان جو ایک خلیج حائل تھی، وہ دور ہوئی۔ خاص طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء اور قدیم دینی مدارس (جن میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سرفہرست ہے) کے درمیان جو ایک حجاب تھا وہ دور ہوا اور وہ قرب وارتباط اور تعارف واعتماد پیدا ہوا جس کی ایک مسلک ومقصد کی تعلیم گاہوں اور دینی مرکزوں میں عرصہ سے ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔

پشاور کا ایک تاریخی سفر

پشاور میں سیرت کمیٹی کے زیر اہتمام سالانہ جلسوں کا سلسلہ عرصہ سے جاری تھا، اور ہر سال مشاہیر علماء ومقررین کو اس میں دعوت دی جاتی تھی۔ کئی سالوں سے خاص طور پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو بلایا جارہا تھا۔ مارچ ۱۹۴۴ء کے جلسہ میں کمیٹی کے سکریٹری حاجی ارشد صاحب نے خصوصی طور پر دو ندوی فضلاء کو مدعو کیا، ان میں حضرتؒ کے علاوہ دوسرے ندوی فاضل مولانا شاہ جعفر صاحب پھلواروی ندویؒ تھے۔ حضرتؒ کو جب یہ دعوت نامہ موصول ہوا تو پشاور کی نسبت وتعلق سے خاص طرح کی مسرت اور انشراح محسوس ہوا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے بھی اجازت مرحمت فرمادی۔ مولانا عبد الغفار صاحب جونپوری ندوی مرحوم کی رفاقت میں حضرت نے سفر کا عزم فرمالیا۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی علالت کا زمانہ تھا۔ حضرتؒ نے پہلے نظام الدین حاضری دی، مولانا نے دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمایا اور چلتے وقت یہ بھی فرمایا "اپنا کام مت بھولنا۔" حضرت فرماتے ہیں کہ "سفر بڑی فرحت وانبساط کے ساتھ ہوا، پشاور اسٹیشن پر حاجی ارشد صاحب اپنے احباب کے ساتھ استقبال کے لئے موجود تھے۔ قیام کا انتظام صوبہ سرحد اسمبلی کے اسپیکر ملک خدابخش صاحب کی کوٹھی پر کیا گیا تھا۔

اگلے دن کے پہلے اجلاس میں دونوں تقریروں پر علمی رنگ نمایاں تھا۔ اسلئے

www.abulhasanalinadwi.org

عوامی سطح پر اسکا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا، اور وہاں کے ندوی فضلاء یا طلبہ کو اسکا احساس ہوا اور انھوں نے شریفانہ طریقہ پر اس کا اظہار بھی کیا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ''قیام گاہ پر آیا تو دعا کی ایک اضطراری کیفیت طاری ہوئی جو اکثر رنگ لاتی ہے۔''

اگلے دن کا جلسہ اصل جلسہ تھا، اس میں پورا شہر امنڈ آیا، دفاتر میں بھی تعطیل کردی گئی اور بڑے اہم سرکاری عہدیداران بھی شریک ہوئے۔ حضرتؒ جلسہ میں پڑھنے کے لئے ایک مضمون تحریر فرما کر لے گئے تھے، مگر حاجی ارشد صاحب نے کہا کہ عام طور سے یہ مضامین عوامی جلسوں میں نہیں جمتے۔ حضرتؒ نے برجستہ تقریر شروع فرمادی، مرکزی مضمون غزوہ بدر کی وہ دعا تھی جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا ''**اللھم إن تھلک ھذہ العصابة لا تعبد بعدھا فی الارض**'' (اے اللہ! اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کی ہلاکت کا فیصلہ کردے گا تو پھر اس کے بعد تیری عبادت نہیں ہو سکے گی)۔

تقریر میں ایسا جوش اور روانی تھی کہ پورا مجمع مسحور تھا، پھر حضرتؒ کے سوز دل اور اضطراب و کرب نے اس میں ایسی تاثیر پیدا کردی تھی کہ لوگوں پر گریہ طاری تھا۔ خود حضرت تحریر فرماتے ہیں :

> ''مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت مضامین کا ورود کہاں سے ہو رہا تھا، اور زبان میں طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ میں خود بھی اس کے زور میں بہہ رہا تھا اور مجمع بھی مست و سرشار تھا۔''

تقریر ختم ہوئی تو بہت سے نوجوان اٹھ کر آئے اور کہنے لگے ''فرمایئے کیا حکم ہے؟'' اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ پشاور میں ایک خاص دینی فضا قائم ہوگئی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرتؒ نے ان کو تبلیغی طریقہ پر دعوت دی، اور ایک نئی کالونی میں صوبہ سرحد کا پہلا تبلیغی گشت ہوا اور اسی وقت سے صوبہ سرحد میں تبلیغی کام کی بنیاد پڑی۔

حاجی ارشد صاحب کو حضرت سے ایسی محبت و مناسبت پیدا ہوگئی جو بڑے خاص تعلق رکھنے والے مخلصین کو ہوتی ہے، اور حضرت کو بھی مخلص باوفا مرد کار ہاتھ آیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

دوسرے ہی مہینے حاجی صاحب حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرتؒ نے ان کے لئے جو تعارفی خط لکھا اس میں یہ بامعنی فقرہ بھی تھا کہ ''ارشد صاحب صوبہ سرحد کے رجل رشید ہی نہیں رجل ارشد ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے ان سے بڑا کام لیا، خاص طور پر جاپان میں ان کے ذریعہ سے لوگوں کو ہدایت ہوئی اور قبول اسلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے علاوہ حجاز مقدس میں بھی ان کے ذریعہ سے تبلیغی کام کا وقیع تعارف ہوا اور خواص نے بھی توجہ کی۔ اللہ کو اگر منظور ہوتا تو ان سے اس کام کو بہت نفع ہوتا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۴ ارشعبان ۱۳۸۲ھ کو انہوں نے مدینہ منورہ سے واپسی پر ایک کار حادثہ میں شہادت پائی۔ غفر اللہ لہ و رفع درجاتہ

صوبہ سرحد کا دورہ

پشاور کے اس سفر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرتؒ نے ان علاقوں کا بھی دورہ کیا جن کو حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے مرکز ہونے کا شرف حاصل رہا تھا یا جنکا حضرت سید صاحبؒ کی تحریک سے گہرا تعلق تھا۔ اس میں بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ سیرت سید احمد شہیدؒ کے آئندہ ایڈیشن میں یہاں سے حاصل کردہ مزید معلومات کا اضافہ کیا جائے اور مخصوص مقامات کی تصاویر اور نقشے لے کر کتاب میں شامل کئے جائیں جن سے علمی و جغرافیائی اعتبار سے کتاب کی وقعت میں اضافہ ہو، حاجی ارشد صاحب نے اس کے لئے ایک نقشہ نویس کو ساتھ کر دیا۔

حضرتؒ سب سے پہلے اکوڑہ خٹک تشریف لے گئے جہاں حضرت سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کی بنیاد پڑی تھی اور سب سے پہلی جنگ لڑی گئی تھی۔ وہاں سے شیدو، صوابی، تحصیل مانیری اور ضلع مروان کے کئی مقامات پر ہوتے ہوئے پنجتار پہنچنا ہوا۔ مانیری کے قصبہ ہُنڈ میں ایک خطرناک لطیفہ پیش آیا جس کو حضرتؒ کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے :

www.abulhasanalinadwi.org

''ہم لوگ سیدھے ہنڈ کی مسجد میں پہنچے، معلوم کیا کہ کوئی یہاں ایسے صاحب ہیں جن سے کچھ تاریخی معلومات حاصل ہوسکیں؟ لوگ سردار خادی خاں کے خاندان کے ایک معزز فرد کو بلا لائے جو لاہور میں ریلوے کے کسی عہدہ پر تھے، انھوں نے کہا آپ اتنی دور سے یہاں کس کام کے لئے آئے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے تاریخی ذوق ہے اور میں یہاں کے حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے اتنے کام کے لئے تو کوئی اتنی دور سے نہیں آتا۔ پھر کہنے لگے کہ لکھنؤ کے ایک صاحب ابوالحسن علی ندوی ہیں انھوں نے ایک کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' لکھی ہے جس میں ہمارے بزرگوار سردار خادی خاں کے متعلق سخت الفاظ آئے ہیں جو غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں نے ٹالنے کے لئے کہا کہ ہم لوگ کتابیں لکھتے ہی رہتے ہیں۔ اس وقت انھوں نے نہ میرا نام پوچھا اور نہ میں نے بتایا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ انھوں نے اپنا مہمان بنایا۔ شام کو انھوں نے کہا کہ چلئے آپ کو دریائے اٹک کی سیر کرائیں۔ میں اور مولوی عبد الغفار صاحب گئے۔ ایک جگہ مولوی عبد الغفار صاحب تو وضو کے لئے بیٹھ گئے۔ ہم اور وہ تنہا رہ گئے۔ انھوں نے کہا آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا کہ علی۔ کہا کہ آپ ہی تو ابوالحسن علی نہیں ہیں (خیال رہے کہ پٹھان حضرات بندوق ساتھ رکھتے ہیں) اور جگہ بالکل سناٹے کی تھی میں بڑے مخمصہ میں پھنسا۔ میں نے کہا کہ لکھنؤ شیعوں کا شہر ہے وہاں سنیوں کے نام بھی علی حسین کثرت سے ہوتے ہیں اس پر انھوں نے مزید جرح نہیں کی اور ہم لوگ مغرب کی نماز ادا کر کے قیام گاہ پر آ گئے۔ رات کو انھوں نے رئیسانہ اور شریفانہ ضیافت کی۔ اگلے دن جب میں رخصت ہونے لگا میں نے ان کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کھیتوں پر گئے ہوئے ہیں، میں نے بلوایا اور کہا کہ اب میں یہاں سے جارہا ہوں، اب چھپانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں ہی ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کا مصنف ابوالحسن علی ندوی ہوں۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے، اور کہا کہ ابھی تک انجان بن

www.abulhasanalinadwi.org

کر آپ ہمارے مہمان رہے۔ اب تعارف ہوا ہے اب آپ کچھ وقت یہاں رہئے، تا کہ ہمیں آپ کی میزبانی کا موقع ملے۔ انھوں نے یہ بات خلوص اور شرافت سے کہی تھی۔ مگر ہمارا پروگرام آگے کا بنا ہوا تھا، میں نے معذرت کی اور مانیری کے لئے روانہ ہوگیا۔''(۱)

پنجتار پہنچ کر حضرت پر جو تاثر ہوا اس کا تذکرہ بھی کاروان زندگی سے نقل کیا جاتا ہے :

''پنجتار جا کر طبیعت سب سے زیادہ متاثر ہوئی، خاص طور پر جب اس مسجد میں قدم رکھا جہاں حضرت سید صاحبؒ ان کے رفقاء عالی مقام اور مجاہدین باصفا نے برسوں نمازیں پڑھیں، اس کی فضا کو اپنی حرارت ایمانی سے گرم اور اس کی زمین کو اپنے اشکوں سے نم کیا تھا تو بے اختیار دل ایسا امنڈ آیا اور طبیعت دعا کی طرف اس طرح متوجہ ہوئی کہ حرمین شریفین اور زندگی کی مخصوص ساعتوں کے علاوہ کبھی اور کہیں اس کا تجربہ نہیں ہوا۔''(۲)

گنج شہیداں بالاکوٹ پہونچ کر حضرت فرماتے ہیں :

''یہ اس کاروان ایمان و عزیمت کی آخری منزل تھی جس کا سفر ہمارے ہی وطن رائے بریلی سے شروع ہوا تھا، یہاں کی زمین کا ہر ذرہ ہم کو عزیز تھا، اور آنے والوں کو حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی زبان میں پیام دیتا تھا ؎

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں (۳)

سفر پر سفر

پشاور، لاہور، پٹھان کوٹ ہوتے ہوئے سہارنپور واپسی ہوئی ہی تھی کہ حضرت

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۰۲-۳۰۳
(۲) کاروان زندگی اول ص ۳۰۷
(۳) ایضاً

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا ایک مکتوب ملا جس میں حیدرآباد، سندھ کے ایک بڑے جلسہ میں حاضری دینے اور اس کام کو اہمیت کے ساتھ بیان کرنے اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کی شدید ضرورت کا اظہار کیا گیا تھا۔ ایک طویل سفر سے واپسی، صحت کی کمزوری، دارالعلوم میں حاضری کا تقاضا، یہ ایسے موانع تھے کہ شاید کوئی دوسرا ہوتا تو معذرت کردیتا، لیکن حضرت دہلویؒ سے غایت درجہ عقیدت و محبت پھر اس کام کی اہمیت اور حضرتؒ کے درد وفکر کا نتیجہ تھا کہ حضرتؒ نے سفر کا عزم فرمالیا۔ مولانا عبد الغفار صاحب کو لکھنؤ بھیجا اور خود تنہا روانہ ہوگئے۔ جلسہ میں حضرتؒ نے تقریر فرمائی پھر دوروز کے لئے پیر جھنڈا کے مشہور مرکز تشریف لے گئے جس سے حضرت سید صاحبؒ کا خاص تعلق رہا تھا، پھر وہ اسی سلسلہ قادریہ راشدیہ کی خانقاہ تھی جس سے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے واسطہ سے حضرت وابستہ تھے۔ اس وقت کے سجادہ پیر ضیاء الدین شاہ صاحب نے بڑی شفقت و محبت کا معاملہ کیا۔ جلسہ میں حضرت کے استاذ الاستاذ مولانا عبید اللہ سندھی صاحبؒ بھی تشریف لائے تھے۔ اس وقت وہیں مدرسہ کی بالائی منزل پر مقیم تھے۔ انھوں نے حضرت پر بڑی شفقت فرمائی، پیرانہ سالی کے باوجود باصرار خود ہی حضرتؒ کی قیام گاہ پر تشریف لاتے اور دیر تک بیٹھتے۔

حیدرآباد، کراچی میں مختصر قیام کے بعد دہلی ہوتے ہوئے لکھنؤ واپسی ہوگئی۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی علالت اور وفات

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی علالت شدت اختیار کرچکی تھی اور خطرہ منڈلا رہا تھا۔ حضرتؒ جون ۱۹۴۴ء میں طویل قیام کی نیت سے نظام الدین تشریف لے گئے۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی پہلے سے مقیم تھے۔ کچھ ہی دنوں میں حضرت شیخؒ اور حضرت رائے پوریؒ بھی تشریف لے آئے۔ اس وقت تک حضرتؒ کا حضرتؒ رائے پوری سے ارادت کا تعلق نہیں ہوا تھا۔

اس مرض کی شدت میں بھی حضرت کی بار بار طلبی ہوتی اور بڑی شفقت و محبت کا

www.abulhasanalinadwi.org

اظہار ہوتا۔

حضرت فرماتے ہیں :

''ایک روز بعض خاص حالات کی بنا پر مجھ پر خیالات و وساوس کا ہجوم تھا اور طبیعت بہت متاثر تھی۔ مغرب کی نماز کے سلام پھیرتے ہی طلبی ہوئی۔ نہایت شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا اور دیر تک بالوں پر ہاتھ پھیرتے رہے، پھر معلوم نہیں کس طرح اس ضعف کی حالت میں (کہ چہرہ کو حرکت دینی بھی مشکل تھی) سر اٹھا کر میری پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ تم تھک گئے، تمہارا کوئی معین نہیں۔ اسی طرح تسلی کے الفاظ فرماتے رہے۔''(۱)

حضرت مولاناؒ کو حضرت رائے پوریؒ سے بڑی عقیدت تھی، اس حال میں بھی اپنے تعلق والوں کو ان کی مجلس میں بیٹھنے اور فائدہ اٹھانے کی تاکید فرماتے تھے۔ حضرت فرماتے ہیں :

''ایک مرتبہ میری تلاش ہوئی، میں مجمع سے گھبرا کر پولیس چوکی سے آگے سڑک پر چلا گیا تھا۔ آخر مولانا انعام الحسن صاحب نے مجھے دریافت کرلیا، اور میں حاضر ہوا۔ مجھے اشارہ فرمایا کہ کان میرے لبوں کے پاس لاؤ پھر فرمایا کہ لوگوں کو ذکر کی تاکید اور مولانا عبدالقادر صاحبؒ کی مجلس میں بیٹھنے کی ہدایت کرو۔''(۲)

یہ وفات سے چار پانچ روز پہلے کا واقعہ ہے۔

۱۲-۱۳ر جولائی کی درمیانی شب میں طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور صبح کی اذان سے پہلے پہلے حادثہ پیش آ گیا۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں :''سوانح کے الفاظ میں عمر بھر کا تھکا ہوا مسافر کہ شاید کبھی اطمینان کی نیند سویا ہو منزل پر پہنچ کر میٹھی نیند سویا۔''

حضرتؒ پر اس حادثہ کا گہرا اثر پڑا۔ سکون کے لئے تدفین کے بعد اپنے بعض

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۱۰

(۲) ایضاً

www.abulhasanalinadwi.org

رفقاء کے ساتھ ہمایوں کے مقبرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ واپسی پر خود حضرت شیخ نے حضرتؒ سے تعزیت کی اور تسلی دی۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات کے بعد

حضرت کا موقف، طریق فکر اور عملی جدوجہد

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی حیات میں حضرتؒ پوری طرح تبلیغی کام میں منہمک رہے۔ حضرت دہلویؒ کی بے پایاں شفقتیں اور عنایتیں حضرت پر اتنی تھیں کہ کسی دوسری فکر یا تحریک کی طرف نظر کرنے کا باقاعدہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا، لیکن حضرت دہلویؒ کی وفات کے بعد وہ کیفیت نہیں رہی۔

اس باب میں حضرتؒ نے امام غزالیؒ کے بارے میں جو دوسطریں تحریر فرمائیں ہیں وہ پوری طرح خود حضرت پر صادق آتی ہیں ''علو ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز تھا، انھوں نے فکر و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہم عصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، اور جس ترقی یافتہ مقام پر پہونچے ان کے کانوں میں یہی صدا آئی

ع مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ہے''(۱)

حضرتؒ نے ''میرا موقف اور طریق فکر'' کے عنوان سے اس کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے یہاں قدرے اختصار کے ساتھ اسکو نقل کیا جاتا ہے :

''حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی سے گہری عقیدت، ان کے فہم دینی و اخلاص پر کامل اعتماد، اس کام کی افادیت وضرورت پر یقین اور نہ صرف عملی شرکت بلکہ ایک داعی و ترجمان کے فرائض انجام دینے کے ساتھ واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچہ کی مکمل شکست وریخت عمل میں نہیں آئی تھی اور اسکی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچہ نے نہیں لی تھی۔

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول ص ۱۹

www.abulhasanalinadwi.org

میرا ایک فکری و علمی پس منظر (Background) تھا۔ اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں اور ان کی مرکزی شخصیتوں کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان کے تعارف و تذکرہ نویسی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ میں ہر دور میں منصوصات و غیر منصوصات اور مقاصد و وسائل میں فرق کرتا رہا، اور میرے نزدیک خوب سے خوب تر کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح میرے نزدیک ہر تحریک، ہر دعوت اور ہر ادارہ میں جو دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو، نمو وارتقاء زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت، اور جائز اور ضروری حد تک ان کی تکمیل اور زندگی سے تطبیق کی کوشش ضروری ہے ورنہ وہ تحریک اور ادارہ نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم اور جمود کا شکار ہو جائے گا اور اس کی افادیت محدود سے محدود تر ہو کر رہ جائے گی۔

ان خیالات نے جو میرے خاص ماحول، مطالعہ اور ذہنی ساخت کا نتیجہ تھے کسی دور میں ساتھ نہیں چھوڑا، اور میں مولانا کی حیات میں بھی کبھی کبھی تنہائی میں اقبال کا یہ شعر پڑھتا تھا ؎

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز وساز رومی، کبھی پیچ وتاب رازی

لیکن مولانا کی قوت نسبت اور بے پایاں شفقت اور عملی مشغولیت نے ان کی حیات کے پورے عرصہ میں اس فکر کو دبا رکھا تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد وہ نمایاں طریقہ پر ابھرنے لگی، اس نے پہلے یہ شکل اختیار کی کہ کام کو جواب سارے ہندوستان میں تقریباً پھیل چکا تھا اور دوسرے ممالک کی طرف بڑھ رہا تھا، کچھ زیادہ منظّم، موثر اور ذہین و علمی طبقہ کے لئے اطمینان بخش اور پرکشش بنانے کے لئے اصول دعوت اور اس کے ان اجزاء کو قائم رکھتے ہوئے (جن کو اس تحریک میں چھ نمبر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں

www.abulhasanalinadwi.org

کی ضرورت ہے۔ مختلف مجالس میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور ان کے اہل شوریٰ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی مگر اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن اس کا ساتھ نہیں دیتا اور وہ اس کی تائید میں نہیں ہیں اور شاید مولانا کی وفات کے بعد دعوت کے اس ابتدائی مرحلہ میں اسی احتیاط کی کسی قدر ضرورت بھی تھی۔ کئی بار متوجہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک خود اصل داعی کے ذہن میں جو دعوت کا روح رواں ہے کسی ضرورت کا احساس اور کسی تبدیلی کا تقاضا پیدا نہ ہو باہر سے مشورہ دینا مفید اور موثر نہیں ہوا کرتا۔''(۱)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے دل میں حضرتؒ کی پوری قدر و منزلت تھی، کام کے سلسلہ میں حضرتؒ کی قربانیوں کا اعتراف بھی تھا مگر وہ اس کام کو بالکل اسی طریقہ پر لے کر چلنا چاہتے تھے جو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اختیار فرمایا تھا اور کام کی وسعت کے باوجود وہ اس کے طریقہ کار میں وسعت کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ اسی زمانہ کے ایک طویل یادگار مکتوب کے بعض اقتباسات یہاں پر پیش کئے جارہے ہیں جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے حضرتؒ کو تحریر فرمایا تھا۔

''مخدوم و مکرم و معظم و محترم جناب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت عالی! مجھے دل سے اعتراف ہے کہ آپ نے حضرت مرحوم کی اس وقت قدر کی جس وقت یہ ناچیز ناقدری کر رہا تھا، آپ نے اس عمل کی طرف قدم اٹھایا جس وقت یہ حقیر اس سے پہلوتہی کر رہا تھا۔ آپ سنتے تھے، تعمیل کرتے تھے، سمجھتے تھے اور محفوظ رکھتے تھے اور اس کام کے انہماک اور دعوت کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے جارہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعوت میں تاثیر دی اور اضلاع متصلہ سے باہر یہ کام آپ ہی کی وساطت و دعوت سے پھیلا اور علمی حلقہ میں آپ ہی کی وساطت سے یہ چیز پہنچی۔

(۱) کاروان زندگی اول ۳۱۴-۳۱۶

علماء میں جماعتوں کو لیکر پھرنے کی طرف آپ ہی نے سبقت فرمائی، علمی حلقہ کی طرف اس دعوت کو لیکر آپ ہی بڑھے، علماء کی طبائع کا جائزہ حضرتؒ مرحوم آپ ہی کی وساطت سے لیا کرتے اور ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ آپ ہی کے ذریعہ فرماتے۔

غرض کہ حق تعالیٰ شانہ آپ کو نہایت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے خوب ساتھ دیا۔'' (۱)

اس کے بعد حضرت نے یہ طے فرمالیا کہ مرکز نظام الدین سے تعلق اور دعوت کی مشغولیت کو جاری رکھتے ہوئے اپنے دائرہ کار میں اس کو زیادہ مفید بنانے اور دعوت وتفہیم کے لئے اپنی زبان استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ سلسلہ ۴۴ء سے لیکر ۵۲-۵۳ء تک جاری رہا۔ اس کے لکھنؤ اور اس کے اطراف پر بڑے اچھے اثرات مرتب ہوئے، اور یہاں کا صاحب علم وفکر طبقہ اس کام کی طرف متوجہ ہوا۔

اسی سلسلہ میں حضرت نے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی رفاقت میں صوبہ بہار، صوبہ سرحد پنجاب اور کشمیر کے دورے فرمائے اور ان علاقوں میں بڑے کامیاب اجتماعات ہوئے۔ ان کے علاوہ مرادآباد، بھوپال، سورت، بستی، سیتاپور، کانپور اور خود لکھنؤ میں اہم اجتماعات منعقد ہوئے جن میں حضرتؒ اور مولانا منظور نعمانیؒ کے خطابات ہوئے۔

۲۵؍جولائی ۱۹۴۵ء میں کشمیر کا دورہ ہوا۔ سری نگر میں میر واعظ مولانا محمد یوسف صاحب کے دولت کدہ پر قیام رہا۔ اسی سفر میں نسیم باغ میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات ہوئی۔

لکھنؤ کے بڑے اجتماعات میں لکھنؤ کے ایک قصبہ رحیم آباد کا اجتماع خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ۶، ۷، ۸؍مئی ۱۹۴۶ء کو لکھنؤ کی جماعت مرکز کے زیر انتظام اسی نقشہ پر منعقد ہوا اور اس میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے علاوہ خود

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مشاہیر امت کی نظر میں از مولانا ممشاد قاسمی صاحب ص ۴۹-۵۰

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے بھی شرکت فرمائی، ان حضرات کے علاوہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بھی جلسہ میں شریک ہوئے۔

اس زمانہ میں تبلیغی اجتماعات جمعہ کی شب میں دارالعلوم کی مسجد میں منعقد ہوا کرتے تھے، جماعتیں مسجد میں قیام کرتیں، شہر کے دینی ذوق رکھنے والے بھی شب گذاری کے لئے آجاتے تھے۔ مغرب بعد کی تقریر حضرت یا مولانا نعمانیؒ کی ہوتی تھی۔ حضرت کی مرتب کردہ کتاب جو سیرت رسول اکرمؐ کے نام سے طبع ہوگئی ہے، اس وقت پڑھ کر سنائی جاتی تھی۔ فجر بعد عموماً حضرت ہی کا خطاب ہوتا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ

> ''آخر شب نوافل وذکر سے مسجد میں عجب نورانی فضا نظر آتی تھی۔ اکثر اہل ادراک اس میں عجیب سکینت ونورانیت محسوس کرتے تھے۔ لوگوں میں ایک دوسرے کی خدمت کرنے، ایثار وتواضع اور محبت کے نمونے صاف نظر آتے تھے۔ دارالعلوم کے طلبہ کو بھی ان اجتماعات سے بڑا فائدہ پہنچا اور اپنے اپنے وطن جاکر انھوں نے کام کی داغ بیل ڈالی۔''

www.abulhasanalinadwi.org

ریاضت ومجاہدہ کا دور

حضرتؒ کی زندگی کے مختلف ادوار میں سخت دشوار گذار گھاٹیاں بھی آئیں اور بڑی ریاضتوں سے بھی گذرنا پڑا لیکن حضرت نے بڑے صبر واستقامت کے ساتھ ان کو برداشت کیا۔ جب حضرتؒ کے والد ماجد نے رحلت فرمائی اس وقت حضرت کی عمر صرف نو سال تھی، کئی سال سخت تنگی کے گزرے پھر بھائی کو اللہ نے فراخی عطا فرمائی، تعلیم وتربیت کا انتظام ہوا، مگر اس وقت ماحول کچھ ایسا تھا کہ لوگ طعنہ دیتے تھے، اس کا دل پر اثر پڑنا طبعی ہے، حضرت برداشت فرماتے رہے۔ اپنوں نے بھی ملامت کی، غیروں نے بھی کہا، مگر استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ مختلف راستوں سے

ریاضتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ دارالعلوم میں تدریس کا آغاز ہوا۔ حضرت میں وہی زاہدانہ رنگ تھا جو آباء کرام سے ورثہ میں ملا تھا۔ چالیس روپیہ تنخواہ تھی، وہ بھی چھوڑ دی۔ وہ زمانہ بڑے مجاہدہ کا گزرا، ناشتہ کا تو گذر ہی نہ تھا، فجر بعد ٹہلنے تشریف لے جاتے اور ایسے وقت آتے کہ ناشتہ کا وقت گذر چکا ہو، درجہ میں پڑھانے کے لئے بیٹھ جاتے، اسی زمانہ کے ایک شاگرد مولانا سید محمد طاہر صاحب منصور پوری خود اپنی آپ بیتی سناتے ہیں کہ

''ایک مرتبہ ہمیں شبہ ہوا اور یہ تقاضا ہوا کہ ناشتہ تیار کر کے لے جائیں جب ہم ناشتہ لے کر پہونچے تو ان کو ناشتہ نہ کرنے کی وجہ اس حال میں دیکھا کہ کمزوری کیوجہ سے اٹھنا مشکل ہو رہا تھا، اتفاق سے اس دن اور دنوں کے مقابلہ میں ناشتہ کی حاجت زیادہ تھی چنانچہ وہ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں اور کھایا بھی رغبت سے۔''(۱)

اسی زمانہ میں حضرتؒ ایک سال کے لئے دارالعلوم میں الگ مکان لے کر رہے تھے، حضرتؒ اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''۱۹۴۶ء کی ابتداء میں جب میں دارالعلوم سے ملازمت کا تعلق منقطع کر چکا تھا اور اپنے شوق سے بعض درجوں میں کچھ اسباق پڑھا دیا کرتا تھا، معلوم نہیں کیا خیال پیدا ہوا کہ دارالعلوم کی مسجد سے متصل جو چھوٹا سا مکان تعمیر ہوا تھا اس میں، میں نے بھائی صاحب سے ضابطہ کی اجازت لیکر رہنا شروع کر دیا اور والدہ صاحبہ اور گھر والوں کو بھی لے آیا، اس وقت معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، نہ کتابوں کے معاوضہ اور نفع کا کوئی سلسلہ۔ یہ سال اقتصادی طور پر سخت پریشانی کا گذرا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ امین آباد کے چوراہے پر نظیر آباد جانے والی سڑک کے کنارہ کھڑے ہو کر میں نے جیب سے کئی مرتبہ گھڑی نکالی کہ اس کو کسی گھڑی کی دوکان پر آدھے پونے دام پر بیچ دوں، اس سے کچھ دن کام

(۱) ماخوذ از تعمیر حیات مفکر اسلام نمبر ص ۲۸۶

www.abulhasanalinadwi.org

چلے لیکن پھر اس خیال سے ہمت نہیں ہوئی کہ دوکان دار کہیں چوری کا نہ سمجھے۔ زیادہ قرض چڑھ گیا اور دفتر دار العلوم نے مطالبہ کیا تو اللہ مغفرت کرے مولوی ظہیر الحسن صاحب رئیس کاندھلہ (شہید ۱۹۴۷ء) کو خط لکھا اور ایک رقم قرض منگوائی۔ انھوں نے بڑے اہتمام سے اور بڑی عجلت کے ساتھ بھیجی۔ یہ پورا سال بڑی پریشانی میں گذرا اور سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بے برکتی کیوں ہے؟

ایک روز معلوم ہوا کہ بھائی صاحب میرے اس علاحدہ قیام سے بہت مغموم اور متاثر ہیں، ان کو اس کا بڑا قلق ہے کہ ان کی زندگی میں، میں نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے علاحدہ قیام کا انتظام کیا، میں نے ان سے روکر معافی مانگی اور جبکہ تقریباً ایک سال گذر رہا تھا پھر اپنے اسی قدیم مکان میں آ گیا۔ پھر یاد نہیں کبھی ایسی تنگی اور پریشانی پیش آئی ہو۔"(۱)

دوہری آزمائش

اس تنگی و پریشانی کے حال میں ایک طرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کی طرف سے اور دوسری طرف عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی طرف سے پیش کشیں ہوئیں۔ یہ آزمائش پہلی آزمائش سے بڑھ کر تھی مگر اللہ نے اس میں بھی حضرتؒ کو ثابت قدم رکھا۔

یہاں امام احمد کا وہ واقعہ یاد آتا ہے کہ جب معتصم کے بعد واثق کا دور آیا اور اس نے معتصم کے بالکل برخلاف بڑے اعزاز و اکرام کا معاملہ کیا تو امام صاحبؒ فرماتے تھے یہ آزمائش پچھلی آزمائش سے بھی زیادہ سخت ہے۔

حضرت خود تحریر فرماتے ہیں :

"مجھے جو چیز انکے قبول کرنے سے مانع اور دامنگیر ہوئی وہ یہ تھی کہ اگر دنیا میں کسی نے پوچھا یا آخرت میں سوال ہوا کہ تم نے اپنے گھر اور مدرسہ کی ملازمت اسلئے چھوڑی تھی کہ وہاں تنخواہ قلیل تھی اور دوسری جگہ کی ملازمت اسلئے

(۱) کاروان زندگی اول ۳۲۳-۳۲۴

www.abulhasanalinadwi.org

قبول کی کہ اس میں اضعافاً مضاعفہ مل رہا تھا تو میں کیا جواب دونگا۔"(۱)

ایک مبارک قافلہ کی دائرہ شاہ علم اللہؒ آمد

فروری ۱۹۴۷ء کی کسی تاریخ کو حضرت رائے پوریؒ، حضرت شیخ الحدیثؒ مولانا محمد یوسف صاحبؒ علماء و اعیان کی ایک جماعت کیساتھ لکھنؤ اور رائے بریلی تشریف لائے۔ رائے بریلی تشریف آوری کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں:

"۸ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ (۳۰ فروری ۱۹۴۷ء) کو اس پورے قافلہ کا مستقل لاری کے ذریعہ رائے بریلی ورود ہوا۔ استقبال کے لئے بستی کے سارے حضرات نیز اصحاب شہر موجود تھے۔ ایک شب و روز قیام رہا جو عجیب کیف و سرور کا تھا۔ راقم سطور جب صبح حضرت شیخ کو وضو کرانے لگا (اسی دن واپسی تھی) تو شیخ نے بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا "مولوی صاحب! یہاں سے جانے کے لئے دل بہت برا ہو رہا ہے۔"(۲)

حیدرآباد کا سفر اور مولانا گیلانیؒ سے ربط و تعلق

حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی معرکۃ الآراء تصنیف "نزھۃ الخواطر" کا ابھی تک دوسرا حصہ چھپ سکا تھا اور وہ بھی حافظ ابن حجر کی "الدرر الکامنہ" کے ذیل کے طور پر شائع ہوا تھا۔ حسن اتفاق کہ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ملاحظہ فرمایا تو حضرتؒ کو بڑے گہرے تاثر کا خط لکھا اور اسکے شائع ہونے کی تحریک فرمائی۔ دائرۃ المعارف کے ذمہ داروں کو اس کی طباعت پر آمادہ کیا، جب اس کام میں تاخیر ہوئی تو مولانا ہی کی دعوت پر حضرتؒ نے حیدرآباد کا سفر کیا، اور براہ راست دائرۃ المعارف کے ذمہ داروں سے مل کر کتاب کی طباعت کی

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۹۵، یہ خیال رہے کہ حضرت نے جب ندوہ کی تنخواہ ترک فرمائی تو وہ صرف چالیس روپیہ تھی اور حیدرآباد و علی گڑھ کی طرف سے چار سو اور سات سو کی پیشکش تھی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ آج سے ۴۶-۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے۔

(۲) سوانح حضرت شیخ الحدیث ص ۱۱۳

www.abulhasanalinadwi.org

طرف توجہ دلائی۔ جس کے نتیجہ میں اسکا پہلا حصہ چند ہی مہینوں میں شائع ہو گیا۔ اس سفر میں حضرتؒ، مولانا ہی کے مہمان رہے۔ مولانا سے تعارف تو سالوں سے تھا۔ طالب علمی کے انتہائی دور میں ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرت کو مولانا سے قرآن مجید میں استفادہ کے لئے حیدرآباد بھیجنے کا بھی ارادہ فرمایا تھا۔ اس کی نوبت نہیں آسکی لیکن حضرتؒ کا تعلق قائم رہا۔ اور ۱۹۴۱ء سے مراسلت کا سلسلہ بھی وقفہ وقفہ سے جاری رہا۔

حضرتؒ نے مولانا کی کتاب "النبی الخاتم" بڑے تاثر کے ساتھ پڑھی تھی۔ خود حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں "میں نے ساری عمر میں سیرت نبویؐ میں رحمۃ للعالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ موثر کتاب نہیں پڑھی۔" اس سفر سے مزید قرب و ارتباط کی تقریب پیدا ہوئی۔ حضرت فرماتے ہیں :

"اس سفر کا سب سے بڑا تحفہ مولانا کی علمی مجالس اور پرلطف و معلومات افزا صحبتیں تھیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے محترم مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ سبکدوش وظیفہ یاب ہو کر لکھنؤ آچکے تھے۔"(۱)

اس سفر میں صوفی محمد اقبال صاحب مہاجر مدنیؒ بھی ساتھ تھے جو اس وقت حضرت کے دل گرفتہ اور بڑے معتقد تھے۔ بعد میں حضرتؒ ہی کے مشورہ سے حضرت شیخؒ سے وابستہ ہوئے اور اجازت و خلافت پائی۔

رمضان میں نظام الدین کا قیام اور حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں

رمضان کی آمد آمد تھی، حیدرآباد سے گجرات اور بمبئی ہوتے ہوئے حضرتؒ رائپور اور سہارنپور ایک ایک روز کے لئے تشریف لائے۔ سہارنپور میں معلوم ہوا کہ شیخ نظام الدین تشریف لے گئے ہیں، حضرت دو تین روز قیام کے ارادہ سے نظام الدین تشریف لے گئے۔ جب واپسی کا ارادہ ظاہر فرمایا تو شیخؒ نے بڑے درد سے فرمایا کہ "مولوی صاحب! ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟" حضرت نے مزید چند روز قیام

(۱) پرانے چراغ اول ص ۳۲۲

www.abulhasanalinadwi.org

فرمایا، پھر شیخ کی ایماء سے پورا رمضان نظام الدین میں گذارنے کا فیصلہ فرمالیا۔

اس قیام میں شیخ نے خصوصی توجہ اور شفقت فرمائی۔ عید کے بعد اپنے معمول کے مطابق رائے پور تشریف لے گئے تو حضرت کو بھی ہمراہ لے گئے۔ حضرت رائپوری سے بڑے اختصاص کیساتھ ملایا۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں :

''محبت واختصاص کے الفاظ کے ساتھ مجھے حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرتؒ سے پہلے ہی سے عقیدت ومناسبت تھی اوران کی شفقت خصوصی بھی اپنے حال پر پاتا تھا لیکن اس حاضری کے بعد سے اس تعلق میں اور استحکام اور استقلال پیدا ہوگیا۔''(۱)

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی طرف سے اجازت وخلافت اور خصوصی شفقت ومحبت

حضرتؒ نے حضرت لاہوریؒ کے شیخ حضرت خلیفہ غلام محمد دینپوریؒ سے بیعت کی تھی لیکن تربیت وسلوک کا تعلق حضرت لاہوریؒ سے ہی رہا۔ تعلیم وتدریس، تصنیف و تالیف، دعوت وتبلیغ اور حضرت دہلویؒ وحضرت رائپوریؒ سے عقیدت ومحبت کے باوجود حضرت لاہوریؒ سے وہ روحانی تعلق نہ صرف یہ کہ قائم رہا بلکہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ ۱۹۴۶ء میں حضرت لاہوریؒ نے حج کا سفر کیا۔ واپسی پر حضرتؒ نے اپنے شیخ کو تہنیت کا خط لکھا۔ اس کے جواب میں حضرت لاہوری نے حضرتؒ کو لاہور بلایا اور ایک روز تنہائی میں اپنے سلسلہ قادریہ میں اجازت مرحمت فرمائی اور مسجد خیف منیٰ میں انھوں نے جو غیر معمولی دعا واستخارہ کا اہتمام کیا تھا اور جس کے نتیجہ میں اشارہ غیبی پاکر انھوں نے اجازت وخلافت کا ارادہ فرمایا تھا اس کا بھی تذکرہ کیا۔

حضرت لاہوریؒ کی شفقتوں کا کچھ اندازہ ان خطوط سے کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے اپنے محبوب ترین مسترشد کو ارسال فرمائے ہیں۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۲۱

www.abulhasanalinadwi.org

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

''میرے دل میں آپ کی جو عزت ہے اسے ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں نے حج کی رات مسجد خیف میں آپ کے درجات کی ترقی کے لئے بارگاہ الٰہی سے استدعا کی اور الحمد للہ اس نے بارگاہ الٰہی میں قبولیت پائی۔''

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

''چونکہ آپ میرے ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ کا جو فضل آپ پر ہے وہ میرے لئے صد فخر ہے۔ مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلّمہٗ (فرزند اکبر) کی ترقی سے فرحت ہو سکتی ہے اسی طرح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی اور سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے۔''

ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :

''آپ کی ہر کامیابی سے میرے دل میں جتنا سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں جس کو اس درجہ کی راحت حاصل ہو، میرا دل آپ کی ترقیٔ دارین کے لئے بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہے۔''

ایک مرتبہ شاہی مسجد میں تالاب کے کنارے مجلس ہو رہی تھی، بلا کسی سابقہ تمہید کے اچانک فرمانے لگے ''مولوی ابوالحسن صاحب! میں آپ کی شرافت کا قائل ہو گیا۔'' تین دفعہ اس جملہ کو دہرایا۔

پنجاب کے ایک عالم مولانا عبدالحنان صاحب کہتے تھے کہ ہم لوگ ملتان جیل میں تھے، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے حضرات تشریف رکھتے تھے۔ بلا کسی سابقہ تمہید و تقریب کے مولانا احمد علی صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ آپ لوگ مولوی ابوالحسن صاحب کے لئے دعا کیجئے، سب نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔

حضرتؒ کے تعلق و محبت کا اندازہ اس مضمون سے کیا جا سکتا ہے جو پرانے چراغ میں حضرت لاہوریؒ پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مکتوبات کے متعلق حضرت تحریر فرماتے

www.abulhasanalinadwi.org

ہیں :

''میں مولانا کے مکتوبات پڑھتا ہوں تو ان کی پدرانہ شفقت اور مربیانہ عنایت کو دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی ہے۔''

مزید فرماتے ہیں :

یہ خطوط قلب حزیں کی تسکین اور یاس ودل شکستگی کے شدید حملوں کے وقت سکون وتقویت کا بڑا ذریعہ ہیں۔

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی(۱)

www.abulhasanalinadwi.org

(۱) پرانے چراغ اول ص ۱۶۱

آٹھواں باب

اسفارِ حج اور عربوں میں دعوت و تبلیغ کا باقاعدہ آغاز اور اسکی کوششیں

"إلى ممثلي البلاد الاسلامية" کی تصنیف

مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی امارت کا دور تھا اور حضرتؒ اس کام میں اپنی وسیع فکر اور مخصوص اسلوب و طریقہ کار کے ساتھ مشغول تھے کہ اپریل ۱۹۴۷ء میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی دعوت پر ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں عرب ممالک کے نمائندوں کو بھی دعوت دی گئی تھی، یہ اپنی فکر و دعوت پیش کرنے کا ایک زریں موقع تھا، مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے حضرتؒ سے دہلی آنے اور اس کانفرنس میں آئے ہوئے عربوں کو خطاب کرنے کی خواہش ظاہر کی، حضرتؒ نے اس کے لئے "إلى ممثلي البلاد الاسلامية" کے عنوان سے ایک مقالہ تیار کیا جسکا مرکزی خیال اور بنیادی مضمون ۱۹۴۴ء میں کی گئی پشاور کی سیرت کانفرنس کی تقریر سے ماخوذ تھا، جس کی تفصیلات گذر چکی ہیں۔

کانفرنس میں عرب ملکوں کے چند ہی نمائندے شریک ہو سکے جن میں شیخ عبد الوہاب عزام خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو مصر سے اخوان کے نمائندے کے طور پر تشریف لائے تھے۔ ایک شام کو قریشی صاحب نے چائے کی دعوت کا اہتمام کیا، اس میں ایک یا دو عرب نمائندے شریک ہوئے، اسلئے اس مقالہ کو وہاں پیش کرنے کی

www.abulhasanalinadwi.org

نوبت نہیں آ سکی۔لیکن اس کے چند ہی مہینے کے بعد حجاز کا سفر ہوا، اور وہاں اس مقالہ نے بڑا کام کیا، اور اس سے وہاں پورا فائدہ اٹھایا گیا۔

پہلا سفرِ حج اور وہاں دعوتی کوششوں کا آغاز

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو ساری زندگی یہ فکر رہی کہ حجازِ مقدس ہی دعوت و تبلیغ کے اس کام کا سرچشمہ اور منبع ہے، وہیں سے یہ صدا بلند ہونی چاہئے، اور وہاں کے باشندوں کو اس کام کی طرف خاص توجہ کرنی چاہئے، مولانا محمد یوسف صاحبؒ کو بھی یہ جذبہ ورثہ میں ملا تھا اور انھوں نے اسی لئے مولانا عبید اللہ صاحب بلیاویؒ کو حجاز کے قیام اور وہاں کے کام پر متعین فرمایا، مولانا پوری جانفشانی کے ساتھ اس میں مشغول رہے، اور بڑی حد تک عوام اس کام سے متعارف ہوئے، مگر وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ اور علمی حلقوں میں ابھی تک اس کی آواز نہیں پہنچ سکی تھی اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس طبقہ کو جس سطح اور جس اسلوب و زبان سے مخاطب کرنا ضروری تھا، اس کی کمی تھی اس کو مولانا خود بھی محسوس کر رہے تھے، اسی لئے انھوں نے مولانا محمد یوسف صاحبؒ کو بار بار توجہ دلائی کہ یہاں کسی ایسے بااثر اور ادبی ذوق رکھنے والے داعی کی ضرورت ہے جو اس طبقہ کو متاثر کر سکے اور ان کو اس کام کی طرف مائل کرے۔ حضرتؒ کے خداداد ادبی ذوق، زبان و بیان پر زبردست قدرت اور پھر اس دعوتی فکر و درد سے یہ حضرات بخوبی واقف تھے۔ چند ہی مہینہ قبل "إلى ممثلي البلاد الاسلامية" کے عنوان سے حضرت نے جو مقالہ تحریر فرمایا تھا (جس میں زبان و بیان کا زور بھی ہے اور دعوت فکر و عمل بھی) وہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے مطالعہ میں آ چکا تھا اور مولانا عبید اللہ صاحبؒ کو بھی اس کا علم تھا۔ مرکز نظام الدین میں حضرتؒ کا قیام حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے حجرہ ہی میں ہوتا تھا اور ان سے علمی مذاکرہ اور گفتگو ہوتی رہتی تھی، اسلئے پہلے ہی سے ان کو حضرتؒ کے اس ذوق کا علم تھا، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ قرعۂ فال حضرت ہی کے نام پڑا، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد

www.abulhasanalinadwi.org

زکریا صاحبؒ کے مشورہ اور ایماء سے یہ طے ہو گیا کہ حج اور تبلیغ و دعوت کی نیت سے حجاز مقدس کا سفر ہو، حضرت نے والدہ محترمہ اور اہلیہ صاحبہ کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ فرمایا، پھر چھوٹی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ بھی ساتھ ہو گئیں، اس لئے حضرت شیخ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مختصر قافلہ میں گھر کا کوئی ایسا فرد بھی ہونا چاہئے جو حضرتؒ کو خانگی انتظامات سے فارغ رکھے اور یکسوئی کے ساتھ کام ممکن ہو، اس کے لئے حضرتؒ کے سب سے بڑے بھانجے مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کا انتخاب ہوا، جو ایک طرف تو حضرتؒ کے مزاج شناس دینی و علمی کاموں میں دست راست تھے اور دوسری طرف ان کو تبلیغ و دعوت کا اچھا ذوق تھا، اور مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا اعتماد بھی حاصل تھا۔

۲۶/جون ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ سے سفر کا آغاز ہوا۔ یہ اس مردِ مومن کا سفر حجاز تھا جس کی گھٹی میں وہاں کی عظمت و محبت پڑی تھی، ۹/جولائی مطابق ۱۹/شعبان ۱۳۶۶ھ کو کراچی سے مغل لائن کے اسلامی جہاز سے جدہ روانگی ہوئی، کیفیات کا احاطہ کون کرسکتا ہے، جس کو کئی کئی نسبتیں حاصل ہوں، اس کی قسمت نہ یاوری کرے گی تو پھر کون بخت آور ہوگا، عمر بھر کی تمنا پوری ہو رہی ہے، اپنے خوابیدہ ارمانوں کا کچھ تذکرہ حضرت ممدوح کے الفاظ میں یہ ہے کہ "اکثر "امین آباد" سے تیزی کے ساتھ اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے تانگوں کو دیکھ کر کبھی کبھی دل میں ارمان اٹھتا تھا کہ کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا کہ جب ہم بھی حج کے لئے اسٹیشن جا رہے ہوں گے۔"(۱) اللہ نے دن پورے کئے، ضعیف والدہ بھی ساتھ تھیں، سفر بھی بحری جہاز سے اور خاصا طویل و پر مشقت تھا، مگر اللہ نے سہولت و راحت کا سامان فرمایا، پھر اس راہ کی مشقتیں بھی اللہ والوں کے لئے عین راحت اور سراپا رحمت، پورا سفر وہاں کی تیاری کرنے کرانے میں گذارا، دعوتی پروگراموں کا سلسلہ بھی جاری رہا، گھر کی خواتین نے بھی یہ مشن سنبھالا کہ وہاں پہنچ کر کوئی کسر نہ رہ جائے، کوئی رفیق محروم نہ رہے۔

دس روز میں سفر تمام ہوا، جدہ کا ساحل آ گیا، بندرگاہ پر قدم رکھتے ہی وہ کیف و

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۲۹

www.abulhasanalinadwi.org

سرور حاصل ہوا جو اللہ کے بہت سے خوش نصیب بندوں کو حرمین شریفین میں حاصل ہوتا ہے۔ جس بندہ نے اپنی پوری جوانی راہ حق میں لگائی ہو اس کو نہ نوازا جائے گا تو کس کی قسمت جاگے گی؟! وہاں پہونچ کر حضرتؒ بزبان حال یوں فرماتے ہیں :

درو دیوار سے عاشقیت ٹپکتی ہے، یہاں نہ بیت اللہ، نہ مسجد نبوی، لیکن محبت کا آئین نرالا ہے، جدہ کی گلیوں سے بھی انس و محبت معلوم ہوتی ہے۔(۱)

جدہ ہی میں رمضان کا چاند ہو گیا، ایک روز وہیں قیام رہا، حج میں ابھی کئی مہینے باقی تھے اسلئے دوسرے دن مدینہ منورہ روانگی ہوئی، راستہ کے کیف و حال کا بیان کوئی کیا کرے۔ حضرت ہی فرماتے ہیں :

''درود شریف زبان پر جاری ہے، دل وفورِ شوق سے امنڈ رہا ہے، عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے اور کیوں روتا ہے؟ کبھی عربی میں گنگناتا ہے، کبھی دوسری زبانوں میں!

بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی، جس قدر طیبہ قریب ہوتا جارہا ہے، ہوا کی خنکی پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک میں دل کی گرمی بڑھتی جارہی ہے۔(۲)

مدینہ منورہ پہونچنے سے پہلے بئر عروہ کے قریب حضرتؒ سواری سے اتر گئے، اور ادباً پا پیادہ چلنا ہی پسند فرمایا، قیام کی جگہ بھی مسجد نبویؐ کے زیر سایہ ملی، حضرت مدنیؒ کے برادرِ خورد مولانا سید محمود احمد صاحب نے بڑی خصوصیت برتی اور مدرسہ علوم شرعیہ کا پورا مکان حوالہ کر دیا۔ ایک رات شیخ الاسلام عارف حکمت بیک کے کتب خانہ میں وہاں کے ناظم شیخ ابراہیم خربتلی نے بڑے اہتمام سے یہ کہہ کر ٹھہرایا کہ یہ آپ کے جد امجد سید حسن مثنیٰ ابن سیدنا حسنؓ کا مکان ہے۔

وسط رمضان سے حضرتؒ کی طبیعت خراب ہوئی اور اسہال کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ رکنے کو نہ آتا تھا، اس کی وجہ سے ضعف بہت بڑھ گیا۔ حضرت اپنے ایک مکتوب

---

(۱) اپنے گھر سے بیت اللہ تک ص ۲۹

(۲) اپنے گھر سے بیت اللہ تک ص ۳۲

www.abulhasanalinadwi.org

میں مولانا نعمانی کو تحریر فرماتے ہیں :

''میری صحت ایسی گر گئی کہ بعض دن تو مجھے اپنی زندگی خطرہ میں نظر آنے لگی، اس سے تسکین ہوتی تھی کہ بقیع میں انشاء اللہ امام حسن کے پاس جگہ مل جائے گی۔''(۱)

شوال کے اخیر اخیر تک الحمدللہ صحت بحال ہوگئی اور مدینہ منورہ کا یہ قیام بڑی کیفیتوں کے ساتھ پورا ہوا۔

۲۰/ذیقعدہ کو حج قران (۲) کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ روانگی ہوئی۔ بیت اللہ پر پہلی نگاہ کے وقت جو کیفیت ہوئی وہ الفاظ میں بیان کرنے کی نہیں، کریم رب نے جو بھی ضیافتیں فرمائی ہوں۔ حضرتؒ نے بعد کے کسی سفر حج میں اپنے ایک عزیز سے جو پہلی مرتبہ حج کیلئے آئے تھے یہ فرمایا تھا کہ تم ہمارے ساتھ حاضری دینا کہ پہلی حاضری کے وقت اللہ کی طرف سے خاص مہمانی ہوتی ہے۔ ان عزیز کا بیان ہے کہ میں ساتھ حاضر ہوا، حضرتؒ نے جب طواف کی ابتدا فرمائی اور حجر اسود کو استلام کیا تو بے ساختہ یہ دعا زبان سے نکلی ''**اللھم اعتق رقابنا و رقاب آباء نا و امھاتنا من النار**'' پھر ایسا گریہ طاری ہوا کہ میں نے کبھی بھی وہ کیفیت نہیں دیکھی تھی۔

تین ماہ مکہ مکرمہ میں قیام رہا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے انتظام فرمایا اور حرم شریف سے متصل مدرسہ فخریہ عثمانیہ کے ذمہ دار مولوی قربان محی الدین صاحب نے (جو پہلے سے تعلق رکھتے تھے) مدرسہ میں ٹھہرایا۔ یہیں سے جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان واپسی ہوئی۔ چونکہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہو چکی تھی اور اس کے نتیجہ میں پورے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی، جگہ جگہ خونریزی تھی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ اسلئے ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر بجائے کراچی کے واپسی بمبئی کے راستہ سے ہوئی اور وہاں سے

---

(۱) ماہنامہ الفرقان ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ

(۲) قِران اس حج کو کہتے ہیں جس میں حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا جاتا ہے اور وہ عمرہ اور پھر حج سے فراغت کے بعد ہی کھلتا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

بھی لکھنؤ تک بڑی احتیاط وتحفظ کے ساتھ سفر طے ہوا۔

قیام حجاز میں پیام حجاز

حج وعمرہ کے علاوہ سفر حجاز کا ایک بڑا مقصد وہاں کے باشندوں کو ان کا مقام یاد دلانا اور انکو ان کا پیغام سنانا بھی تھا، خاص طور پر دانشور اور تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ صدا اسی لئے میں بلند کرنی تھی جس سے وہ مانوس ہوں۔ ”کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم“ (لوگوں سے ان کی سطح کے مطابق گفتگو کرو) کا اصول ہر جگہ اور ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہر داعی کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے، تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے ان ہی کی زبان اور ان ہی کا اسلوب اختیار کرنا ضروری تھا۔

سفر سے چند ہی ماہ پہلے حضرتؒ نے ”إلیٰ ممثلی البلاد الاسلامیة“ کے عنوان سے جو مقالہ تحریر فرمایا تھا وہ شائع ہو چکا تھا اور سفر میں اس کے نسخے ساتھ تھے۔ حضرتؒ نے اس میں ایسا اسلوب اختیار فرمایا تھا جس میں پہلی مرتبہ پورے زور کے ساتھ طاقتور ادبی زبان میں دعوت پیش کی گئی تھی، اس میں دل کا سوز بھی تھا اور بیان کا ساز بھی، اور پہلی مرتبہ پوری جرأت وقوت کے ساتھ خاص طور پر عربوں کو خطاب کیا گیا تھا، یہ ان کے دل کی آواز تھی۔ اب تک اس طرح کا لٹریچر عربوں تک نہیں پہونچا تھا جس میں دل کے ساز کو چھیڑنے اور دماغ کو متاثر کرنے کی یکساں صلاحیت ہو، اس لئے اس رسالہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جہاز جب کامران میں ٹھہرا تو وہاں بھی یہ رسالہ تقسیم کیا گیا، خاص طور پر شہر کے قاضی اور ممتاز علماء تک پہونچانے کا انتظام کیا گیا۔

مدینہ منورہ کے قیام میں وہاں کے بڑے علماء، امام حرم اور سربرآوردہ لوگوں کو یہ رسالہ دیا گیا، ان لوگوں نے اس کو صرف یہی نہیں کہ قبول کیا بلکہ وہ اس کے داعی و ترجمان بن گئے۔ اس وقت مسجد نبویؐ کے ایک ممتاز استاذ حدیث شیخ علی الحرکان نے (جو بعد میں رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری بھی ہوئے) درسِ حدیث روک کر

www.abulhasanalinadwi.org

پورا رسالہ مسجد نبوی میں سنایا۔

مکہ مکرمہ میں وہاں کے کبار علماء سے ربط پیدا ہوا جس میں امام حرم شیخ عبد الرزاق حمزہ، علامہ سید علوی مالکی، شیخ امین کتبی، شیخ حسن مشاط، شیخ ابن عربی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے بھی رسالہ کو بڑی قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھا، مگر اس وقت کے نوجوان، ادباء، اہل قلم اور طبقہ علماء کے درمیان گہری خلیج حائل تھی اور ان تک بھی اس پیغام کو پہونچانے کی ضرورت تھی۔ اس سفر میں اسکی بنیاد تو پڑ گئی، لیکن باقاعدہ اس طبقہ میں اس وقت کام شروع ہوا جب حضرتؒ نے ۱۹۵۰ء میں حجاز کا دوسرا سفر فرمایا۔ اس سفر کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ شیخ عمر بن حسن آل الشیخ سے ربط و تعلق قائم ہوا جنکا وہاں بڑا اثر و رسوخ تھا، اس وقت کے قاضی القضاۃ شیخ الاسلام مملکت سعودیہ شیخ عبداللہ بن حسن کے وہ حقیقی بھائی اور خود ریاض کے ''ہیئت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے رئیس تھے، ولی عہد امیر سعود کو ان پر بڑا اعتماد تھا، ان کو حضرتؒ سے ایسا قلبی تعلق پیدا ہوگیا کہ حضرتؒ کے رسائل خود پڑھتے اور دوسروں سے پڑھواتے اور اس کی ترویج کرتے، ان کے اس تعلق سے کام میں سہولت ہوئی اور خاص طور سے تبلیغ کے کام کی انھوں نے سرپرستی فرمائی، اور ان کی زندگی میں آزادانہ طور پر یہ کام وہاں ہوتا رہا۔

حضرتؒ سے ان کا یہ تعلق اخیر دم تک قائم رہا۔ اس سفر سے واپسی کے بعد ہی انھوں نے حضرت کو بڑی عقیدت و محبت کا خط لکھا جو آج بھی محفوظ ہے، اور ''رسائل الاعلام'' کی زینت ہے۔ حضرتؒ کے رسائل و محاضرات پر اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آپ کی تصنیفات و محاضرات دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں اور دل و دماغ کو فرحت ملی، عبارت کی روانی پھر اس میں لطیف اشارات، الفاظ کا حسن انتخاب پھر اس کی خوبصورت بندش، یہ وہ خوبیاں ہیں جو اور کہیں نہ سننے میں آتی ہیں نہ دیکھنے میں۔ اللہ تعالیٰ ہی آپ کو دنیا و آخرت میں اسکی جزاء عطا فرمائے

www.abulhasanalinadwi.org

اوراپنی نعمتوں سے مالا مال کرے۔"(۱)

اس سفر میں حضرتؒ اپنے ساتھ "**ماذا خسر العالم**"کا مسودہ بھی لے گئے تھے، سب سے پہلے شیخ عبدالرزاق حمزہ نے اس کو دیکھ کر اس کی طباعت واشاعت کی تاکید کی، اس سفر میں اس سلسلہ کی مزید تفصیلات "**ماذا خسر العالم**" سے متعلق مضمون میں گذر چکی ہیں۔

امیر سعود کے نام ایک تاریخی مکتوب

حجاز مقدس میں حضرتؒ کا قیام کئی ماہ رہا، یہ وہ زمانہ تھا کہ سعودی حکومت مستحکم ہو چکی تھی، دولت کی ریل پیل وہ تو نہیں تھی جو آج ہے لیکن اس کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، مغربی تہذیب وتمدن نے بھی بال و پر نکالنے شروع کر دئے تھے، حضرتؒ نے اپنی ایمانی بصیرت سے اس خطرہ کو محسوس کیا کہ اگر آج اس پر قابو نہ پایا گیا اور حکومت جن بنیادوں پر قائم کی گئی تھی ان کو مستحکم نہ کیا گیا تو اسکا پورا خطرہ ہے کہ یہ حکومت یورپ کی دلدادہ اور فریب خوردہ ہو جائے گی، اس خطرہ کو محسوس کر کے حضرتؒ نے اس وقت کے ولی عہد امیر سعود کو ایک ایسا تاریخی مکتوب تحریر فرمایا جس میں ان حقائق کو کھل کر پیش کیا اور حکومت کے انتظامات کی ستائش کرتے ہوئے ان خطرات کی نشاندہی بھی کی جو اس وقت درپیش تھے۔ حضرتؒ نے یہ خط اپنے قیام کے آخری دن کچھ قیام گاہ پر، کچھ مکہ معظّمہ اور جدہ کے راستہ میں اور کچھ بندرگاہ پر جہاز کے انتظار کے دوران تیار فرمایا، اور مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی کے سپرد کیا تاکہ وہ شیخ عمر بن حسن کو دے دیں، اور وہ خود اس کو امیر سعود تک پہونچا دیں یا سنا دیں۔ بعد میں شیخ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اسکی تعمیل کر دی تھی۔

حضرتؒ نے اس زمانہ میں اپنی ایمانی بصیرت سے جن خطرات کا ادراک فرمالیا تھا اور اس کو صاف صاف اس طبقہ کے سامنے پیش کر دیا تھا، جس کو آگے چل کر زمام

(۱) رسائل الاعلام ص ۴۵

www.abulhasanalinadwi.org

قیادت سنبھالنی تھی، اگر اس کو بھی ان خطرات کا جو حقائق کی شکل میں پیش آنے والے تھے شعور پیدا ہو جاتا اور اسی وقت سے راستہ کی تبدیلی کی کوشش کیجاتی تو شاید آج صورتحال کچھ اور ہوتی، **ولکن الله یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید.**

یہ خط معمولی ترمیم کے بعد "**بین الجبایة و الهدایة**" کے عنوان سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، اور بعد میں "**إلى الاسلام من جدید**" کے مجموعۂ مضامین میں شامل کر دیا گیا۔

عربوں میں دعوت کا جذبہ وفکر اور اس کی کوششیں

قیام حجاز کے دوران وہاں کے حالات دیکھ کر اور ان خطرات کو محسوس کر کے جو سروں پر منڈلا رہے تھے جسکو محسوس کرنے والے بہت محدود تعداد میں تھے، حضرتؒ کے حساس دل اور خودداری پر ایک چوٹ لگی، کہ وہ حجاز مقدس جسکا پیغام سارے عالم کے لئے ہے اور جو تمام مسلمانوں کا قبلہ اور مرکز اسلام ہے، وہ دوسروں کا دست نگر بنتا جارہا ہے، مغربی تہذیب و تمدن نے اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیے ہیں اور جو قوم دنیا کی امامت کے لئے پیدا کی گئی تھی وہ دوسری قوموں کے سامنے کاسۂ گدائی لئے کھڑی ہے۔

جنوری ۱۹۴۸ء کو حضرتؒ کی واپسی ہوگئی، لیکن یہ خیال وفکر دل و دماغ پر طاری تھا کہ کس طرح عربوں کو ان کی بھولی ہوئی منزل پر لایا جائے، اور ان کا مقام و پیغام ان کو یاد دلایا جائے کہ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت اور اس وقت تجدید دین اور اصلاحِ امت کا اہم ترین کام تھا۔ اس وقت حضرتؒ کے اضطراب و کرب کا کچھ اندازہ اس مکتوب سے کیا جاسکتا ہے جو حضرتؒ نے اپنے دوست مولانا مسعود عالم ندویؒ کو اس وقت بھیجا تھا جب وہ عراق میں تھے، اس میں فرماتے ہیں :

"دین کی تخم ریزی کے لئے اس کشت ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھئے، حجت تمام کر دیجئے، دن رات ایک کر دیجئے، دل کو جلایئے اور بدن کو گھلایئے،

www.abulhasanalinadwi.org

خون دیدہ وخون جگر بہایئے اوراس طرح بہایئے کہ دجلہ وفرات اپنی تنگ ظرفی اورکم مائیگی پر ماتم کریں!۔ایک ایک کا گریبان تھام کر کہئے کہ اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو!اے عالم کی آبرو!اے ابراہیم ومحمد ﷺ کی آرزو!تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اورآہ سحر گاہی، مثنیٰ بن حارثہؓ کے خون شہادت،ابوعبید الثقفیؓ کی پامالی اوراستخواں شکنی،سعد بن وقاصؓ کی علم برداری، علی بن ابی طالب کی جگرسوزی، اشک ریزی اور خطابت وتاثیر کی طوفان خیزی، آبروئے شہیداں جگر گوشہ رسول کی تشنگی، اور خاندان رسالت کےخون کی ارزانی، ابوحنیفہؒ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبلؒ کی تعزیر جرم عشق، ابن جوزیؒ کی حمایت سنت، عبدالقادر جیلانیؒ کی دردمندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ تو ائمہ ضلالت کا ادنیٰ غاشیہ بردار اوراس کی راہ کا غبار ہے؟؟ عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجئے اور شور قیامت برپا کیجئے۔

گرفتہ چینیاں احرام ومکی خفتہ در بطحا''(۱)

حضرتؒ نے ہندوستان میں ہوتے ہوئے بھی یہ کوشش شروع فرمادی اور یہی حضرتؒ کی تحریک اصلاح وتجدید کا وہ نقطہ آغاز ہے جسکے نتیجہ میں عالمی سطح پر اسلامی بیداری پیدا ہوئی اور دنیائے اسلام میں اب تک جو جمود وتعطل طاری تھا اس میں ایک طرح کا تموج پیدا ہوا۔

حجاز میں جن علماء ومشائخ سے ربط وتعلق قائم ہوا تھا ان سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا،ان حضرات نے حضرتؒ کی دعوت وفکر کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے بڑی عظمت ووقعت کے ساتھ دل میں جگہ دی،مگراس کی ضرورت شدت سے محسوس ہورہی تھی کہ تنہا مراسلت اس کام کوآگے بڑھانے کے لئے کافی نہیں ہے حجاز مقدس کی سرزمین پر دعوت وفکر کے جو نئے بیج ڈالے گئے تھے،ان کی آبیاری کے لئے مزید اقدامات کی ضرورت ہے۔اس کے لئے مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے مشورہ اور تجویز

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۱-۳۵۲

www.abulhasanalinadwi.org

سے یہ طے کیا گیا کہ دونو جوان ندوی فضلاء کو طویل قیام حجاز کے لئے منتخب کیا جائے تا کہ وہ وہاں جا کر اس مشن کو آگے بڑھا سکیں اور مزید اُن دعوتی رسائل کو اہل علم و اہل فکر تک پہونچاتے رہیں جو سفر حجاز کے بعد تیار کئے گئے تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ (سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء) اور مولوی عبد الرشید صاحب ندوی کو جو حضرت کے ابتدائی دور کے شاگرد اور اسی فکر کے حامل تھے، اس کے لئے منتخب کیا گیا اور ان دونوں حضرات نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ یہ کام انجام دیا، اور اس طرح سے حضرتؒ اور وہاں کے علماء اور باوقار و بااثر شخصیتوں کے درمیان جو فکری و دعوتی ہم آہنگی اور اتحاد قائم ہوا تھا وہ نہ صرف یہ کہ باقی رہا بلکہ اس میں مزید استحکام پیدا ہوا۔

دوسرا سفر حج

پہلے اور دوسرے سفر حج میں تین سال کا وقفہ ہے، اور اس دوران بعض اہم واقعات پیش آئے لیکن ان کو ایک مستقل باب میں ذکر کیا جائے گا، مضمون کی مناسبت سے پہلے سفر حج اور اس وقت کی دعوتی سرگرمیوں کے بعد دوسرے سفر حج اور اس وقت کی ان دعوتی و فکری اور اصلاحی کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے کہ زمانی اعتبار سے دونوں میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے اور موضوع کے اعتبار سے حقیقت میں یہ اسی کا امتداد اور اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

اس سفر کی تحریک اس طور پر ہوئی کہ ۱۹۴۹ء کو ایک قابل احترام شخصیت کی طرف سے حضرتؒ کو حج کی پیش کش ہوئی تھی، حضرتؒ نے اپنے شیخ حضرت رائپوریؒ سے اس کا تذکرہ فرمایا اور رائے لینی چاہی، تو حضرت رائپوریؒ نے اس وقت مصلحتاً منع فرما دیا لیکن اس کے دوسرے ہی سال ۱۹۵۰ء کو خود اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ وہ حضرتؒ کی تنگدستی کا زمانہ تھا، حج کے لئے رقم کا انتظام آسان نہ تھا، مگر حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کاندھلوی نے اسکا انتظام فرما دیا۔ حضرتؒ کے چار عزیز شاگردوں جن میں دو قریبی عزیز بھی تھے اپنے اپنے مصارف پر اس سفر میں ساتھ ہو گئے تا کہ وہ

www.abulhasanalinadwi.org

حج کے بعد حجاز میں عربوں میں دعوتی کام کے لئے ٹھہر جائیں اور پہلے سے مقیم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر وہاں کے خواص میں تبلیغی کام کا تعارف بھی کرائیں اور حضرتؒ کے دعوتی رسائل کو بھی پہونچانے کا کام کریں، یہ حضرت کے خواہرزادہ عزیز مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی (حال ناظم ندوۃ العلماء) مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی (سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) مولانا سید محمد طاہر صاحب منصور پوری (سابق مددگار ناظم ندوۃ العلماء) اور ڈاکٹر سید رضوان علی صاحب (مقیم حال پاکستان) تھے۔

۲۰/ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ ۴/ستمبر ۱۹۵۰ء کو براہ بمبئی اسلامی جہاز سے روانگی ہوئی۔ حضرتؒ نے اپنے دعوتی وفکری رسائل جو پہلے سفر حج کے بعد شائع ہوئے تھے، ساتھ لے لئے تھے۔ جہاز خلاف معمول ''مکلا'' میں ٹھہرا تو حضرتؒ نے وہاں کے قاضی اور ممتاز علماء کو یہ رسائل بھجوائے جس کے جواب میں جہاز روانہ ہونے سے پہلے ہی تأثر و تشکر کا ایک خط بھی آیا، جس پر ان حضرات کی مہریں ثبت تھیں۔

۳/ذی الحجہ کو جہاز جدہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا، حاجی عبد القادر نور ولی صاحب کو پہلے سے اطلاع تھی، وہ موٹر لانچ لیکر آئے اور بندرگاہ سے اتار کر سیدھے اپنے گھر لے گئے۔ کچھ وقت ان کے یہاں قیام رہا، لیکن حضرت رائپوریؒ نے ''حجاج منزل'' جانے پر اصرار فرمایا، جہاں بقیہ رفقاء مقیم تھے، اگلے ہی روز مکہ مکرمہ روانگی ہوگئی۔ ''مدرسہ صولتیہ'' میں سامان رکھ کر طواف وسعی سے فراغت ہوئی، پھر ایک شب ''مدرسہ فخریہ'' میں قیام ہوا، اگلے روز مولانا محمد سلیم صاحب کی تجویز کے مطابق ''باب باسطیہ'' پر شیخ حمزہ کتبی کے اس مکان میں منتقل ہوگئے جو مولانا نے اسی لئے کرایہ پر لیا تھا۔

''دورانِ حج، وقوف عرفہ کے دن ایک عجیب قصہ یہ پیش آیا کہ عین اس وقت کہ جب توبہ وانابت ورجوع الی اللہ کی کیفیت میں کچھ محسوس کمی اور غفلت معلوم ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کے ازالہ اور اس کوتاہی کی تلافی کا عجب سامان کیا، اچانک آندھی

آئی، افق سے ابر اٹھا اور اس زور کی ژالہ باری ہوئی کہ خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں، رونے والوں کی چیخیں نکل گئیں اور انابت کی عام فضا پیدا ہوگئی اور آنکھوں نے اشک باری اور دلوں نے اضطراب واضطرار کی وہ مقدار چند لمحوں میں پوری کر دی جو پورے دن کے وقوف وقیام میں نہیں ہوئی تھی، تھوڑی ہی دیر میں مطلع صاف ہوگیا اور تھوڑی دیر کے اولے اور پانی کا چھینٹا وہ کام کر گیا جو بیسوں دینی ادارے اور واعظین اور سحر انگیز مقررین کی منظّم جماعتیں نہیں کر سکتی تھیں۔ **و ما یعلم جنود ربک إلا ھو**"(۱)

یکم محرم الحرام ۱۳۷۰ھ کو مدینہ منورہ روانگی ہوئی، بیس روز "مدرسہ شرعیہ" ہی میں قیام رہا۔ ۲۰ محرم الحرام کو حضرت رائپوریؒ مع اپنے رفقاء وخدام کے واپس تشریف لے گئے۔ حضرتؒ نے عربوں میں کام کرنے کی نیت سے مزید قیام اختیار فرمایا، حضرتؒ حضرت رائپوری کو رخصت کرنے کے لئے بندرگاہ تک تشریف لائے، اس وقت کے دستور کے مطابق حضرت رائپوریؒ موٹر لانچ پر بیٹھ کر روانہ ہوئے، خادم خاص راؤ فضل الرحمان خان صاحب بیان کرتے ہیں کہ جب تک حضرتؒ کی صورت اوجھل نہیں ہوئی حضرت رائپوریؒ برابر موٹر لانچ سے حضرتؒ کو دیکھتے رہے، اس سفر میں حضرت رائپوریؒ نے اپنے محبوب مسترشد کے ساتھ جس محبت کا معاملہ فرمایا اسکی تفصیلات انشاءاللہ آئندہ باب کا موضوع ہونگی۔

عز وشرف کا مبارک دن

اسی سفر حج میں مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا جو حضرتؒ کے الفاظ میں "عز وشرف کا سب سے مبارک دن تھا جو نہ اس سے پہلے پیش آیا تھا نہ اس کے بعد"(۲) حضرتؒ کی دعوتی وتبلیغی خدمات اور تجدید واصلاح کی کوششوں کے

(۱) تلخیص از سوانح حضرت رائپوریؒ ص ۱۷۸-۱۷۹

(۲) یہ بات حضرت نے کاروان زندگی جلد اول میں تحریر فرمائی ہے۔ واضح رہے کہ کلید کعبہ پیش کئے جانے کا واقعہ تحریر کے بہت بعد کا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اثرات ظاہر ہونے لگے تھے، تعلیم یافتہ اور ترقی پسند طبقہ بھی کسی حد تک ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ پر جو انعامات کی بارشیں فرمائیں، اس کا سلسلہ بھی شروع ہو چلا تھا، اور حقیقت میں یہ واقعہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے، ہوا یہ کہ ایک روز کلید بردار کعبہ جناب شیبی صاحب نے خود ہی حضرتؒ کو بیت اللہ میں داخلہ کی دعوت دی، اور یہ بھی فرمایا کہ حضرتؒ جس کو چاہیں اپنے ساتھ لے آئیں، اس موقعہ پر حضرت رائپوریؒ اور ان کے قافلہ کے ہمراہیوں نے بھی یہ سعادت حاصل کی، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ''میں بیت اللہ کے دروازہ پر کھڑا تھا اور جسکو اشارہ کرتا اس کو داخلہ کی اجازت ملتی۔'' پھر بھی بہت سے اہل تعلق رہ گئے اور انھوں نے شکوہ کیا، دوسرے دن حضرتؒ نے شیبی صاحب سے کہا کہ اگر دوبارہ ممکن ہو تو اور لوگ بھی سعادت حاصل کرلیں، شیبی صاحب نے دوبارہ حرم کی پولیس کے ذریعہ یہ انتظام کیا، اور خود بھی تشریف لائے، حضرت رائپوریؒ نے بھی دوبارہ یہ سعادت حاصل فرمائی، اور اس دن بھی حضرتؒ کو وہ سعادت حاصل ہوئی کہ دروازے پر کھڑے ہو کر جسکو اشارہ فرماتے اس کو اجازت ملتی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس اعزاز سے بڑھ کر دنیا کا کوئی اعزاز نہیں ہوسکتا لیکن حضرتؒ کی فطری شرافت نفس، تواضع وانکسار اور انکارِ ذات کا نتیجہ تھا کہ حضرتؒ نے اس واقعہ کو تحریر کرنے کے بعد اس کی نسبت حضرت رائپوریؒ کی طرف فرمائی، تحریر فرماتے ہیں :

> ''میں اس کو حضرتؒ ہی کی ایک کرامت سمجھتا ہوں کہ نہ اس سے پہلے اسکا موقع آیا تھا اور نہ اسکے بعد بار بار حاضری کے باوجود یہ شرف حاصل ہوا۔
>
> مور مسکیں ہوس داشت کہ در کعبہ رسد
>
> دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید(۱)

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۶

www.abulhasanalinadwi.org

تعلیم یافتہ طبقہ پر خصوصی توجہ اور ان کا تأثر

حجاز کے پہلے قیام میں حضرتؒ نے جو خطرات محسوس کئے تھے اب وہ واقعات و حقائق کی شکل میں ظاہر ہونے لگے تھے اور صاف نظر آرہا تھا کہ مغربی تہذیب نے عرب ممالک کو پورے طور پر متاثر بلکہ مفلوج کردیا ہے۔ اس دوسرے قیام میں حضرتؒ نے اس کا صاف صاف مشاہدہ کیا۔ ان تین سالوں میں جو نمایاں فرق نظر آیا حضرتؒ نے برادر اکبر ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے نام ایک مکتوب میں اس کی منظر کشی کی ہے، اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے :

"۴۷ء میں ہم پہلی بار یہاں آئے تھے، اب ۵۰ء میں آئے ہیں، تین برسوں میں کھلا ہوا فرق محسوس ہوتا ہے، بازار سے لیکر لوگوں کے دماغوں تک مغربی تمدن، تجارت، معاشیات اور افکار و خیالات کے پنجے اور زیادہ گڑ چکے ہیں، جدہ اترتے ہی اس کا احساس ہوتا ہے اور جس قدر حالات سے واقفیت ہوتی ہے اتنا ہی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، کوئی نہیں جانتا، خوبصورت عربی لباس میں کتنے دل و دماغ خالص مغربی بن چکے ہیں، اور قرآنی زبان کتنے مغربی خیالات اور خالص مادی تخیلات کا ذریعہ اظہار بنتی جارہی ہے، معاش کا انہماک، دولت آفرینی کی عادت بحرانی حد تک پہونچ چکی ہے، زندگی کا تصور اس کے بغیر ان کے نزدیک ممکن نہیں کہ اس کے سایہ میں پناہ لی جائے اور ترقی کی جائے، عالم اسلام کا قبلہ مکہ معظّمہ اور بیت اللہ ہے اور مرکز اسلام کا قبلہ سرِ دست امریکہ ہے۔" (۱)

یہ صورتِ حال ہر صاحب درد وفکر کے لئے باعث تشویش تھی، اس کو دیکھ کر حضرتؒ کے اندر ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی اور شدت کے ساتھ ضرورت محسوس ہوئی کہ طبقہ خواص، ادباء، اہل قلم، اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو اس کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ابھی تک باقاعدہ اس طبقہ سے رابطہ کی کوئی شکل پیدا نہیں ہوئی تھی اور

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۹

www.abulhasanalinadwi.org

کسی ایسے فرد کی تلاش تھی جو اس حلقہ سے تعارف کا ذریعہ بن سکے، اسی غرض سے ایک دن تبلیغ کے ایک اہم کارکن مفتی زین العابدین صاحب کو لیکر حضرتؒ، حافظ سید محمود صاحب کے پاس گئے جو ''مطبعۃ الحکومۃ'' کے نائب مدیر تھے اور حضرتؒ سے تعلق و محبت رکھتے تھے، ان کے سامنے جب یہ بات آئی تو انھوں نے کہا کہ میں ایک ایسے شخص سے ملوا دیتا ہوں جو اس حلقہ کی کنجی ہے، انھوں نے شیخ احمد عبدالغفور عطار سے تعارف کرا دیا جو حجاز کے ایک معروف اہل قلم اور علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والے فاضل تھے، انھوں نے اس کا انتظام یہ کیا کہ ''بستان بخاری'' میں جو بڑی تقریبات اور اجتماعات کی جگہ تھی دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا اور اس میں اپنے ادیب اور اہل قلم دوستوں اور ریڈیو اور صحافت سے تعلق رکھنے والوں کو مدعو کیا، ان میں شیخ سعید العامودی، شیخ عبدالقدوس انصاری، سید علی حسن فدعق، سید محسن باروم اور شیخ حسین عرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس نشست میں ان ادباء نے حضرتؒ کی ادبی و ثقافتی سطح کا امتحان لینے کے لئے مختلف قسم کے سوالات کئے، حضرتؒ نے جس بلند سطح سے تعلیم حاصل کی تھی اور پھر اپنی محنت سے جس طرح اس میں کمال پیدا کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ نہ صرف یہ کہ مطمئن ہوئے بلکہ بڑے تاثر و تشکر کے ساتھ یہ نشست اختتام کو پہونچی اور ان کے تاثر کا اظہار اس طور پر ہوا کہ وہ حضرت کو اسی وقت شیخ محمد سرور الصبّان کے پاس لے گئے اور ان سے یہ مطالبہ کیا کہ شیخ کی ریڈیو پر تقاریر کا انتظام ہونا چاہئے، انھوں نے اس کو بخوشی منظور کیا۔ حضرتؒ نے اس کے لئے ''بین العالم و جزیرۃ العرب'' کا عنوان تجویز کیا، پہلی تقریر ''من العالم إلی جزیرۃ العرب'' (جزیرۃ العرب سے دنیا کی شکایت) کے عنوان سے اور دوسری تقریر ''من جزیرۃ العرب إلیٰ العالم'' (جزیرۃ العرب کا دنیا کو پیغام) کے عنوان سے کی گئی، ان تقریروں کا وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ پر گہرا اثر پڑا اور ان کو حضرتؒ کی ذات اور دعوت و فکر سے دلچسپی بلکہ گرویدگی پیدا ہوگئی، فکر و نظر کی پختگی اور اس میں توازن، جدید ادبی اسلوب میں خطاب، زبان و بیان کا زور اور اقدامی قوت کے علاوہ جو چیز ان کے لئے

www.abulhasanalinadwi.org

جاذب نظر اور باعث کشش تھی وہ حضرتؒ کا زہد و استغناء اور خودداری و بے نیازی، اخلاص وللّٰہیت، پھر انکسار و تواضع جیسی وہ صفات تھیں جن کا ایک فرد میں جمع ہونا ایک نادر بات تھی۔

ان تقریروں کا شیخ محمد سرور الصبّان کی طرف سے خصوصی معاوضہ بھی پیش کیا گیا تھا مگر حضرتؒ نے اس کو قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔

ان تقریروں سے پہلے حضرتؒ کے تعارف و اعتراف میں شیخ احمد عبد الغفور عطار کی ایک تقریر سعودی ریڈیو سے نشر ہوئی، جس سے ان کے گہرے تاثر و عقیدت کا صاف اظہار ہوتا ہے، یہ ملحوظ رہے کہ اس وقت حضرتؒ کی عمر صرف اڑتیس سال تھی، اور "**ماذا خسر العالم**" بھی اس وقت تک شائع نہیں ہو سکی تھی، اس تقریر کے چند اقتباسات یہاں پر پیش کیے جاتے ہیں:

> "ہم قارئین اور ناظرین کے سامنے عصر حاضر کی ایک ایسی جامع صفات اور مذکورہ خصوصیات کی حامل منفرد شخصیت کو پیش کرنے جا رہے ہیں جو اسلامی دنیا کے لئے ایک بہترین نمونہ اور آئیڈیل ہے اور یہ شخصیت گذشتہ زمانوں کے لحاظ سے بھی قابل تقلید اور ہر زمانہ اور جگہ کے لئے موزوں اور مثالی شخصیت ہے، اس لئے کہ یہ ایک ایسے انسان عالم ہیں جو کسی زمانہ عصر یا قوم کے لئے مخصوص نہیں، اگرچہ وہ اس زمانہ کے عالم ہیں اور اسی زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں۔"

> "یہ وہ عظیم ہستی اور جوہر نایاب ہے اور یہ وہ عبقری انسان ہیں جن کے دل میں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، ایسے پارسا اور دیندار ہیں جنہیں دیکھ کر سلف صالح کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جنھوں نے راہ خدا میں جان و مال کی قربانی دی اور انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا اور ان سب کے ساتھ وہ اپنے کو حقیر و ناکارہ اور اپنی مساعی کو کم گردانتے ہیں، مولانا اپنے سلف ہی کے راستہ پر ہیں۔"

www.abulhasanalinadwi.org

''علم کا حق جانتے ہیں، سیاسی نقطۂ نظر اور اختلافی چیزوں سے اچھی طرح واقف ہیں، اس کے ذرائع و وسائل، اہداف و مقاصد، اور پھر اس کے عواقب ونتائج کو سمجھتے ہیں، قوموں کے عروج و زوال پر گہری نگاہ رکھتے ہیں، ان کی خامیوں اور خوبیوں پر پختہ نظر ہے، اور کبھی سیاسی جماعتوں کی اوپری زیب وآرائش سے دھوکہ نہیں کھاتے، آپ کا ایک اہم وصف اور خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت کے وہ بڑے مسائل جو اصلاً پوری دنیا میں اضطرابی و ہیجانی کیفیت کا سبب بنے ہوئے ہیں سامنے لاکر اس کا حل بھی اپنی طاقتور اور سحر انگیز اسلوب میں کرتے ہیں، براہین قاطعہ اور ٹھوس دلائل کے ساتھ تاریخ وتجربات کی روشنی میں یہ بات ثابت اور واضح کرتے ہیں کہ دنیا کی تمام مشکلات و مسائل کا حل صرف اسلام ہے، وہ یہ کسی تعصب وتقلید یا کسی جماعت کے فرد و نمائندہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مقارنہ وموازنہ کرکے اور تقابلی مطالعہ کی روشنی میں کہتے ہیں، وہ موضوع پر پوری طرح حاوی ہوکر بولتے ہیں، اور جوش بھرے انداز میں طاقت وقوت کے ساتھ اپنی بات کہتے ہیں، علماء مذاہب کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کی زبان وفلسفہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھتے ہوئے ایسے روشن حقائق پیش کرتے ہیں جس سے تاریکی چھٹ جاتی ہے، صحیح معنی میں دیندار کہلائے جانے کے مستحق آپ ہی ہیں، جن کی زندگی بدعات وخرافات اور لغویات سے پاک ہے۔''(۱)

اسی سفر میں شیخ عبداللہ المزروع نے اپنے اس تاریخی رجسٹر پر حضرتؒ سے بھی تحریر لی جس پر وہ مشاہیر عالم اسلام سے نوجوانان مکہ کے نام پیغام لکھایا کرتے تھے، یہ پیغامات باقاعدہ کتابی شکل میں شائع کردئے گئے ہیں۔ حضرتؒ کی یہ ایک یادگار تحریر ہے اس لئے اس کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے جو مولانا عبداللہ عباس صاحب

(۱) ماخوذ از کتاب ''حضرت مولاناؒ مشاہیر امت کی نظر میں'' (ترجمہ عزیز القدر مولوی محمود حسن حسنی سلمہٗ اللہ کا کیا ہوا ہے۔)

www.abulhasanalinadwi.org

ندوی کے قلم سے ہے :

''عرب جہاں بھی ہیں اور جتنے بھی ہیں اگر سب ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھے ان سے خطاب کا موقع ملے، میری بات وہ سن سکیں اور ان کے دل میں اتر سکے تو عرض کرونگا :

بزرگو! اسلام جس کو سیدنا محمد ﷺ لائے ہیں یہی آپ کی زندگی کا سر چشمہ ہے، یہی آپ کی قوت ہے اور اسی سے آپ کی رگوں میں خون کی گردش ہے، اسی اسلام سے آپ کے وجود کی صبح صادق نمودار ہوئی، آپ دنیا میں روشناس ہوئے، نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی سے آپ کی سرفرازی ہے اسی نام نامی کے صدقے میں آپ کی نبض حیات میں گرمی اور قلب میں حرارت قائم ہے اور صرف آپ ہی نہیں بلکہ سارے عالم میں اگر خیر کا کوئی ذرہ ہے تو وہ اس ذات گرامی کا عطیہ ہے، اور آپ سن لیجئے! کہ اسی نسبت سے آپ کی آج بھی عزت ہے، اس رسول عربی کے دامن سے وابستگی آپ کا سب سے بڑا ہنر ہے، اگر خدانخواستہ اس ذات اقدس سے عرب کا رشتہ ٹوٹا یا کمزور ہوا تو اس کی حیثیت ایک ایسے دریا کی ہوگی جس میں پانی نہ ہو، عربوں کا سب سے بڑا عروج اس میں ہے کہ وہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنا امام وقائد رہبر و رہنما مان کر اسلام کو لیکر اٹھیں جیسا کہ عہد اول میں ان کے اسلاف اٹھے تھے (آج بھی ضرورت ہے کہ) اسلام کی دعوت کو اپنی سب سے بڑی دولت سمجھیں اور مظلوم انسانیت کو یورپ کے چنگل سے آزاد کرائیں جو اپنے جہل سے انانیت میں آ کر ساری دنیا کو انارکی، ویرانی اور تباہ کاری کی طرف لے جارہا ہے۔ عرب اٹھیں اور تہذیب و اخلاق کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالیں، دنیا کو بے چینی، اضطراب، خود رائی اور خود پسندی کے حصار سے نکال کر امن و سلامتی، بھائی چارگی اور محبت کے راستہ پر گامزن کریں۔

عالم عرب کا یہ فرض ہے جس میں اگر انھوں نے کوتاہی کی تو ان سے یہ

www.abulhasanalinadwi.org

پرسش ہوگی، وہ سوچ لیں کہ وہ کل اللہ کو کیا منھ دکھائیں گے اور کیا جواب دیں گے؟؟؟"(۱)

سفر مصر

حضرتؒ نے وہاں کے قیام کے دوران یہ محسوس فرمالیا کہ یہاں کی تہذیب و تمدن، خیالات ورجحانات، ادب وفکر پر مصر کی چھاپ ہے، اور یہ سب چیزیں مصر کے راستہ سے یہاں آتی ہیں، اس سے عالم عربی میں مصر کی مرکزیت وقیادت کا اندازہ ہوا اور یہ محسوس ہوا کہ اگر عالم عربی میں کسی فکر ودعوت کو پھیلانا، وقیع بنانا اور اس میں کوئی تغیر وانقلاب لانا ہوتو وہ مصر ہی کے راستہ سے ممکن ہے، اس صورتِ حال کے پیش نظر حضرتؒ نے مصر جانے کا ارادہ فرمالیا، مگر حضرتؒ کی زاہدانہ زندگی میں اس کی گنجائش نہ تھی کہ اس کے لئے ضروری اسباب اور سفر کا کرایہ فراہم ہو سکے، برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ اور حضرت شیخؒ اور بعض اہل تعلق نے اس کا بندوبست کیا کہ حضرتؒ اپنے دو رفیقوں کے ساتھ بحری جہاز سے مصر جاسکیں۔

۱۲ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۰رجنوری ۱۹۵۱ء کو مولانا معین اللہ صاحبؒ اور مولوی عبد الرشید صاحب کی رفاقت میں جدہ سے روانگی ہوئی، اس وقت مصر اپنے شباب پر تھا، علم وادب کا بازار گرم تھا، پچھلی نسل کے بہترین دماغ اور قدیم وجدید تعلیم کے بہترین ساختہ پرداختہ موجود تھے، ان میں بڑی تعداد ان ادباء علماء اور زعماء کی تھی جن کا آوازہ عالم عربی میں بلند تھا اور جن کی تقلید کو اس وقت کے نوجوان ادباء قابل فخر ومباہات سمجھتے تھے، مشہور علماء میں شیخ الازہر شیخ عبد المجید سلیم، شیخ محمود شلتوت، محدث ومحقق شیخ احمد محمد شاکر، ادباء میں ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود العقاد، احمد حسن زیات، اور زعماء وقائدین میں مفتی سید امین الحسینی، مشہور مجاہد امیر عبد الکریم ریفی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو پورے پورے مدرسۂ ادبی اور مکتب فکر کے بانی اور رہنما تھے، الاخوان المسلمون کی تحریک سرگرم عمل تھی، اور حضرتؒ کے الفاظ میں:

(۱) میر کارواں ص۲۰۲-۲۰۳

''اس وقت تک دور ناصری کی وہ بادِ خزاں نہیں چلی تھی جس سے علم وادب، فکر اسلامی، آزاد سیاست اور اخلاقی جرأت وتنقید کے سرسبز و شاداب درخت برگ و بار سے محروم ہو گئے، اور پورے ملک پر انقلاب کی ایسی جھاڑو پھری کہ گرد وغبار کے سوا کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔''(۱)

قاہرہ پہونچ کر مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی بھی قافلہ میں شامل ہو گئے، چند دن تو ''فندق البرلمان'' میں قیام رہا، پھر ایک انجمن کے دفتر میں جو ''السكة الجديدة'' کی ایک بالائی منزل پر واقع تھا قیام فرمایا۔

حجاز مقدس میں جس طرح مختلف حلقوں میں اور خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ میں تعارف کی شکل پیدا ہو گئی تھی، قاہرہ کے اس ہنگامہ خیز اور پر شور شہر میں اس کی زیادہ ضرورت تھی تا کہ لوگوں کو توجہ ہو، اللہ تعالیٰ نے غیب سے اس کا سامان یہ فرمایا کہ حضرتؒ کے پہونچنے سے پہلے ''ماذا خسر العالم'' شائع ہو گئی اور وہاں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اس طرح سے یہ کتاب تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔ دوسری طرف بعض مؤقر مجالس اور جمعیات میں تقریروں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اس سے لوگوں کے دل کھنچنے لگے اور وہاں کے اہم ترین ادباء وعلماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ بھی منعطف ہوئی۔ اسی کے نتیجہ میں جمعیات الشبان المسلمین کے رئیس اللواء صالح حرب باشا نے حضرتؒ کے اعزاز میں جلسہ منعقد کیا اور اس میں اس وقت کے اہم لوگوں کو مدعو کیا جن میں امیر عبد الکریم ریفی، شیخ حسنین محمد مخلوف، اور شیخ محمد الشربینی (صدر جمعیۃ علماء ازہر) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پانچ ماہ کے اس قیام میں ہر اہم ادارے، تنظیم اور دعوتی مرکز میں حضرتؒ کی تقاریر ہوئیں، ان میں وہاں کے مؤقر اور تاریخی ادارہ دار العلوم اور قاہرہ یونیورسٹی اور جامع ازہر سے لے کر چھوٹی چھوٹی تنظیموں اور اداروں تک کوئی مرکزی مقام ایسا باقی نہیں رہا جہاں حضرتؒ نے اپنی اس فکر ودعوت کو اپنے مخصوص انداز میں پیش نہ کیا ہو، مصر کے قصبات و دیہات بھی اس

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۶۷

www.abulhasanalinadwi.org

سے محروم نہیں رہے، اخوان کے داعی و ترجمان شیخ محمد الغزالی کے ہمراہ مختلف علاقوں کے دورے بھی ہوتے رہے جہاں حضرتؒ کے خطابات ہوئے۔

ان محاضرات و خطابات کے علاوہ اس وقت موجود تقریباً تمام اہم لوگوں سے تفصیلی ملاقاتیں بھی ہوئیں، ان کے سامنے بھی حضرت نے اپنی فکر و دعوت پیش کی، ڈاکٹر احمد امین سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں، اور حضرتؒ نے ان کی تصنیفات سے اپنے تاثر و استفادہ کا بھی تذکرہ کیا، اور ان کو ان کی فکری فروگذاشتوں سے بھی آگاہ فرمایا۔ اسی طرح شیخ الازہر شیخ عبدالمجید سلیم کو بھی ازہر سے متعلق اہم اور مفید مشورے دیئے، جو انھوں نے بڑی توجہ سے سنے اور یہ خواہش بھی کی کہ ان کو تحریری شکل میں شیخ احمد شلتوت کے حوالہ کر دیا جائے، حضرتؒ نے اس کو مرتب کر کے حوالہ کیا، جامعہ ازہر کے طلبہ سے بھی ربط و تعلق قائم ہوا، خاص طور پر ''کلیة الشريعة'' کے طلبہ نے بڑی عقیدت و محبت کا ثبوت دیا، متعدد مرتبہ ان کے سامنے تقریر کرنے کی نوبت آئی، ان میں سے بعض ذہین اور دینی فکر رکھنے والے طلبہ حضرتؒ کی قیام گاہ پر ملنے آتے رہے۔ ان میں خاص طور پر شیخ یوسف القرضاوی قابل ذکر ہیں، جو اس وقت ازہر میں ''کلیة الشريعة'' کے طالب علم تھے۔

تحریکات میں سب سے زیادہ ''اخوان'' سے ربط رہا، اس کے ذمہ داروں نے بڑی قدر و محبت کا معاملہ کیا اور اپنے بڑے اہم اور مخصوص جلسوں میں حضرتؒ کو خطاب کے لئے دعوت دی، حضرتؒ نے اپنے خطاب میں ان کی خوبیوں کا کھل کر اعتراف کیا اور ان خامیوں کی نشاندہی فرمائی جو اس تنظیم کے لئے مضر ہو سکتی تھیں، تنظیم کے ذمہ داروں نے اس کا اعتراف کیا اور ایک تقریر کے بعد جو ایک بڑے مخصوص جلسہ میں ہوئی تھی یہاں تک کہا کہ ''شیخ جس وقت خطاب کر رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ شیخ حسن البناء ہمارے درمیان موجود ہیں اور وہ ہم کو خطاب کر رہے ہیں''۔ یہ تقریر بعد میں ''أريد أن أتحدث إلىٰ الاخوان'' (اخوان سے دو دو باتیں) کے عنوان سے خود اخوان نے شائع کی اور اسکے پہلے ایڈیشن پر شیخ محمد الغزالی اور دوسرے ایڈیشن پر

www.abulhasanalinadwi.org

استاذ حسن الهضیبی (مرشد عام) نے مقدمہ لکھا۔

مصر کے زمانہ قیام ہی میں حضرتؒ کے متعدد رسائل شائع ہوئے جن میں "إسمعی یا مصر" امتیازی شان رکھتا ہے جس میں حضرتؒ نے مصر کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا اور اس کو اس کی ذمہ داریاں بھی یاد دلائیں۔ یہ مضمون وہاں کے مقبول ترین رسالہ "الرسالہ" میں شائع ہوا، اور ایک الگ رسالہ کی شکل میں اس کو شائع کیا گیا، اور لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اسکے علاوہ تین رسالے اس زمانہ قیام میں اور شائع ہوئے۔ ایک سعودی ریڈیو پر کی گئی دونوں تقریروں کا مجموعہ "بين العالم و جزيرة العرب" دوسرے "شاعر الاسلام الدكتور محمد اقبال" اور تیسرے "المد و الجزر فی تاريخ الاسلام" ان رسائل سے بھی حضرت کی فکر و دعوت کی اشاعت ہوئی اور علمی و ادبی حلقوں میں بھی اسکو قبول کیا گیا۔

اس طرح یہ قافلہ جس نے مصر کی سرزمین پر جب قدم رکھا تھا تو اس کی صدا نامانوس تھی اس حال میں جدا ہو رہا تھا کہ اس کی صدائے بازگشت پورے مصر میں سنائی دے رہی تھی۔

سوڈان میں

مصر سے حضرتؒ دس روز کے لئے مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی کی رفاقت مین سوڈان تشریف لے گئے، وہاں کے اہم ذمہ داروں اور معززین سے تفصیلی ملاقاتیں کیں، اور ان کو خاص طور پر افریقہ میں دعوت اسلام پر آمادہ فرمایا۔

یہاں جن اہم ذمہ داروں سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں وہاں کے دینی و روحانی قائد سید میر غنی باشا، استاذ اسماعیل بک (جو بعد میں سوڈان کے وزیر اعظم ہوئے) شیخ شوقی اسد (سکریٹری جمعیۃ التبشیر الاسلامی) کے علاوہ جامع مسجد کے امام شیخ محمد عوض، جمعیۃ الشبان المسلمین کے صدر الحاج محمد موسیٰ سلیمان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کی عالم اسلام پر بڑی وسیع اور گہری نظر تھی، انکا مطالعہ

www.abulhasanalinadwi.org

وسیع اور جامع اور ان کا دل اسلام کی دعوت وعروج کے جذبہ سے معمور تھا، حضرت فرماتے ہیں کہ ''لکھنؤ میں بیٹھ کر وہ ایسے خطوط مجھ کو لکھتے رہے جن سے مجھے مصر کی داعیانہ اور قائدانہ اہمیت اور افریقہ میں دعوت کے وسیع میدان ہونے کا احساس پیدا ہوا اور میں اس کی کوشش کروں کہ مصر کا دینی طبقہ افریقہ میں دعوت واشاعت اسلام کی ذمہ داری قبول کرے۔'' اسی سلسلہ کے خطوط میں سے ایک خط کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے :

''اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ افریقہ کو اللہ تعالیٰ نورِ اسلام سے منور فرمادے اور تمھیں اس کا ذریعہ بنا کر اپنے شان وکرم کے مطابق اجر عطا فرمائے، بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں قدیم زمانہ سے تمدن رہا ہے، مثلاً ہند، ایسے ملک کے غیر مسلموں میں استکبار قبولِ حق سے بڑا مانع ہے۔ افریقہ میں مصر کے علاوہ تمام ملک تمدن سے خالی رہا ہے اور اب تک بڑا حصہ بالکل ابتدائی جاہلانہ بت پرستی کے سوا متمدن مذہب سے نا آشنا ہے، گویا تقریباً پورا براعظم سادہ تختی ہے، قرین عقل یہ ہے کہ حق کے قبول کرنے کی ان میں ایسی صلاحیت ہو جیسی عرب جاہلیت اور بربر اور ترکوں میں تھی، اور تمہاری کوششوں کو اللہ عزوجل قبول فرمالیں اور اہل افریقہ کے قلوب کو قبول حق کے لئے کھول دیں۔ مصر افریقہ کا دروازہ ہے، اگر اہل مصر کو اسکی ذمہ داری کا احساس ہو جائے اور اپنے ملک میں بیٹھے ہوئے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، اور مغرب صحرائے اعظم اور صحرا کے جنوب کے علاقوں سے جو حجاج جن میں اکثر پیادہ ہوتے ہیں مصر ہو کر گزریں تو ان کو دینی جدوجہد میں مشغول ہونے پر آمادہ کریں اور اپنے اپنے ملکوں میں اور قریب کی غیر مسلم آبادی میں تبلیغ کے لئے نکلنے پر تیار کریں، تو انشاء اللہ ایک دن پورا افریقہ نورِ اسلام سے منور ہوسکتا ہے۔''(۱)

---

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۹۶-۳۹۷

www.abulhasanalinadwi.org

شام کا سفر

سوڈان سے قاہرہ ہوتے ہوئے شام کا سفر ہوا، ۹/رمضان کو دمشق کی سرزمین پر قدم رکھا، وہاں پہونچ کر حضرت کو بوئے انس آئی اور دل میں عقیدت ومحبت کے جذبات امنڈنے لگے کہ یہ سرزمین صحابہ کرام کا مدفن اور کبارِ اولیاء وعلماء کا مولد و مسکن رہی ہے۔ پھر حضرت کے بچپن میں واقدی کی ''فتوح الشام'' کا جو منظوم ترجمہ ''صمصام الاسلام'' گھر میں پڑھا جاتا تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ وہاں کے شہروں قصبوں اور محلوں کے ناموں سے کان اسی طرح مانوس تھے جس طرح اپنے وطن کے شہر اور قصبات ہوں۔

دمشق پہونچ کر چند روز ''قصر الاندلس'' میں قیام رہا، پھر شیخ محمود الحافظ صاحب کے اصرار پر ان کے خسر شیخ عبدالوہاب صلاحی کی ضیافت قبول فرمائی جو قصر جمہوری کے امام تھے، اور شہر کے معززین اور صلحاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اس زمانے میں حضرتؒ کا معمول فجر بعد ٹہلنے کا تھا وہاں زمانہ قیام میں ایک لطیفہ یہ پیش آیا کہ ایک روز حضرتؒ جب چہل قدمی کر کے واپس آئے تو اتفاق سے شیخ کہیں گئے ہوئے تھے ان کو آنے میں تاخیر ہوئی، حضرتؒ کو یہ خیال ہوا کہ خود ہی ناشتہ کا انتظام کرلیں لیکن چونکہ حضرت کو کبھی اس سے سابقہ نہیں پڑا تھا اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ ''نہ ہی انڈا تلا جاسکا اور نہ ہی چائے بن سکی'' جب شیخ واپس آئے تو اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے ''**یا سیدی ما خُلقت لهذا**'' (حضرت آپ کو تو دوسرے ہی کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے)

شام میں کل اڑتالیس دن قیام رہا جس میں چوبیس دن دمشق کے حصہ میں آئے، اس پورے عرصہ میں حضرتؒ نے اپنی دعوت ومشن کو جاری رکھا، حجاز ومصر کے قیام اور وہاں مختلف طبقوں سے تعارف اور پھر ان کے تاثر کا نتیجہ یہ تھا کہ اب یہ آواز نامانوس نہیں رہی تھی، اور شام کے مختلف حلقے حضرتؒ کی ذات اور پیغام سے پہلے ہی

www.abulhasanalinadwi.org

مانوس تھے، وہاں جن ممتاز علماء سے ملاقاتیں ہوئیں اور تبادلۂ خیال کی نوبت آئی ان میں علامہ بہجۃ البیطار، شیخ ابوالخیر میدانی، شیخ احمد الدقر، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، علامہ محمد کرد علی، شیخ عبدالقادر مغربی اور علامہ شامی کے پوتے مفتی جمہوریہ ڈاکٹر ابوالیسر عابدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نوجوان اور صحیح الفکر اساتذہ میں سید عبدالرحمان البانی سے خاص ربط رہا اور وہ دمشق کے پورے قیام میں ایک معاون و رفیق کی حیثیت سے حضرتؒ کے ساتھ رہے۔ وہاں کے دینی و علمی اور ادبی مرکزوں میں بھی جانا ہوا، اور وہاں پارلیمنٹ کے ایک اہم اجلاس میں شرکت کی نوبت آئی۔ رمضان المبارک کے آخری ایام بیت المقدس میں گزارنے کے لئے حضرتؒ فلسطین تشریف لے گئے اور عید کی نماز بھی وہیں پڑھی، شیخ صادق مجددی کی دعوت پر ان کے ساتھ ہی ان کی قیامگاہ پر ٹھہرنا ہوا، عید کے بعد دو دن کے لئے "الخلیل" بھی جانا ہوا، اس کے علاوہ دوسرے شہروں اور مقامات پر بھی تشریف لے گئے ان میں حمص، حماۃ اور حلب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بیت المقدس کی واپسی پر شرق اردن کے حکمراں شاہ عبداللہ سے بھی ملاقات ہوئی، شیخ محمد صادق مجددی کے ذریعہ سے ان کو حضرتؒ کی آمد کا علم ہو چکا تھا۔ حضرتؒ نے ان سے دعوتی انداز میں بے تکلف گفتگو کی۔ قیام عمان ہی کے دوران تین دن کے بعد ان سے دوبارہ پھر ملاقات ہوئی اور انھوں نے حضرتؒ کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس عرصہ میں وہ "ماذا خسر العالم" پڑھ چکے تھے جو حضرت نے ان کو گذشتہ ملاقات پر دی تھی، اس پر انھوں نے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا، اس ملاقات میں حضرت نے اپنے دو رسالے **"بین العالم و جزیرۃ العرب"** اور **"شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال"** ان کو دیے اور خاص طور سے مسجد اقصیٰ کی دیکھ بھال کرنے اور پناہ گزینوں کی طرف توجہ کرنے کی دعوت دی۔ تقدیری بات ہے کہ اگلے جمعہ کو وہ مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کے لئے گئے اور وہیں شہید کر دیئے گئے۔

قیام شام میں سب سے اہم وہ مقالہ تھا جو ۲۳؍جولائی ۱۹۵۱ء کو حضرتؒ نے

www.abulhasanalinadwi.org

دمشق یونیورسٹی کے ہال میں ایک ممتاز اور صاحب فکر مجمع کے سامنے پڑھا، عمان اور بیت المقدس کے سفر کے دوران حضرت نے یہ مقالہ تیار کیا تھا جو مسئلہ فلسطین سے متعلق تھا، جلسہ کی صدارت یونیورسٹی کے عیسائی وائس چانسلر استاذ قسطنطین زُریق نے کی، حاضرین میں علامہ بہجۃ البیطار، شیخ احمد الدقر، استاذ سعید الافغانی، اس وقت کی شامی پارلیمنٹ کے اسپیکر ڈاکٹر معروف دوالیبی اور مشہور ادیب وشاعر ڈاکٹر عمر بہاء الامیری جیسے لوگ شامل تھے، مقالہ سے پہلے علامہ بہجۃ البیطار نے حضرتؒ کا تعارف کرایا اور مقالہ کے بعد ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے مقالہ پر تبصرہ کیا اور اس کے بنیادی خیالات کی تائید کی۔ اس تقریر کے علاوہ بھی متعدد مرکزی مقامات پر حضرت نے خطاب فرمایا۔ دمشق یونیورسٹی کی جامع مسجد میں وہاں کے ذمہ داروں کے اصرار پر حضرت نے جمعہ کا خطبہ بھی دیا۔ اس کے علاوہ حمص میں اخوان المسلمین کے مرکز میں ۲۹/جولائی کو ایک ولولہ انگیز اور مؤثر تقریر ہوئی۔

شام کے قیام میں وہاں کے مدفون متعدد صحابہ کرام، علماء ومشائخ کی قبور پر بھی حاضری ہوئی۔

۱۲/اگست ۱۹۵۱ء کو یہ سفر مکمل ہوا اور دمشق سے ہوائی جہاز کے ذریعہ مدینہ طیبہ واپسی ہوگئی (۱)۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ”چند دن مدینہ طیبہ میں قیام کر کے ہم لوگ مکہ مکرمہ آئے جو اس پورے سفر کا ”نهـايـة الـمطـاف“ تھا۔“ (۲) مکہ مکرمہ میں مزید پانچ مہینہ قیام رہا اور اسی دوران حضرتؒ نے تیسرا حج بھی فرمایا اور ان تعلقات کی تجدید بھی ہوئی جو مکہ معظّمہ کے پہلے قیام میں خاص طور پر بستان بخاری کے اجتماع کے بعد

---

(۱) یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت مشرق وسطیٰ کے طویل سفر سے اس شان کے ساتھ واپس ہوئے کہ وہاں جگہ جگہ حضرت کی دعوت وپیغام کی بازگشت تھی لیکن اس کے ساتھ زہد واستغناء کا یہ حال تھا کہ جب مدینہ منورہ کے مطار پر تشریف لائے تو ضرورت کے لئے پاس رقم نہیں تھی، حضرت نے اپنے بھانجے مولانا محمد رابع صاحب سے تقاضا فرمایا اور انہوں نے بھی رقم کا کہیں سے قرض لے کر انتظام کیا۔

(۲) کاروان زندگی ص ۳۹۱

پیدا ہوگئے تھے۔ اسی دوران سعودی ریڈیو پر حضرتؒ کی دو اور تقریریں نشر ہوئیں اور وہاں کے واحد عربی اخبار "البلاد السعودية" میں "كيف توجه المعارف" (تعلیم کی پالیسی اور طریقہ کار) کے عنوان سے ایک اہم مضمون بھی شائع ہوا، بعد میں اس کو کتابی شکل میں امام حرم شیخ عبدالمہیمن نے اپنے خرچ پر شائع کیا۔ اسی دوران شیخ محمد سرور صبان کی دعوت پر طائف کا ایک یادگار سفر بھی ہوا اور امیر طائف کی ایک خصوصی دعوت میں بھی شرکت ہوئی اور ان کے سامنے بھی دعوت پیش کرنے کا موقع ملا۔

مکہ معظّمہ میں ''وادئ فاطمہ'' کا ایک تبلیغی سفر بھی ہوا اور وہاں تعلیم یافتہ طبقے، مشہور ادباء اور صحافیوں کے سامنے حضرتؒ نے خطاب فرمایا۔

یہ طویل سفر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ختم ہوا اور اس طرح تقریباً تیرہ چودہ مہینے کے بعد حجاز ومشرق کے سفر سے ہندوستان واپسی ہوئی۔ (۱)

چونکہ ایک طویل عرصے کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی تھی اس لئے بھی لکھنؤ اسٹیشن پر تعلق والوں کی ایک جماعت استقبال کے لئے موجود تھی، ان لوگوں کے اصرار پر حضرتؒ نے اسٹیشن سے قریبی مسجد میں مختصراً سفر کی روداد سنائی اور اس میں بڑے درد کے ساتھ یہ اشعار بھی پڑھے ؎

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
وہ سجدہ روحِ زمین جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

حضرت مدنیؒ کا ایک تاریخی مکتوب

حضرتؒ کی اقبال مندی اور ترقی سے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کی

---

(۱) حضرتؒ نے اس پورے سفر کی سلیس عربی زبان میں روداد بھی قلمبند فرمائی جو ''مذکرات سائح فی الشرق العربی'' کے نام سے شائع ہوئی۔ حضرت کا یہ سفرنامہ عربی انشاء پردازی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ''شرق اوسط کی ڈائری'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔

www.abulhasanalinadwi.org

آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور وہ اس میں مزید ترقی کے لئے کوشاں رہتے۔اسی سلسلہ میں اس سفر کے دوران انھوں نے حضرت مدنیؒ کو دعا کی درخواست کے لئے ایک خط تحریر فرمایا تھا اور اس میں یہ جملہ بھی لکھا تھا کہ ''آپ دعا فرمائیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سید احمد شہیدؒ سے تجدید واصلاح کا کام لیا اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ علی سے یہ کام لے۔''اس کے جواب میں حضرت مدنیؒ نے جو والا نامہ تحریر فرمایا وہ یہاں ایک تاریخی امانت کے طور پر نقل کیا جاتا ہے۔

''محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک، والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔

مولوی علی میاں صاحب کی خبریں روساء تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب اور دیگر حضرات سے معلوم ہوتی رہتی تھیں، مگر آپکی تحریر سے تفصیلات معلوم ہوئیں اور مزید اطمینان ہوا، اللہ سے دعا ہے کہ وہ کریم کارساز موصوف کو مفتاح خیر اور مغلاقِ شر بنائے، اور حضرت سید صاحب شہید قدس اللہ سرہ العزیز کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت علیہ کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالا مال کرے۔آمین!

والسلام

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ

۱۵/ربیع الاول ۱۳۷۰ھ

www.abulhasanalinadwi.org

نواں باب

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوریؒ کی محبت و شفقت، خلافت واجازت، اندرون ملک دینی وملی خدمات اوراس کے لئے حضرتؒ کا دردوسوز۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۱ء تک کے اہم حوادث وواقعات

حضرت رائپوریؒ کی غایت درجہ شفقت ومحبت اور حضرتؒ کو اجازت وخلافت

۱۹۳۹ء میں حضرتؒ نے جن دینی مرکزوں کا دورہ فرمایا تھا ان میں رائپور کی خانقاہ بھی تھی۔ حضرت رائپوریؒ نے اس پہلی ہی ملاقات میں جس اپنائیت کا معاملہ فرمایا تھا اس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔

حضرت رائپوریؒ کی بزرگانہ شفقت، سیاسی فہم وفراست، دین و دنیا کی جامعیت، وسیع النظری، وسیع القلبی، ذہن کی وسعت اور حقیقت پسندی اور پھر فنائیت وبے نفسی کا حضرتؒ کے قلب ودماغ پر گہرا اثر پڑا کہ سرگروہ مشائخ میں ان صفات کا پایا جانا ایک نادر بات تھی، حضرتؒ کی جس ماحول میں ذہنی وفکری تربیت ہوئی تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت رائپوریؒ سے حضرتؒ کو خاص مناسبت پیدا ہوئی، حضرتؒ نے اپنے قلبی وفکری رجحان کو صاف محسوس کیا، دوسری طرف حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا

www.abulhasanalinadwi.org

صاحبؒ حضرتؒ کو حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں جانے اور ان سے استفادہ کرنے کی برابر تاکید فرماتے رہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ بھی اپنے مرض الوفات میں بار بار لوگوں کو حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں بیٹھنے اور ان سے استفادہ کرنے کی تاکید کرتے تھے اور اکثر و بیشتر حضرت ہی کو اس کام پر مامور فرماتے کہ لوگوں کو توجہ دلائیں۔ اس سے قدرتی طور پر خود حضرت کو بھی توجہ ہوئی۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرت رائپوریؒ سے ربط و تعلق میں مزید استحکام پیدا ہوا اور حضرت رائپوریؒ کی شفقت و توجہ بڑھنے لگی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ''رائپور جا کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ مادیت و عقلیت کے بحر ظلمات میں جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، یہی ایک جزیرہ ہے جہاں ذکر و فکر کے علاوہ کوئی موضوع گفتگو اور مشغلہ زندگی نہیں اور جہاں پتہ پتہ سے اللہ اللہ کی آواز آتی ہے۔''(۱)

۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہو گیا تو حضرتؒ کے لئے بار بار لاہور جانا اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں حاضری دینا مشکل ہو گیا، حضرت لاہوریؒ نے جو خود بھی حضرت رائپوریؒ کے بڑے قدر شناس اور عقیدت مند تھے، حضرتؒ کو ان کی خدمت میں جانے اور استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اسطرح حضرتؒ کا تعلق بڑھتا گیا اور حضرت رائپوریؒ کی شفقت و عنایت اور محبت بھی بڑھتی گئی، اور اس کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ حضرت رائپوریؒ کو حضرت کی آمد کا علم ہوتا تو انتظار شروع ہو جاتا اگر حاضری میں تاخیر ہوتی تو ملاقات کا اشتیاق ظاہر فرماتے اور قیام کے دوران بڑی خصوصیت کا معاملہ فرماتے۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اس تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اگرچہ یہ ناچیز ہی مولانا علی کے رائپور جانے اور حضرت سے تعلق قائم ہونے کا اول ذریعہ بنا، اور حضرت سے بیعت کا شرف بھی پہلے ناچیز ہی کو

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۳

www.abulhasanalinadwi.org

حاصل ہوا، لیکن موصوف کی ان خداداد صفات اور خصوصیات کی وجہ سے جن کی اللہ کے یہاں اوراس کے مقبول بندوں کے ہاں بھی زیادہ قدر و قیمت ہے، حضرت کے یہاں محبوبیت کا جو مقام ان کو حاصل ہوا وہ اس ناچیز کے لئے موجب مسرت ہونے کے باوجود ہمیشہ رشک و غبطہ کا باعث بھی بنا رہا۔ ذلک فضل اللہ یو تیہ من یشاء''(۱)

حضرتؒ سے اسی تعلق و محبت کا اثر تھا کہ لکھنؤ کو سات مرتبہ حضرت رائپوریؒ کی تشریف آوری کا شرف حاصل ہوا۔ دو مرتبہ حضرتؒ کے وطن رائے بریلی بھی تشریف لائے۔ اور دوسرے سفر میں جو ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا، ایک روز مسجد سے نکلتے ہوئے حضرتؒ کو چاروں سلسلوں خاص طور سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ میں اجازت و خلافت عطا فرمائی۔ حضرتؒ کا بھی حال یہ تھا کہ حضرت رائپوریؒ کے مشورہ کے بغیر کوئی اقدام نہ فرماتے اس کا آخری درجہ کا واقعہ یہ ہے کہ پہلے سفر حج کے بعد دوسرے ہی سال ایک قابل احترام شخصیت کی جانب سے حج کی پیشکش ہوئی، پہلی حاضری کے بعد دوبارہ حاضری کی جو تمنا ہوتی ہے وہ جاننے والا ہی جانتا ہے، پھر حضرتؒ کو جو تڑپ رہی ہوگی اس کا کچھ اندازہ اس کو ہوسکتا ہے جو حضرتؒ کے حرمین سے عشق و محبت کو جانتا ہو۔ حضرت رائپوریؒ دہلی کے محلّہ قصاب پورہ میں مقیم تھے، حضرت بھی حاضر خدمت تھے، اس کا تذکرہ فرمایا تو فرمانے لگے ''اگر میں روک دوں تو طبیعت پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟'' مشائخ کے یہاں اطاعت وانقیاد راہ سلوک کی بنیاد ہے، حضرت اس راہ کے رہرو ہی نہیں بلکہ اس کے رہبروں کی صف میں داخل ہو چکے تھے۔ فرمایا اگر حضرت روک دیں گے تو انشاء اللہ اثر نہیں پڑے گا۔ حضرت فرماتے ہیں ''حضرت نے میرے چہرہ کی طرف دیکھا، الحمدللہ اس پر کوئی اثر نہیں تھا''۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی سال حضرت رائپوریؒ نے حضرتؒ ہی کے لئے حج کا سفر فرمایا۔ ایک طرح سے یہ اُس بات کے ماننے کا انعام تھا جسکی ان حضرات کے

---

(۱) مقدمہ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائپوریؒ ص ۲۳

www.abulhasanalinadwi.org

یہاں بڑی قدر تھی۔

پورے سفر میں حضرت رائپوریؒ نے حضرتؒ کو اپنے ساتھ ہی رکھا اور غایت درجہ شفقت فرمائی، جسکو شفقت مادری کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں :

''نماز کے اوقات میں حضرتؒ کا قیام حرم شریف کے ایک خلوہ میں رہتا تھا، دوپہر کا کھانا بھی وہیں تناول فرماتے تھے۔ میں تبلیغی اجتماعات اور علماء و خواص کی ملاقاتوں میں ایسا منہمک رہتا کہ اکثر کھانے کے وقت دیر سے حاضری ہوتی، خیمہ میں قدم رکھتا تو دیکھتا کہ حضرت بیٹھے ہوئے ہیں، سامنے رومال میں روٹیاں لپٹی ہوئی رکھی ہیں، مجھ کو دیکھ کر فرماتے ''علی میاں! تم کو کھانے کا بھی ہوش نہیں! یہ دیکھو میں تمہارے لئے چپاتیاں لئے بیٹھا ہوں کہ خمیری روٹی تم کو نقصان کرتی ہے۔'' مدینہ طیبہ حاضری کا موقعہ آیا تو مجھ سے فرمایا...... ''بس اب حضرت شیخ کی ضیافت اور انتظام ختم ہوا اب تم ہمارے ساتھ رہو گے''۔ حضرت نے ہوائی جہاز سے سفر کا فیصلہ کیا اور میرا ٹکٹ بھی لیا۔ مدینہ طیبہ میں قیام حضرتؒ کے ساتھ مدرسہ علوم شرعیہ میں رہا۔

۲۰/محرم ۱۳۷۰ھ ۲/نومبر ۱۹۵۰ء کو حضرت کی مع اپنے رائے پوری رفقاء و خدام کے محمدی جہاز سے روانگی ہوئی۔ مجھے حجاز میں مزید قیام کرنا تھا اور کچھ مصر کے سفر کی بھی نیت تھی اس لئے واپسی کے سفر میں ہمرکابی نہیں رہی۔ ہم لوگوں نے جدہ کی بندرگاہ پر حضرت کو رخصت کیا۔ قدیم دستور کے مطابق حضرت ایک موٹر لانچ میں بیٹھ کر جہاز کے لئے روانہ ہوئے جو فاصلہ پر ٹھہرتا تھا، حضرت کے ایک خادم خاص راؤ حاجی فضل الرحمٰن خاں رائے پوری بیان کرتے ہیں ''جب تک تمہاری صورت اوجھل نہیں ہوئی، حضرت موٹر لانچ پر سے برابر تم کو دیکھتے رہے۔''(۱)

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۷ تا ۳۵۸

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت رائپوریؒ کے دو یادگار مکاتیب

حضرتؒ سے حضرت رائپوریؒ کے تعلق قلبی اور محبت کا اندازہ ان مکاتیب سے بھی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے حضرتؒ کو ارسال فرمائے۔ یہاں پر ان میں سے دو منتخب خطوط کے اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

حضرت اپنے خط میں حضرت رائپوری کے لئے سیدی و مرشدی کے الفاظ تحریر فرماتے تھے اسی جیسے کسی خط کے جواب میں حضرت رائپوری نے تحریر فرمایا:

''از احقر عبدالقادر

سیدی و مولای حضرت اقدس دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت! آپ مجھے کیا سیدی و مرشدی لکھتے ہیں؟ احقر تو حضرت کا خادم ہے، اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجہ نصیب فرماویں۔ حضرت والا کے والا نامہ کا تو بہت ہی انتظار رہتا ہے، اور اکثر اوقات حضرت کا خیال رہتا ہے، اب بہت شدت سے جناب کا انتظار ہے کہ کب جناب والا تشریف لاویں...............(۱)

ایک خط میں حضرت سے اشتیاق و ملاقات کا اس طرح ظاہر فرمایا کہ مولانا روم نے اپنے مرشد حضرت شمس تبریز کے اشتیاق میں جو اشعار کہے تھے وہ تحریر فرمائے، پھر لکھا کہ ''یہ اشعار اسلئے تحریر کئے ہیں کہ ہم نے آپ کو مولانا شمس تصور کر رکھا ہے اور تشریف لانے کے تقاضے کے لئے وہی اشعار لکھ دیئے ہیں۔(۲)

اندرون ملک ملی تحفظ کی فکر اور اس کی کوششیں

حضرتؒ کے پہلے سفر حجاز کے موقع پر جو ۱۹۴۷ء میں ہوا جس کا ذکر تفصیل سے گذر چکا، ہندوستان میں تقسیم کا وہ واقعہ پیش آیا جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا، قدرتی طور پر ہندوستان میں باقی رہ جانے والے مسلمانوں کو سب وشتم کا نشانہ بننا پڑا،

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مشاہیر امت کی نظر میں ص ۹۲ (۲) ایضاً

www.abulhasanalinadwi.org

ایک عرصہ تک ان پر مایوسی کی فضا طاری رہی، کوئی ملی تشخصات اور جداگانہ تہذیب کا مذاق اڑاتا، کوئی ہندی رسم الخط اختیار کر لینے کا مشورہ دیتا، تو کوئی قومی دھارے میں ضم ہوجانے کی بات کہتا۔ حضرتؒ جب سفر سے تشریف لائے تو ان حالات سے دل پر ایک چوٹ لگی اور شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہوا کہ یہ غیر فطری صورت حال ہے، اس کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے ورنہ مسلمانوں کا اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی رہنا مشکل ہوجائے گا۔ اس کے لئے حضرتؒ نے مضامین بھی لکھے، اور دوسری طرف فکرمند دانشوروں اور مختلف مکتب خیال دردمندوں کا ایک اجتماع بلایا تاکہ ان کے سامنے دل کا یہ درد رکھا جاسکے۔

۲۰؍شوال ۱۳۶۷ھ ۲۶؍اگست ۱۹۴۸ء کو دارالعلوم میں یہ ملی مشاورتی اجتماع منعقد ہوا، اور اس میں علماء اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ حضرتؒ نے اس میں پڑھنے کے لئے "سنگ راہ" کے عنوان سے ایک فکر انگیز اور موثر مقالہ تیار فرمایا جس میں ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کی روشنی میں موجودہ صورت حال کا حل پیش کیا گیا ہے۔ ان کی ملی غیرت کو جھنجھوڑا گیا ہے اور تبلیغ ودعوت کی عملی کوششوں کے ساتھ مخلوط مجمعوں میں حکیمانہ طرز پر خطاب، ہندی اور انگریزی میں دعوتی وتعارفی لٹریچر کی تیاری اور آزاد اسلامی درسگاہوں کے قیام کی افادیت وضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ مقالہ لوگوں نے توجہ سے سنا، خاص طور پر جگر مرادآبادی صاحبؒ نے دوسری نشست میں دوبارہ یہ مقالہ پڑھنے کی فرمائش کی جو پوری کی گئی۔

مذکورہ بالا تین تجاویز میں سے مخلوط اجتماعات سے خطاب کا سلسلہ ایک ہی دو سال بعد ۱۹۵۱ء سے باقاعدہ شروع ہوگیا۔ آزاد مدرسوں کے قیام کی کوششیں بھی بعض حلقوں کی طرف سے محدود پیمانہ پر ہو رہی تھیں، لیکن ہندی انگریزی میں لٹریچر کی تیاری کا کام نہ ہونے کے برابر تھا، اس کی فکر کی گئی۔ ہندی ترجمہ کا کچھ کام مولوی عابد علی صاحب بلہوری اور انگریزی ترجمہ کا جناب مظہر الدین صاحب صدیقی نے کیا، کچھ لٹریچر شائع ہوا، لیکن سب سے بڑا مسئلہ اس کی اشاعت کا تھا، مولانا اسحاق

www.abulhasanalinadwi.org

سندیلوی نے اس کی ذمہ داری قبول کی اور ایک سال کسی نہ کسی طریقہ پر یہ کام چلتا رہا، لیکن بالآخر مناسب جگہ نہ ملنے اور افراد کی کمی کے باعث یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر طویل عرصہ کے بعد ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' اور ''پیام انسانیت'' کے پلیٹ فارم سے اس کو دوبارہ جاری کیا گیا، اور حضرتؒ کی سرپرستی میں اس کو خاصی ترقی اور قبول عام حاصل ہوا۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء کے دوران تبلیغی اجتماعات سے خطابات بھی ہوتے رہے جس میں سب سے اہم تقریر ۶/دسمبر ۱۹۴۹ء میں ''صورت وحقیقت'' کے عنوان سے ہوئی اور لوگوں پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ اس کا عربی ترجمہ حضرت کے برادرزادہ مولانا سید محمد الحسنی صاحب نے فرمایا جن کی عمر اس وقت ۱۳ سال کی تھی، مگر ان کی خداداد صلاحیت اور وہبی تحریری طاقت کا نتیجہ تھا کہ ترجمہ میں تقریر کی پوری روانی اور طاقت موجود ہے۔ ۱۹۵۰ء کے سفر حجاز میں یہ رسالہ ذوق وشوق سے پڑھا گیا اور بعض عرب فضلاء نے اتنی بار پڑھا کہ ان کو تقریباً حفظ ہوگیا۔

ندوۃ العلماء کی رکنیت ومعتمدی

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی وفات اور دارالعلوم میں ان پر سیمینار

حضرتؒ کی شہرت ومقبولیت اب ہندوستان سے تجاوز کرچکی تھی، عالم عربی میں بھی حضرتؒ کی دعوت وفکر کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا اور حضرتؒ کی تحریریں اپنا اثر کررہی تھیں۔ دارالعلوم اس کا مستحق تھا کہ اس سے فائدہ اٹھائے اور حضرت کی توجہ اس کو حاصل ہو۔ ۱۹۴۸ء کے وسط میں مجلس منتظمہ نے حضرتؒ کو رکن مجلس انتظامی ومجلس دارالعلوم منتخب کیا اور ۱۹۴۹ء کی ابتدا میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریک پر نائب معتمد تعلیم بنایا گیا۔ حضرت سید صاحبؒ کا تعلق اخیر میں ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ اور حضرتؒ سے بہت بڑھ گیا تھا، خاص طور پر ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کا

www.abulhasanalinadwi.org

مقدمہ تحریر فرمانے کے بعد حضرتؒ پر وہ بڑی شفقت فرمانے لگے تھے، کتاب پر انھوں نے کھل کر داد دی اور یہاں تک لکھا کہ ''یہ کتاب مسلمانوں کے ہاتھ میں رشد و ہدایت اور عزم و ہمت کا ایک صحیفہ ہے۔'' ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان تشریف لے گئے اور وہیں نومبر ۱۹۵۳ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد بالاتفاق حضرتؒ کو معتمد تعلیم منتخب کیا گیا۔ حضرتؒ نے وفات کے دوسرے ہی مہینہ دارالعلوم میں ان کی شخصیت اور کارناموں پر ایک سیمینار منعقد کیا اس کی صدارت کے لئے مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کو دعوت دی، ضعف وعلالت کے باوجود وہ تشریف لائے جلسہ کی صدارت بھی فرمائی اور سیرۃ النبی جلد ششم پر ایک طویل اور پر مغز مقالہ بھی پڑھا۔

مخلوط اجتماعات

www.abulhasanalinadwi.org

حضرتؒ، حضرت مولانا منظور نعمانی صاحبؒ کی رفاقت میں تبلیغی سفروں اور اس کے اجتماعات میں اپنے طریقہ فکر و لائحہ عمل کے ساتھ مشغول تھے، اسی دوران یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسے مخلوط اجتماعات بھی کئے جائیں جن میں خاص طور پر تعلیم یافتہ غیر مسلم حضرات کو دعوت دی جائے اور ان کے ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے خطاب ہو، تقریر بھی ایسی زبان میں کی جائے جو ان کیلئے زیادہ قابل فہم اور پر کشش ہو، ہندی، انگریزی کے آسان الفاظ اس میں استعمال کئے جائیں۔

حضرت فرماتے ہیں :

''لیکن یہ کام بہت نازک تھا، اس کے لئے بڑے سلیقہ، احتیاط، اظہار خیال پر قدرت اور مخاطبین کی نفسیات کو سمجھنے کی ضرورت تھی، ذرا سی بے احتیاطی سے یہ دعوت ''وحدت ادیان'' کے لئے راستہ ہموار کر سکتی تھی، دوسری طرف مخاطبین کے اس شوق کو ختم کر سکتی تھی جو ایک مرتبہ جلسہ میں آچکے ہوں، اس لئے یہ نازک کام زیادہ میں اور کم تر مولانا منظور صاحب نعمانی انجام دیتے تھے اور الحمدللہ یہ تجربہ بہت کامیاب ہوا۔

مصر اور شام سے واپسی پر لکھنؤ کی تبلیغی جماعت کے زیر اہتمام امین الدولہ پارک میں جس کو جھنڈے والا پارک بھی کہتے ہیں اور جہاں تحریک خلافت کے وقت سے لے کر اس وقت تک اہم سیاسی جلسے ہوتے رہے اور گاندھی جی اور موتی لال نہرو سے لیکر مولانا محمد علیؒ اور جواہر لال نہرو نے ہمیشہ تقریریں کی، ایک عمومی اور مخلوط جلسہ ہوا جس میں مسلم اور غیر مسلم سبھی شریک تھے۔ میں نے وہاں ''خدا پرستی اور نفس پرستی'' کے عنوان سے ان دو متوازی فلسفہ حیات اور عالمگیر مذہبوں پر تقریر کی جنھوں نے دنیا کو منقسم کر رکھا ہے اور دونوں کے نتائج اور زندگی پر اثرات کی وضاحت کی۔ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ اس جلسہ میں حاضرین کی اتنی تعداد تھی جو بڑے سے بڑے سیاسی رہنما حتی کہ جواہر لال نہرو صاحب کے خطاب میں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ من جانب اللہ یہ بات تھی کہ مضامین کی ایسی آمد اور تقریر میں ایسی روانی اور جوش تھا کہ سامعین ایک سکتہ کے عالم میں تھے۔ اور ایسی خاموشی تھی جس کو (Pin Drop Silence) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہت سے رکشہ والوں نے جن کا اڈہ قریب تھا، سواری لینے سے انکار کر دیا اور کھڑے سنتے رہے۔ اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ تھی جو میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ بھائی صاحب مرحوم بھی پاس کی ایک عمارت میں بیٹھے ہوئے تقریر سن رہے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی محنت اور تربیت ذہنی پر مسرور و مطمئن ہوئے ہوں گے۔'' (۱)

اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور مختلف مقامات پر اسکے کامیاب اجتماعات ہوئے۔ اسی نے بعد میں ''تحریک پیام انسانیت'' کی شکل اختیار کر لی اور اس سے پورے ملک میں جس طرح فضا سازی کا کام ہوا وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں پہلی تقریر

دارالعلوم میں سجاد لائبریری کے نام سے طلبہ بہار کی ایک انجمن تھی جن میں بعض

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۹۷ تا ۳۹۸

www.abulhasanalinadwi.org

طلبہ حضرتؒ سے مانوس تھے جن میں خاص طور پر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی قابل ذکر ہیں، جو اس وقت دارالعلوم کے طالب علم تھے۔ ان طلبہ نے حضرت کو وہاں خطاب کی دعوت دی اور ایک سفارشی خط حضرت مدنیؒ سے لکھوا کر حضرت کو بھیجا۔ اس پر مولانا اعزاز علی صاحب نے بھی سفارشی کلمات لکھوائے، بطور یادگار وہ خط یہاں نقل کیا جاتا ہے :

جناب مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب زید مجدہ...... بعد از سلام مسنون

عرض آنکہ طلبائے دارالعلوم سجاد لائبریری کی پرزور خواہش ہے کہ وہ آپ کی گراں قدر نصائح اور ہدایات سے مستفید ہوں۔ امیدوار ہوں کہ ان تمناؤں کو قبولیت سے نوازیں۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۲۰ر جمادی الاول ۱۳۷۳ھ (۱۴ر جنوری ۱۹۵۴ء)

انچہ استاذ ازل (مولانا مدنی عمت فیوضہم) گفت

ہماں می گویم

محمد اعزاز علی امروہی (۱)

حضرت نے ''طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر فرمایا، جو حضرت کی شاہکار تحریروں میں سے ہے اس کا ایک اقتباس یہاں بطور نمونہ کے پیش کیا جاتا ہے :

''دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت و فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے، لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے۔ اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون اور وقوف ہو تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے، لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے تو مدرسہ میں جمود و تعطل کی گنجائش کہاں؟! اس کو قدم

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۰۲

www.abulhasanalinadwi.org

قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، بھکے ہوئے قدموں کو راستے پر لگانا ہے، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے یا کسی منزل پر قیام کرے یا اس کو کوئی مقام خوش آ جائے تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے؟ سرود ازلی اور پیغام محمدیؐ اسے کون سنائے؟ مدرسہ کا تعطل اور قیادت سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام، خودکشی کا مرادف ہے اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کے ہم معنی ہے اور کوئی خود شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کر سکتا۔'' (۱)

مارچ ۱۹۵۲ء کو یہ جلسہ ہوا۔ اور طلبہ نے بڑے ذوق وشوق اور تاثر کے ساتھ یہ مقالہ سنا۔ بعد میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے تعارفی کلمات کے ساتھ یہ پورا مقالہ الفرقان میں شائع کیا۔ یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نعمانیؒ کے اس تعارف واعتراف اور تاثر کو نقل کر دیا جائے کہ وہ ایک شب و روز کے رفیق کی شہادت ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں :

''(یہ مقالہ اگرچہ مقالہ ہی ہے) کوئی کتاب نہیں ہے لیکن اپنا یہ احساس اور تأثر بے تکلف ظاہر کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ اس عاجز کی نظر میں اسکی قیمت واہمیت سینکڑوں صفحات والی بہت سی کتابوں سے بھی زیادہ ہے۔ یہ مقالہ لکھنے والے قلم کی صرف قوالی نہیں ہے بلکہ اسکے دل کا درد اور اسکا یہی حال ہے، اور جن باتوں کی طرف دینی مدارس کے طلبہ اور فضلاء کو اس میں توجہ دلائی گئی ہے اللہ کی خاص عنایت اور توفیق سے مقالہ نگار خود اس کا زندہ نمونہ ہے۔

دوسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اس عاجز کا سن تو اگرچہ ابھی پچاس سے بھی کم ہے لیکن زندگی مختلف میدانوں میں کچھ ایسی رواں دواں گذری کہ اتنی ہی عمر میں بہت کچھ دیکھ لیا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا تجربہ اور میری واقفیت

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۰۳ تا ۴۰۴

www.abulhasanalinadwi.org

اتنی ہے کہ اپنی اس رائے کے اظہار کا مجھے بجا حق ہے، ہماری اس دنیا میں ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذہن ثاقب بھی ملا ہو اور دل روشن بھی، جو اس دوڑتی ہوئی اور کروٹیں بدلتی ہوئی دنیا کے حالات و مزاج اور اس کے نت نئے تقاضوں سے پورے باخبر بھی ہوں اور دینی وایمانی حقائق کے بارے میں وارثین انبیاء کی طرح صاحب یقین بھی۔ ....
الغرض ہماری اس دنیا میں یہ جنس بہت ہی کمیاب ہے اور اللہ کے ایسے بندے جو ان دونوں صفتوں کے جامع ہوں، اس عاجز نے غالبًا اتنے بھی نہیں دیکھے جتنی کہ اپنے ایک ہاتھ میں انگلیاں ہیں، لیکن جو دو چار دیکھے ہیں ان میں ایک ذات رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی کی بھی ہے۔ اللہ کی خاص عنایت اور توفیق سے وہ صاحب نظر وفکر بھی ہیں اور صاحب قلب بھی، وہ اپنے علم و معلومات کے لحاظ سے جدید بھی ہیں، اور ایمان ویقین اور رسوخ فی الدین او رطرز زندگی کے لحاظ سے قدیم بھی، ان کی ذات میں مدرسہ بھی ہے اور خانقاہ بھی، ان کی گہری علمی بصیرت اور دقیق نظر کی شہادت کے لئے ان کی ایک کتاب "**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**" کافی ہے، جو گذشتہ دو ڈھائی برس ہی میں مصر میں بار بار چھپ کر ختم ہو چکی ہے، اور اس وقت پھر چھپ رہی ہے۔" (۱)

تقسیم کے بعد پاکستان کے دوسفر

۱۹۵۴ء کو حضرت رائپوریؒ نے "کوہ مری" میں رمضان گذارا۔ حضرتؒ نے بھی وہیں رمضان گذارنے کے لئے پاکستان کا سفر کیا۔ پورے مہینہ حضرت رائپوریؒ کی خصوصی توجہات اور شفقتیں حضرتؒ کو حاصل رہیں۔ آمد و رفت میں لاہور بھی کچھ روز کیلئے قیام فرمایا، اور حضرت لاہوریؒ کی خدمت میں حاضری دی، اور حضرتؒ کے الفاظ میں "انکی سرپرستانہ وبزرگانہ شفقت کا حظ وکیف حاصل ہوا"۔

(۱) رسالہ ماہنامہ الفرقان جلد ۲۱، شمارہ ۸، ص ۶-۷

www.abulhasanalinadwi.org

دوسرا سفر اگلے ہی سال مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کی رفاقت میں ہوا، اور حضرتؒ پشاور اور کوہاٹ تک تشریف لے گئے۔ اسی سفر میں مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سلونویؒ (شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء) کے حادثہ وفات کی خبر ملی، اور دوسری خوش کن خبر "البعث الاسلامی" کے اجراء کی تھی، حضرت کو اسکا پہلا نسخہ اسی سفر میں ملا۔

ان ہی سفروں میں سے کسی سفر میں مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے حضرتؒ کے اعزاز میں جامعہ سلفیہ میں ایک تقریب منعقد کی، اور اس وقت کے بزرگ ترین فرد جماعت مولانا داؤد غزنوی نے اس میں سپاس نامہ پڑھا۔ یہ حضرت کے ذاتی کمالات کے علاوہ اس روحانی تعلق و ربط کا بھی نتیجہ تھا جو ان کے خاندان کو حضرت سید صاحبؒ اور ان کے خاندان و مسلک کے ساتھ رہا تھا۔

"تاریخ دعوت وعزیمت" کی تصنیف

جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جو اپنے اندر دینی جذبہ بھی رکھتا تھا بعض تحریکوں کے اثرات کی وجہ سے یہ خام خیالی پیدا ہونے لگی تھی کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح وتجدید اور انقلاب حال کی کوششیں مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتیں اور درمیان میں ایسے طویل وقفہ بھی گذرے ہیں جو مصلحین ومجددین سے خالی رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ تصور احساس کہتری اور ذہنی شکست خوردگی اور تاریخ اسلام پر سطحی نگاہ کا نتیجہ تھا، حضرتؒ نے یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ اسلام کی تاریخ اصلاح وتجدید کو ایسے تسلسل کے ساتھ نئی زبان میں پیش کیا جائے جس سے یہ بدگمانی اور مایوسی دور ہو اور اسلام کی حقانیت، اس کی اندرونی طاقت اور صلاحیت پر اعتماد پیدا ہو۔ اسی دوران حضرتؒ، حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ حضرت "بہٹ ہاؤس" میں شاہ مسعود صاحب کے دولت خانہ پر مقیم تھے۔ صبح ہوا خوری میں حضرتؒ بھی حضرت رائپوریؒ کے ساتھ ہو گئے، حضرت رائپوریؒ نے اپنے ایک غیر مسلم اہل تعلق سے فرمایا کہ اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسلام کو جس زمانہ میں جیسے

www.abulhasanalinadwi.org

مردان کار کی ضرورت پیش آئی، اللہ تعالیٰ ان کو پیدا کرتا رہا اور جب کسی فتنہ نے سر اٹھایا اللہ نے اس کی سرکوبی کے لئے کسی کو کھڑا کر دیا۔ حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں :

''حضرت کے اس مختصر جملہ نے میرے سامنے تاریخی و علمی شواہد کا ایک لشکر کھڑا کر دیا اور اس موضوع پر مفصل لکھنے کی تحریک پیدا کی۔''(۱)

اس کے بعد ہی حضرتؒ کو لکھنؤ کے مرکز تبلیغ و دعوت میں ''اصلاح وتجدید کی تاریخ اور اسکی اہم شخصیتوں'' کے عنوان سے ایک ہفتہ تک مسلسل خطاب کرنے کی نوبت آئی، جماعت کے ایک رفیق عبد الصمد صاحب بریلوی نے ان کو اسی وقت منضبط کرلیا، پھر حضرتؒ نے اسی مسودہ کو سامنے رکھ کر علمی وتاریخی اسلوب میں ایک کتاب کے قالب میں ڈھال دیا۔ اس طرح سے ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کی پہلی جلد مرتب ہوئی۔ اس تصنیف کے وقت حضرت اپنے انہماک کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''یہ موضوع (مصنف کے مزاج اور افتاد طبع کے مطابق) اس کے ذہن و اعصاب پر مستولی ہو گیا تھا، حالت یہ ہوئی کہ مرشد محترم حضرت رائپوریؒ مرکز میں مقیم ہیں اور میں ہی اصل داعی اور میزبان ہوں، لیکن صبح کے ضروری کاموں سے فراغت کر کے مرکز کے بالائی حصہ پر چلا جاتا اور حضرت کے کھانے کے وقت تک لکھنے میں مشغول رہتا۔ کئی بار خیال آیا کہ حضرت میری اس غیر حاضری کو محسوس کرتے ہوں گے، لیکن پھر اطمینان ہوتا تھا کہ اس کوشش کی تکمیل جب سامنے آئے گی تو حضرت ہی سب سے زیادہ خوش ہوں گے۔''(۲)

اکتوبر ۱۹۵۴ء کو یہ پہلی جلد دار المصنّفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔ دینی و علمی حلقوں میں اسکو بڑی قدر و وقعت کے ساتھ قبول کیا گیا لیکن سب سے زیادہ حضرت رائپوریؒ نے اس پر اپنی مسرت ظاہر فرمائی اور بار بار مکاتیب عالیہ میں اس کا تذکرہ

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۱۲

(۲) کاروان زندگی اول ص ۴۱۳

www.abulhasanalinadwi.org

فرمایا۔اسی سے متعلق چند خطوط کے اقتباسات یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

''احقر آج کل آپ کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' سن رہا ہے، شاہ صاحب(۱) کے یہاں سے مل گئی تھی۔ ماشاءاللہ بہت اچھی کتاب ہے۔ آپ کو اللہ تبارک تعالیٰ جزائے خیر مرحمت فرمائے، آپ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کتاب لکھی ہے، واقعی یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قبول فرمائیں۔ کیا عرض کروں ایسا ذوق معلوم ہوتا ہے اس کا کچھ اندازہ ہمیں کو ہے۔''

۲۸؍نومبر ۱۹۵۶ء کے ایک مکتوب گرامی میں ارشاد فرماتے ہیں :

''آپ کی کتاب دوسری تیسری دفعہ سن رہا تھا کہ آج اس کو قاضی احسان صاحب نے مانگ لیا، وہ لے گئے ہیں، آپ کی کتاب سے سیری نہیں ہوتی ہے۔''

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

''بہت ہی اچھا ہوگا کتاب کی دوسری جلد بھی شائع ہوجائے۔''(۲)

علماء اہل قلم و مصنّفین میں سے سب سے زیادہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے کتاب کی داد دی، جو خود اس موضوع پر شاید عالم اسلام میں اور کم سے کم ہندوستان میں لکھنے کا سب سے زیادہ حق رکھتے تھے اور جن کی تحریروں سے خود مصنف نے بڑا فائدہ اٹھایا تھا۔ مولانا نے کتاب پا کر جو خط لکھا اس کا ایک اقتباس درج ہے :

''دعوت وعزیمت'' کی تاریخ ملی ہے، اپنی گم گشتہ چیز ہاتھ آ گئی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کتنی دفعہ اس کے مطالعہ سے استفادہ کرتا رہوں گا، پڑھ رہا ہوں اور جی سیر نہیں ہوتا، خدا ہی جانتا ہے میرے کتنے خوابوں کی تعبیر آپ کے ذریعہ

(۱) شاہ مسعود صاحب رئیس بہٹ، سہارن پور

(۲) کاروان زندگی اول ص ۴۱۴

www.abulhasanalinadwi.org

پوری ہوگی۔"(۱)

۱۹۵۶ء میں اسکی دوسری جلد مکمل ہوئی اور دارالمصنّفین ہی سے شائع ہوئی، تیسری جلد جو مشائخ ہندوستان پر مشتمل تھی اس کی تصنیف میں خاصی تاخیر ہوئی۔ حضرت رائپوری کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا بھی تذکرہ ہے، تو حضرت رائپوریؒ کو اس کا بڑا تقاضا اور اشتیاق پیدا ہوا، ۱۹۶۱ء میں یہ جلد مکمل ہوئی اور حضرتؒ اس کا مسودہ لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت رائپوریؒ نے پہنچتے ہی کتاب سنانے کا تقاضا کیا، ظہر سے عصر تک اور عصر سے مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہتا، اور جب تک کتاب پوری نہیں ہوئی کوئی دوسرا کام ان وقتوں میں نہیں ہوا۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا تذکرہ حضرت رائپوریؒ کے مرض الوفات میں لکھا گیا اور یہ کتاب ان کی وفات کے بعد "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" سے شائع ہوئی، جس کا قیام ۱۹۵۹ء میں ہو چکا تھا۔ حصہ چہارم جو حضرت مجدد صاحبؒ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے اٹھارہ سال کے بعد ۱۹۸۰ء میں طبع ہوا، پھر اس کے چار ہی سال کے بعد حصہ پنجم بھی مرتب ہوگیا۔ جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے عالی مرتبت صاحبزادگان اور احفاد وخلفاء کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت پہلے ہی لکھی جا چکی تھی۔ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، حضرت رائپوریؒ اور حضرت شیخؒ کے تذکرے بھی حضرتؒ نے تحریر فرمائے۔

اس طرح پندرہویں صدی ہجری تک اصلاح وتجدید کی پوری تاریخ حضرتؒ کے قلم سے مرتب ہوگئی۔

دمشق یونیورسٹی میں محاضرات کا سلسلہ

۱۹۵۱ء کے سفر مصر وشام میں حضرت نے جو نقوش چھوڑے تھے اور وہاں کے

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۱۵

www.abulhasanalinadwi.org

مختلف طبقوں، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ نے حضرت کی فکر و دعوت سے اپنی جس شیفتگی وگرویدگی کا اظہار کیا تھا کہ گویا وہ ان کے دل کا ساز اور اندر کی آواز ہے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے زعماء و قائدین اور علماء و مشائخ کی توجہ بھی حضرتؒ کی ذات اور دعوت کی طرف منعطف ہونے لگی اور ان کو اس کی ضرورت و افادیت کا احساس ہونے لگا کہ حضرتؒ کا دوبارہ سفر ہو اور اس پیغام کو تازہ کیا جائے جو حضرتؒ کی اصل سوغات تھی۔ تین چار سال تک اس کی نوبت نہیں آسکی، بالآخر اسکی ایک تقریب یہ پیدا ہوئی کہ دمشق یونیورسٹی میں ''كلية الشريعة'' کا قیام عمل میں آیا، اس کے صدر ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی سے شام کے زمانہ قیام میں دوستانہ و برادرانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے، انھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ یہ درخواست کی کہ دو سال یا ایک سال کے لئے ''كلية الشريعة'' میں باقاعدہ استاذ کی حیثیت سے حضرتؒ ذمہ داری قبول کرلیں تاکہ حضرتؒ کی فکر و دعوت اور گہری فہم و بصیرت سے وہاں کے طلبہ پوری طرح مستفید ہوسکیں۔ حضرتؒ کی پوری زندگی جس زہد و استغناء اور صبر و تحمل کے ساتھ گذری تھی جو ہر مصلح و مجدد کی امتیازی شان اور ان کا شعار ہوتا ہے، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرتؒ نے معذرت فرمالی، البتہ اپنی دعوت کو پیش کرنے کے لئے اس پر آمادگی ظاہر فرمادی کہ دو تین مہینوں کے لئے یہ سفر ہو اور اس میں کسی خاص موضوع پر مقالات پڑھے جائیں۔ ڈاکٹر سباعی صاحب نے اس کو غنیمت جان کر منظور فرمالیا۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے بڑا شفقت آمیز مکتوب تحریر فرمایا اس میں یہ بھی لکھا کہ

''اللہ کے مبارک اسم میں انقطاع عن الخلق اور احتیاج الی اللہ کا زبردست اثر ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں بارہ تیرہ سو کی ماہوار رقم حسبۃً للہ چھوڑ دینا معمولی بات نہیں ہے۔ اس پاک نام کی ہزاروں برکتوں میں سے ایک برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مبارک نام کی برکتوں سے اور بھی آپ کو مالا مال فرمائے۔''

ڈاکٹر سباعی صاحب سے خط و کتابت کے دوران ہی حضرتؒ رائپور حاضر ہوئے

www.abulhasanalinadwi.org

اور حضرت رائپوریؒ سے اجازت طلب فرمائی۔ حضرتؒ نے بخوشی اجازت دی اور اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔

حضرتؒ کو بھی طبعی طور پر اس دینی و علمی اعزاز سے مسرت ہوئی اور اہل تعلق بھی خوش ہوئے۔ خاص طور پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بڑی مسرت کے خطوط تحریر فرمائے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

''اخبار ''الجمعیۃ'' اس کے بعد ''مدینہ'' میں بھی اس تاریخی امتیاز کی خبر پڑھی جو صدیوں کے بعد ہندوستان کو حاصل ہوا۔ علامہ صفی الدین بدایونی کے بعد شاید آپ دوسرے ہندی عالم ہیں جن کو شام میں پڑھانے اور اپنے علوم سے شامیوں کو فائدہ پہنچانے کا موقعہ ملا، بلکہ صفی ہندی تو خود گئے تھے اور آپ کو تو وہاں کی حکومت اور جامعہ نے طلب کیا ہے۔ وشتان بينهما

یہ امتیاز آپ کی شخصیت تک محدود نہیں ہے بلکہ سارے ہندی علماء کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔ یا ليت كثّر الله أمثالكم فينا ۔ ڈاکٹر صاحب اور آپ کے سارے خاندان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہوئے جو خوشی مجھے ہو رہی ہے اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا''۔

حضرتؒ نے محاضرات کے لئے ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کا موضوع منتخب فرمایا تا کہ یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ، فضلاء و اساتذہ کے سامنے تاریخ کے مطالعہ کا وہ ماحصل پیش کیا جا سکے جو اِس تاریخ ساز سرزمین کو نئے سرے سے دینی فکر و عمل اور اصلاح و انقلاب حال پر آمادہ کر سکے اور ایک مہمیز کا کام دے۔

۱۹۵۶ء کو اپریل کی بالکل ابتدائی تاریخوں میں یہ سفر ہوا۔ مطار پر ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کے علاوہ استاذ محمد المبارک اور استاذ مصطفیٰ الزرقاء استقبال کے لئے موجود تھے۔ سباعی صاحب نے فندق الیرموک میں قیام کا سرکاری نظم کیا تھا، چند روز حضرتؒ وہاں ٹھہرے، پھر اپنی پرانی قیام گاہ شیخ عبدالوہاب الصلاحی کے مکان پر ان کی خواہش و اصرار پر تشریف لے آئے۔

اس پورے قیام میں آٹھ محاضرات ہوئے۔ یونیورسٹی کے مرکزی ہال میں اس کا انتظام کیا گیا تھا، پورا ہال حاضرین سے بھر جاتا اور سامعین کی بڑی تعداد کھڑے ہوکر سنتی۔ دمشق کے ممتاز فضلاء اور اساتذہ جامعہ مثلاً استاذ محمد المبارک، استاذ محمد الزرقاء، ڈاکٹر معروف دوالیبی اور علماء میں علامہ بھجۃ البیطار جیسے فضلاء عام نوجوانوں اور طلباء کی طرح پابندی سے شریک ہوتے۔ محاضرات کے دوران ہی رمضان شروع ہوگیا، وقت بھی ساڑھے آٹھ بجے کا ہوتا جو عام طور پر آرام کرنے کا ہوتا ہے مگر جلسوں کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا، اور لوگ پورے ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کرتے رہے۔

آخری محاضرہ سے ایک دن پہلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر احمد السمّان کی طرف سے حضرتؒ کے اعزاز میں ظہرانہ کا انتظام کیا گیا، اس میں یونیورسٹی کے فاضل اساتذہ اور بہت سے معززین شہر مدعو تھے۔ الجزائر کے مجاہد و فاضل علامہ محمد بشیر الابراہیمی بھی اتفاق سے وہاں مقیم تھے، وہ بھی اس دعوت میں شریک ہوئے۔

حسن اتفاق کہ حضرتؒ کے بڑے محبوب دوست ڈاکٹر سعید رمضان بھی اس زمانہ میں وہیں مقیم تھے، ان کی قیام گاہ پر تقریباً ہر روز نشست ہوتی جس میں متعدد اسلامی فکر رکھنے والے نوجوان اور علماء شریک ہوتے۔

شیخ حارون العسل الحجّار سے ملاقات

شام میں قیام کے دوران بعض اہل تعلق نے حضرتؒ سے شیخ حارون کا تعارف کرایا کہ وہ یہاں کے بڑے عارف بزرگ اور شیخ اکبر ابن عربی کے علوم کے بڑے غوّاص و محقق ہیں۔ حضرت ایک روز ان کی مجلس میں تشریف لے گئے، حضرت سے ان کی پہلے سے کوئی شناسائی نہیں تھی مگر وہ حضرت کو دیکھتے ہی بے ساختہ کھڑے ہو گئے اور اپنے قریب بٹھایا، وہاں مجلس کا رنگ ہی دوسرا تھا، لوگ بجائے شیخ کے افادات سننے

www.abulhasanalinadwi.org

کے آپس میں گفتگو کر رہے تھے، شیخ بھی اپنی زبان سے ناگواری کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ مجلس کے اختتام پر کسی نے کہا شیخ ابوالحسن بھی یہاں تشریف رکھتے ہیں وہ کچھ خطاب فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا 'میں تو خود سننے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔'' پھر بڑے حکیمانہ انداز میں لوگوں کو شیخ کی طرف متوجہ ہونے اور ان سے استفادہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس خطاب میں شیخ نے اپنے دل کی ترجمانی اور حقیقت حال کی تصویر محسوس کی۔

جو چیز وہ خود اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہتے تھے، وہ اللہ نے حضرتؒ سے کہلوائی، اس کے بعد سے وہ حضرت سے بڑی محبت فرمانے لگے، خود ملاقات کے لئے تشریف لاتے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ بار بار ملنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ :

''مجھے ان کے کشف اور ادراک باطنی کا تجربہ اس طرح ہوا کہ شیخ اکبر کے رسالہ ''روح القدس'' کی مجھے ضرورت تھی، وہ انھوں نے مجھے عنایت فرمایا، میں نے کہا کہ اس پر ہدیہ کے الفاظ لکھ دیں۔ وہ مجھے ابوالحسن الندوی کے نام سے جانتے تھے، جب وہ ہدیہ کے الفاظ لکھنے لگے تو اچانک سر اٹھا کر فرمایا کہ ''تم فلاں خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟'' میں نے کہا ہندوستان میں لوگ یہی کہتے ہیں۔ فرمایا کہ ''ابھی خوشبو آئی۔''(۱)

حضرتؒ کے تعلق سے وہاں کا روشن خیال علمی طبقہ بھی ان سے مانوس ہوا، اور خاص طور پر ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی ان کی خدمت میں حاضری دینے لگے، پھر اپنی وصیت کے مطابق انہیں کے جوار میں مدفون بھی ہوئے۔

دمشق ریڈیو پر بھی حضرت کی دو تقریریں ہوئیں؛ پہلی تقریر "**إسمعي يا سوريه**" کے عنوان سے اور دوسری "**محمد اقبال فی مدينة الرسول**" کے عنوان سے۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۲۸

www.abulhasanalinadwi.org

لبنان اور ترکی کا سفر

شام کے قیام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرتؒ نے پہلے لبنان کا سفر کیا اور وہاں کے اہم علماء وقائدین سے ملاقات کی، اہم دینی مراکز ومدارس کے دورے کیے، طرابلس تشریف لے گئے، اور وہاں مرکز المولویۃ (جو مولانا روم کی طرف منسوب ہے)، مدرسہ ابن خلدون اور مدرسۃ الغزالی کا معائنہ فرمایا اور وہاں نوجوانوں سے خطاب کیا۔ واپسی میں خلیۃ الملک سعود میں ایک منتخب مجمع کے سامنے ایک اہم تقریر ہوئی جس کا موضوع تھا کہ ''قومیں تمدنوں کے بل پر زندہ نہیں رہتیں، پیغاموں کے دم سے زندہ رہتی ہیں اور روح اور خصوصیات ان کی محافظ ومعاون ہوتی ہیں۔''

لبنان سے شام واپسی کے بعد ترکی کے سفر سے پہلے حضرت کی ایک اہم تقریر ''حاجتنا إلیٰ إیمان جدید'' کے عنوان سے حلب میں اخوان کے مرکز میں ہوئی، اس میں حضرت نے قومیت عربیہ پر سخت تنقید کی اور عربوں کا کھل کر احتساب کیا۔ عربوں نے اس کا صرف اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ بڑے تشکر وتاثر کے ساتھ اس کو قبول کیا، اس میں ایک طرف عربوں کی حقیقت پسندی فراخ دلی کو دخل تھا تو دوسری طرف حضرت کے اخلاص، دردوفکر اور جوش دروں کا اثر تھا۔

حضرت تحریر فرماتے ہیں:

> ''تقریر ختم ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ محبت کا دریا امنڈ آیا، کم کسی مجمع نے اپنی محبت کا اس طرح والہانہ اظہار کیا ہوگا۔ یہ عربوں کی فراخ دلی اور عالی ظرفی کا ثبوت ہے جس کی مثال (ایسی سخت تنقید کے موقع پر) کسی اور قوم اور ملک میں ملنا مشکل ہے۔''(۱)

حلب ہی سے حضرتؒ نے ترکی کا سفر کیا، وہاں پہنچ کر جو آزمائش پیش آئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے جس طرح آسانی پیدا فرمائی حضرتؒ نے اپنے سفرنامہ ترکی میں تفصیل سے اس کو بیان فرمایا ہے، کاروان زندگی سے اس کا اختصار، یہاں پر پیش کیا

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۳۲

www.abulhasanalinadwi.org

جا رہا ہے۔

حلب سے حیدر پاشا تک (جو ترکی حدود کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے) Tarus Express سے سفر ہوا، ترکی کے اس دو ہفتے کے سفر میں ہم نے استنبول (قسطنطنیہ) انگورہ، قونیہ (مولانا محمد روم کا مسکن و مدفن) کی زیارت کی۔ قسطنطنیہ میں ہنڈی کے پھاڑے جانے، جن دوستوں کے یہاں ٹھہرنا تھا اوران سے مدد ملنے کی امید تھی، ان کے اسٹیشن پر نہ پہنچنے اور پریشانی وسرگردانی کا وہ تاریخی واقعہ پیش آیا جس سے زیادہ پریشان کن واقعہ اب تک زندگی میں پیش نہیں آیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ کی جس طرح مدد ہوئی اور جس محبت، ضیافت، گرم جوشی اور جذبے کا اس سفر میں عملی تجربہ ہوا اس کا بھی مشاہدہ کیا، ترکی کی سرزمین رنگ و بو بھی دیکھی جو خون شہداء سے بارہا لالہ زار بنی اور صدیوں تک عالم اسلام کی آبرو، یورپ کے صلیبی ملک میں اسلامی میخ، حرمین کی پاسبان، مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ کے لئے حصار بنی رہی۔ ''شکوہ ترکمانی'' کا بھی نظارہ کیا اور اس غیور ملت کے شاہینوں اور شہبازوں کو بھی دیکھا، پھر اتاترک کے اسلامی وعربی اثرات کے یکسر مٹا دینے کی باعزم و پرنظم کوششوں کے نتائج بھی دیکھے، رسم الخط کے بدل جانے سے اسلامی ثقافت سے دوری اور اسلامی کتب خانہ سے محرومی کا منظر بھی دیکھا، اس سفر کی مفصل روئداد اور مسلسل روزنامچہ میری کتاب ''دو ہفتے ترکی میں'' آچکا ہے۔ اس لئے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔(۱)

شام کے قیام کے آخری دن

ترکی سے دوبارہ دمشق واپسی ہوگئی، اس کے دوسرے ہی دن مؤتمر اسلامی کا انعقاد ہوا، ڈاکٹر سعید رمضان اس کے داعی ومحرک تھے، اور حکومت کی تائید بھی اس کو

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۳۲-۴۳۳

حاصل تھی۔ پاکستان سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا مودودی صاحب اور مولانا ظفر احمد صاحب انصاری بھی شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ انڈونیشیا کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر ناصر صاحب بحیثیت صدر اور حضرتؒ اور مولانا مودودی کا بحیثیت نائب صدر انتخاب ہوا۔ ''**ارتباط قضية فلسطين بالوعي الاسلامي**'' (مسئلہ فلسطین کا مسلمانوں کے اسلامی شعور سے تعلق) کے عنوان سے حضرت نے مقالہ پیش فرمایا، جو بڑی عجلت میں قلم برداشتہ لکھا گیا تھا لیکن وہ اپنی اثر انگیزی اور موضوع پر سیر حاصل بحث کے اعتبار سے ایک امتیاز رکھتا ہے۔

آخر میں شام کے اسپیکر ڈاکٹر ناظم القدسی کی طرف سے اور اخیر میں صدر جمہوریہ شکری القوتلی کی طرف سے ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔

دمشق کے یہ تین مہینے بڑی فرحت وانبساط کے ساتھ گذرے۔ حضرت کے بقول

> ''وہ زندگی کے خوشگوار ترین ایام تھے، جو ابھی تک (حرمین شریفین کو مستثنیٰ کرکے) کہیں میسر نہیں آئے، قلبی فرحت وانبساط، جسمانی صحت، موسم کی خوشگواری، دوستوں کی محبت وگرم جوشی، ملک کا قدرتی حسن اور ایک خاص طرح کی روحانیت (جو غالباً صحابہ کرامؓ اور اولیاء عظامؒ کے مدفن اور اسلامی جہاد وفتوحات کا مرکز ہونے کی وجہ سے) تھی سب کے امتزاج نے لطف ومسرت کی ایک عجیب فضا پیدا کردی تھی۔'' (۱)

اسی سفر میں حضرتؒ کو جو کھانسی کی قدیم شکایت تھی اور بڑی تدبیروں کے بعد بھی اس سے چھٹکارا نہیں مل سکا تھا، اس قیام میں ایسی غائب ہوئی کہ حضرتؒ کو کئی روز کے بعد اس کا خیال آیا۔

اس سفر کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ دمشق کی موقر ترین علمی اکیڈمی ''**المجمع العلمی**'' نے حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنیؒ کی محققانہ

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۳۵

www.abulhasanalinadwi.org

تصنیف "عوارف المعارف فی أنواع العلوم و المعارف" کی طباعت منظور کی اور پھر ۱۹۵۸ء میں اس کو "الثقافة الاسلامية فى الهند" کے نام سے شائع کیا۔

بغداد میں

شام سے واپسی میں حضرتؒ نے بغداد و کراچی کا راستہ اختیار فرمایا۔ بغداد میں تین دن ٹھہرنا ہوا، یہاں حضرت سلمان فارسیؓ، امام موسیٰ کاظمؒ، امام ابوحنیفہؒ، حضرت معروف کرخیؒ کی قبور پر حاضری ہوئی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے سلسلہ کی نسبت اور کچھ نسبی تعلق کی وجہ سے خصوصی انجذاب محسوس ہوا، اور عقیدت و محبت کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی کہ اس سے سفر کا گرد و غبار چھٹ گیا۔

بغداد میں حضرت نے اپنے استاد شیخ تقی الدین ہلالیؒ سے بھی ملاقات کی اور وہ بڑی شفقت و محبت سے پیش آئے۔ اخوانیوں نے یہاں حضرت کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک جلسہ کا نظم کیا جس میں حضرت نے "أزمة إيمان و اخلاق" کے عنوان سے تقریر فرمائی۔

بغداد سے کراچی ہوتے ہوئے ہندوستان واپسی ہوئی، کراچی میں بھی تین روز قیام فرمایا اور اپنے مشفق استاد شیخ خلیل عربؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ تحریر فرماتے ہیں :

"اپنے علمی مربی اور استاد خلیل عرب صاحب کی زیارت و ملاقات سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا، جو تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہو گئے تھے، یقین ہے کہ انکو اپنے اس نا اہل شاگرد کی (جس سے وہ اولاد کی طرح محبت کرتے تھے) اس عزت افزائی سے خوشی ہوئی ہوگی اور انھوں نے اس کو اپنی تعلیم اور خلوص کا فیض سمجھا ہوگا، جو اسکی جامعہ دمشق کی دعوت سے ہوئی۔" (۱)

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۴۰

اسی قیام میں ایک دن سفیر شام استاد جواد المرابط نے حضرتؒ کے اعزاز میں سفارت خانہ میں دعوت کی جس میں علامہ محمد بشیر الابراہیمی جو کراچی آئے ہوئے تھے، اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے شرکت کی اور اسی قیام میں ماہر القادریؒ سے پہلی ملاقات ہوئی وہ اس کے بعد سید خلیل صاحب نہٹوری کے مکان پر جہاں حضرت مقیم تھے برابر ملنے آتے رہے۔

بخاری شریف کا درس

دمشق سے واپسی پر حضرتؒ نے دار العلوم میں بعض اسباق پڑھانے شروع کئے، کچھ ہی عرصہ پہلے دار العلوم کے شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ کی وفات ہوگئی تھی، حضرتؒ نے اس زمانہ میں بخاری شریف کا درس اپنے ذمہ فرمالیا، دار العلوم کے سابق شیخ الحدیث مولانا ناصر علی صاحب ندویؒ نے اسی زمانہ میں حضرت سے بخاری شریف پڑھی ہے۔ دوران تدریس حضرت کو نظر کی کمزوری کا شدت کے ساتھ احساس ہوا، اسکی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ معائنہ کرانے پر معلوم ہوا کہ موتیا بند (Kataract) کی شکایت پیدا ہوگئی ہے، پورے طور پر تیار نہ ہونے کی وجہ سے آپریشن کرانے سے گریز فرمایا، لیکن اسی وقت سے براہ راست لکھنے کے بجائے املا (Dictation) کا سلسلہ شروع فرمایا، جو اخیر تک جاری رہا۔

"القادياني و القاديانية" کی تالیف

دسمبر ۱۹۵۷ء کے اواخر یا جنوری ۱۹۵۸ء کے آغاز میں حضرتؒ نے "برار" کا ایک دعوتی و تبلیغی دورہ فرمایا، وہاں تبلیغی اجتماعات کے ساتھ پیام انسانیت کے بھی متعدد کامیاب جلسے ہوئے، اسی زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام مجلس مذاکرات اسلامی (اسلامی کلوکیم) منعقد ہوئے، حضرتؒ کو اس کی دعوت دی گئی، لیکن "برار" کے دورہ کی وجہ سے شرکت نہ ہوسکی۔ اسی کلوکیم میں عرب مہمانوں نے پاکستانی

www.abulhasanalinadwi.org

علماء سے قادیانیت کے موضوع پر عربی کتاب کا مطالبہ کیا مگر باقاعدہ کسی عربی کتاب کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسکو پیش کرنے سے قاصر رہے، حضرت رائپوریؒ کو اس کا علم ہوا، تو فرمانے لگے "علی میاں آئیں گے تو میں ان سے اصرار کے ساتھ کتاب لکھواؤں گا" حضرت جب ان سفروں سے فارغ ہوکر حاضر ہوئے تو حضرتؒ کو اس موضوع پر لکھنے کا حکم ہوا۔ حضرت فرماتے ہیں "اس موضوع سے میرا کبھی تعلق نہیں رہا تھا، اسلئے معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے سر پر پہاڑ رکھ دیا ہو۔" حضرتؒ نے فرمایا کہ

"میں خاکہ بنائے دیتا ہوں تصنیف مولانا محمد یوسف صاحب بنوری فرمادیں گے وہ صاحب نظر عالم ہیں، ان کو عربی پر پوری قدرت ہے اور موضوع سے مناسبت بھی لیکن یہ شاید حضرت کی توجہ قلبی کا نتیجہ تھا کہ میرا ذہن خود بدل گیا اور میں نے اس کام کی ذمہ داری لے لی۔ ایک مہینہ صوفی عبدالحمید صاحب کی کوٹھی میں جہاں حضرت کا قیام تھا، اس علمی و تصنیفی اعتکاف میں اس طرح گذرا کہ گویا دنیا کی خبر نہ تھی۔ مرزا صاحب کی تمام کتابیں پڑھیں، نوٹس لئے، تقریباً ۲۳-۲۴ دن میں کتاب تیار ہوگئی۔ حضرت روز کا روز سنتے اور مسرور ہوتے"۔(۱)

اگلے سال حاضری ہوئی تو اردو میں ترجمہ کی ہدایت فرمائی۔ اس طرح تھوڑی مدت میں اس کا اردو ترجمہ بھی ہوگیا۔ اللہ نے اس کو بڑی مقبولیت عطا فرمائی، اور اردو، عربی، انگریزی اور اس کے علاوہ متعدد زبانوں میں اس کے دسیوں ایڈیشن نکلے۔

کتاب شائع ہوئی تو حضرتؒ نے اس وقت قادیانیوں کے پیشوا مرزا طاہر کو کتاب یہ کلمات لکھ کر بھیجی "بجواب تحفۃ الندوۃ تاخیر کی معذرت کے ساتھ" یہ ملحوظ رہے کہ یہ اشارہ غلام احمد قادیانی کی اس کتاب کی طرف ہے جو اس نے ندوہ اور اہل ندوہ کے رد میں لکھی تھی، اور اس کا نام "تحفۃ الندوۃ" رکھا تھا۔

یہاں یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے جو حضرتؒ نے مجلس میں بارہا سنایا کہ "ہم حضرتؒ

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۴۸، معمولی حذف واضافہ کے ساتھ

www.abulhasanalinadwi.org

کو کتاب سنا رہے تھے، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تشریف فرما تھے۔ ہم نے جب کئی بار کہا کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں تو وہ ناراض ہو گئے تو میں نے ان کے کان میں کہا کہ یہ کتاب آپ کے لئے نہیں لکھی گئی ہے"۔

سفر پاکستان سے واپسی پر حیدرآباد میں ہونے والے عظیم الشان سالانہ جلسۂ سیرت میں شرکت اور خطاب کا دعوت نامہ موصول ہوا، جو مجلس کے سکریٹری جناب ایچ ایم حسین صاحب کی جانب سے تھا، انھوں نے مولانا محمد علی صاحب (صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی) کے مشورہ سے یہ دعوت نامہ بھیجا تھا۔ حضرتؒ نے دعوت قبول فرمالی۔ حیدرآباد میں متعدد مفید پروگرام ہوئے۔ سکندرآباد کی جامع مسجد میں عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا اور حضرت نے اس میں بڑی موثر تقریر فرمائی، تقریر فرما کر ایک پروگرام میں شرکت کے لئے نظام آباد تشریف لے گئے۔ واپسی پر اچانک معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی صاحب کا انتقال ہو گیا، سکندرآباد کی جامع مسجد میں نماز جنازہ ہے، حضرت تشریف لے گئے تو مولانا کے خسر نواب حکیم مقصود جنگ صاحب نے حضرتؒ ہی سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی۔ حضرت کے بقول ایسا معلوم ہوا کہ "گویا قدرت نے اسی کا سامان کیا تھا۔"

اسی قیام میں ایک روز پرنس مکرم جاہ بہادر (نبیرۂ میر عثمان علی خاں) نے دعوت کی اور وہیں پروفیسر الیاس برنی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔

"مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کا قیام

۵۹-۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر سعید رمضان جو رسالہ "المسلمون" کو دمشق سے نکال رہے تھے، ڈاکٹریٹ کرنے جرمنی چلے گئے، حضرت کئی مہینہ تک ان کی خواہش پر المسلمون کا اداریہ لکھتے رہے۔ اس سلسلہ میں پہلا مضمون "ردة جديدة" کے عنوان سے اور اس کی دوسری قسط "دعوة جديدة" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ بعد میں یہ مضمون رسالہ کی شکل میں "ردة و لا أبا بكر لها" کے عنوان سے بار بار شائع ہوا

www.abulhasanalinadwi.org

اور جگہ جگہ تقسیم کیا گیا۔اسی وقت حضرت کو شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اعتقادی و تہذیبی ارتداداور فکری و اخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مستقل مجلس یا اکیڈمی قائم ہونی چاہئے۔مئی ۱۹۵۹ء میں ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' کے نام سے اسکی تاسیس عمل میں آئی اور حضرت ہی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔

الحمد للہ اس نے اس عرصہ میں بڑی دینی وعلمی خدمت انجام دی، اور دنیا کے مختلف حصوں میں اس کی مطبوعہ کتابیں نہ صرف یہ کہ پہونچیں بلکہ اثر انداز ہوئیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں حضرتؒ کا موقف اور اسکے تحفظ کی فکر و کوشش

اندرون ملک یا بیرون ملک کوئی بھی ملی مسئلہ سامنے آتا اور امت اسلامیہ پر کسی قسم کی ضرب لگتی، یا کسی ملی ادارے یا دانش گاہ کا تحفظ خطرہ میں پڑتا تو حضرتؒ کے حساس دل پر اسکی چوٹ لگتی، اور حضرت اپنی متوازن فکر اور معتدل طریقۂ عمل کے ذریعہ اس کو حل کرنے کی پوری کوشش فرماتے۔اسی کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسیوں، خیالات و رجحانات سے کلی طور پر اتفاق نہ ہونے کے باوجود حضرتؒ نے اس کو مسلمانوں کا بیش قیمت ملی اثاثہ سمجھا اور جب بھی اس کا اقلیتی کردار متاثر ہوا اور وہ بنیادی مقاصد جس کے لئے وہ قائم کی گئی تھی خطرہ میں پڑے تو حضرتؒ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، مختلف ادوار میں وہاں کے ذمہ داروں کو مشورے دیئے، خاص طور پر بدرالدین طیب جی کے دور میں حضرتؒ نے ان کو ایک مفصل خط تحریر فرمایا جس کا انھوں نے اثر قبول کیا، اس تحریک کے ساتھ اخیر تک حضرتؒ کا یہ تعاون جاری رہا اور حضرتؒ نے اس کو ایک ملی خدمت اور وقت کا تقاضا سمجھ کر انجام دیا۔پروفیسر نفیس صاحب نے اس واقعہ کو تفصیل سے اپنے مضمون میں تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

www.abulhasanalinadwi.org

''مولانا علی میاں صاحب کو ایک سیمینار میں جو شعبۂ دینیات کی طرف سے منعقد ہوا تھا مدعو کیا گیا، اسی دعوت پر مولانا تشریف لائے، اور ۱۹ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو یونین ہال میں اپنا مقالہ بعنوان ''نبوت کا کارنامہ'' پڑھا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین نے مولانا کو یونین کا لائف ممبر بھی بنایا، اسی موقع پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اور مولانا کے درمیان یونیورسٹی کے حالات پر تفصیلی مذاکرہ ہوا، مولانا یہاں کے حالات سے بے چین ہو اٹھے، یہ کرنل حسین زیدی صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا، زیدی صاحب کے بعد بدرالدین طیب جی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، باوجودیکہ یہ شہرت عام تھی کہ بدرالدین طیب جی جواہر لال نہرو کے بہت ہی قریب ترین شخص ہیں اور یہ بھی کہ حکومت خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لفظ ''مسلم'' نکال کر اس کو ایک قومی یونیورسٹی کا درجہ دینا چاہتی ہے، تاہم مولانا علی میاں صاحب کو شدید فکر تھی کہ آنے والے وائس چانسلر سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات کے سلسلہ میں گفتگو کی جائے، خدا کی مرضی کچھ ایسی ہوئی کہ طیب جی کو خود مولانا علی میاں صاحب سے گفتگو کرنے کی ضرورت پیش آ گئی، حالانکہ طیب جی اس وقت تک مولانا علی میاں صاحب سے بالکل واقف نہیں تھے، واقعہ یہ ہوا کہ مولانا نے مصر کے کرنل ناصر کے ذریعہ پھیلائے گئے فتنۂ عرب قومیت کے خلاف قلمی جہاد شروع کر رکھا تھا اور ان کی تحریروں سے نہ صرف ان کا طلسم ٹوٹ کر بکھر رہا تھا بلکہ ان کے خلاف پورے مصر اور عرب ممالک میں ایک فضا بن رہی تھی، کرنل ناصر نے نہرو جی سے اپنی دوستی کے ناطے چاہا کہ وہ مولانا علی میاں صاحبؒ کو اس کام سے روکیں اور اس سلسلہ میں کوئی ایسی تحریر ان سے جاری کروا دیں جس سے کرنل ناصر کے نیچے سے کھسکتی ہوئی زمین پر قابو حاصل ہو سکے، جواہر لال نہرو، طیب جی کے ذریعہ مولانا علی میاںؒ سے یہ کام لینا چاہتے تھے، دہلی میں حضرت مولانا

www.abulhasanalinadwi.org

اور طیب جی کی گفتگو ہوئی، پہلے تو طیب جی نے اپنا مدعا بیان کیا اور اس مسئلہ کو قومی مفاد اور نیشنلزم سے تعبیر کیا، مولانا نے صفائی سے فرمایا کہ نیشنلزم محض یہ نہیں ہے کہ جو نہرو جی کہیں اس کی تائید کی جائے بلکہ صحیح نیشنلزم یہ ہے کہ اگر کوئی فیصلہ نہرو جی غلط لے رہے ہیں اس کی نشاندہی کی جائے، بلکہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو اس غلط کام سے روک لیا جائے، میں اس مسئلہ میں نہرو جی کی مدد سے معذرت خواہ ہوں، طیب جی مولانا کی اس گفتگو سے نہ صرف یہ کہ ناراض نہیں ہوئے بلکہ بہت زیادہ متاثر ہوئے کیونکہ یہ بات ان کی سوچ سے بالاتر تھی کہ کوئی مولوی بھی نہرو جی کی مرضی کو اپنے اصول کے واسطے اس طرح رد کرسکتا ہے، اسکے بعد مولانا نے یونیورسٹی کے سلسلہ میں گفتگو کی اور ایک یادداشت بھی ان کے حوالہ کی جس میں اس یونیورسٹی کی اہمیت، ان کے عہدہ کی ذمہ داریوں اور نزاکتوں کو مفصل طور پر بیان کیا، طیب جی کے تأثر کا عالم یہ تھا کہ اسکے بعد جب انہوں نے چارج لیا اور ۱۷/اکتوبر کو سرسید ڈے کے موقع پر اسٹریچی ہال میں اپنی پہلی تقریر کی تو جن لوگوں نے اس تقریر کو سنا ہے اور وہ مولانا کی دی ہوئی یادداشت سے واقف تھے وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ طیب جی کی تقریر من وعن انہیں نکات پر مبنی تھی جو نکات مولانا نے لکھ کر ان کو دئے تھے، طیب جی کے آتے ہی یونیورسٹی سے کمیونزم کی آئیڈیالوجی کمزور ہونا شروع ہوگئی اور شہر کے برادرانِ وطن کی ریشہ دوانیاں بھی کمزور ہونے لگیں، اس وقت کے قائدین کی عام روش کے خلاف طیب جی نے مسلمانوں کے مسائل برملا اٹھائے، اور اپنی تقریر میں انہوں نے ایسا طرز اختیار کیا کہ نوجوان طلباء علی گڑھ میں آزادی کے بعد سے پنپ رہی پژمردگی ختم ہوکر ایک قومی جذبہ اور نیا ولولہ پیدا ہوا، طیب جی کے ڈھائی سال کے قیام میں میں نے ان کی ایک بھی تقریر ایسی نہیں سنی جس میں انہوں نے قرآن کا حوالہ نہ دیا ہو، پوری یونیورسٹی میں ایک انقلابی

www.abulhasanalinadwi.org

کیفیت نظر آتی تھی، اس تبدیلی کے پیچھے ایک خاموش شخصیت کارفرما تھی، جس سے شاید چند افراد کے علاوہ کوئی واقف نہیں ہے، اور وہ شخصیت مولانا علی میاںؒ صاحب کی تھی۔''(۱)

برما کا سفر

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مالی حالت کمزور چل رہی تھی، تقسیم ملک کے بعد دشواریاں اور بڑھ گئیں اور یہ ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی کہ بیرون ملک بھی لوگوں کو اسکی اعانت کی طرف متوجہ کیا جائے۔ حسن اتفاق کہ رنگون کے بعض اہل تعلق نے حضرتؒ کو برما آنے کی دعوت دی تاکہ وہاں دینی حلقوں میں نئی حرکت اور بیداری پیدا ہو اور وہاں کے متمول طبقہ کو دارالعلوم کی طرف متوجہ کیا جاسکے۔ حضرتؒ نے مذکورہ صورت حال کے پیش نظر دعوت قبول فرمالی اور ۱۸/دسمبر ۱۹۶۰ء کو مولانا معین اللہ صاحبؒ کی رفاقت میں رنگون کا سفر کیا۔ رنگون میں حضرتؒ کا عدیم المثال استقبال ہوا، مختلف علاقوں میں بیسیوں تقریریں ہوئیں، حضرتؒ نے اپنی ایمانی فراست سے بھانپ لیا کہ آج وہاں جو خوش حالی اور فارغ البالی ہے اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ تقریروں میں صاف صاف کہا کہ ''اسکو باقی رکھنے کی شکل یہ ہے فکر کے ساتھ زندگی گذاری جائے، برمی زبان میں مہارت پیدا کی جائے اور غیروں میں تبلیغ اسلام کا کام انجام دیا جائے اور ملت ابراہیمی سے رشتہ جوڑا جائے ورنہ یہ ساری خوش حالی جو آج نظر آرہی ہے، کل اسکا دور دور پتہ نہ ہوگا اور اس پر جھاڑو پھر جائیگی''۔ اللہ کی شان کہ حضرتؒ کی واپسی کے کچھ ہی عرصہ کے بعد وہاں انقلاب آیا اور وہ سب سامنے آ گیا جسکا خطرہ ظاہر کیا گیا تھا۔

اس سفر سے دارالعلوم کا مالی فائدہ تو کم ہوا کہ اس انقلاب کی وجہ سے رقوم منتقل نہیں کی جاسکیں لیکن برما کا دینی فائدہ بہت ہوا، لوگوں کے اندر دینی جذبہ پیدا ہوا، اور اسکے اثرات انقلاب کے بعد بھی محسوس کئے جاتے رہے۔

(۱) افکار و آثار ص ۳۵۳-۳۴۵

''دینی تعلیمی کونسل'' کا قیام

حضرتؒ کے اسی ملی درد کا نتیجہ تھا کہ جب تقسیم ملک کے بعد یہاں مسلمانوں کی بنیادی تعلیم، ان کے عقائد، ایمانیات اور ان کے تشخص و امتیاز کا باقی رہنا مشکل ہو گیا تو حضرت نے باضابطہ صوبائی سطح پر یہ تحریک چلائی کہ اپنے آزاد مدارس و مکاتب قائم کیے جائیں جن میں بنیادی تعلیم کا انتظام ہو۔ مولانا نعمانیؒ کی رفاقت اور قاضی عدیل عباسی اور ظفر احمد صدیقی کی معاونت سے باضابطہ اس تحریک کی بنیاد پڑی اور اس کا پہلا اجلاس قاضی صاحب کی دعوت پر بستی میں ۳۰/۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو منعقد ہوا، اجلاس کی صدارت کے لئے حضرتؒ ہی کا انتخاب ہوا۔ پھر دینی تعلیمی کونسل کے نام سے تنظیم قائم ہوئی تو اسکی صدارت بھی حضرتؒ کے سپرد کی گئی۔ کونسل کی سرکردگی میں صوبائی سطح پر ہزاروں مکاتب قائم ہوئے، جن میں مجموعی طلباء کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کرگئی۔ بلاشبہ یہ اتنا بنیادی اور ٹھوس اقدام تھا جس کے بڑے دوررس نتائج سامنے آئے۔

۵/فروری ۱۹۶۱ء میں کالی کٹ کی ایک فعال تنظیم ندوۃ المجاہدین کا سالانہ اجلاس ہوا، تنظیم کے ذمہ داروں اور بعض اہل تعلق کی سفارش پر حضرت نے اسکی صدارت قبول فرمائی اور ''ملة ابراهيم و حضارة الاسلام'' کے عنوان سے مقالہ پیش فرمایا، جسکا اردو ترجمہ ''اسلام مکمل دین مستقل تہذیب'' کے نام سے شائع ہوا۔

برادرِ معظم مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی وفات

ڈاکٹر صاحبؒ حضرتؒ کے لئے صرف ایک بڑے بھائی ہی نہیں بلکہ والد کے قائم مقام اور سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے، انہیں کے زیر سایہ حضرتؒ کی پرورش ہوئی اور ان کے حکیمانہ انداز تربیت نے حضرتؒ پر گہرے نقوش چھوڑے تھے، ان کی وفات پر حضرتؒ کے تاثرات خود حضرت کے الفاظ میں خود نوشت سوانح حیات کاروان زندگی سے نقل کیے جاتے ہیں :

www.abulhasanalinadwi.org

''۷؍مئی ۱۹۶۱ء کو بھائی صاحب کی وفات کا وہ حادثہ پیش آیا جو میری شعوری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا اور میں نے یتیمی کی وہ کیفیت محسوس کی جو کمسنی کی وجہ سے والد صاحب کی وفات پر نہیں محسوس کی تھی۔ اس حادثہ کی المنا کی کو اس بات نے اور بڑھا دیا کہ رائے پور اور سہارن پور کے سفر کی وجہ سے میں نہ وفات کے وقت موجود تھا نہ جنازہ اور تدفین میں شریک ہو سکا۔ اسی دن سہارنپور میں شدید اور نازک علالت کا تار ملا اور میں پہلی گاڑی سے شام کو (دہرہ ایکسپریس سے) لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گیا، یہ سفر جس طرح طے ہوا اور راستہ جس حال میں گذرا، خدا اس طرح کا دن پھر نہ لائے۔ ہونے والے واقعہ کا دھڑ کا لگ گیا تھا، میں ڈر رہا تھا کہ راستہ میں خود میرے ساتھ کوئی واقعہ نہ پیش آئے۔ لکھنؤ پہنچا تو عزیزی مولوی معین اللہ صاحب اور چند احباب پلیٹ فارم پر موجود تھے، جنھوں نے واقعہ کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ یہ کہا کہ آپکو رائے بریلی چلنا ہے۔ میں سب سمجھ گیا۔ باہر سید صدیق حسن صاحب (آئی سی ایس) کی موٹر کھڑی تھی۔ میں رائے بریلی پہنچا تو یہاں سب کچھ ہو چکا تھا۔ تدفین کو دو ہی تین گھنٹے ہوئے تھے، ابھی تک جس گریہ کو ضبط کئے ہوئے تھا عزیزی محمد میاں کو دیکھ کر وہ امنڈ پڑا۔ اسی طرح کا واقعہ (سفر اور غیبت میں والد و سرپرست کی وفات و تدفین) بھائی صاحب کے ساتھ والد صاحبؒ کے معاملہ میں اور میرے دادا مولوی حکیم سید فخر الدین صاحبؒ کا اپنے والد مولانا سید عبد العلی صاحبؒ کے معاملہ میں پیش آ چکا تھا۔''(۱)

نظامت کے لئے انتخاب اور کویت کا ایک سفر

ڈاکٹر صاحبؒ کی وفات کے بعد ندوہ کی نظامت کے لئے بالاتفاق حضرتؒ کا انتخاب ہوا، اور ۱۸؍جون ۱۹۶۱ء کے جلسہ انتظامیہ میں یہ تجویز پاس کر دی گئی۔ دار العلوم کی مالی حالت عرصہ دراز سے کمزور چلی آ رہی تھی، برما کے سفر سے بھی رقوم

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۶۵-۴۶۶

www.abulhasanalinadwi.org

منتقل نہ ہونے کی وجہ خاطر خواہ فائدہ نہ ہوسکا تھا۔ کویت میں بعض اہل تعلق حضرتؒ کو سفر کی دعوت دے رہے تھے کہ وہاں اس سلسلہ میں خاطر خواہ تعاون ہوسکے گا۔ حضرت کا خالص دعوتی ذہن اس کو پوری طرح قبول کرنے کو تیار نہیں تھا مگر اس شرط پر کہ حضرتؒ کو خود کچھ نہیں کرنا ہوگا، اس نیت سے سفر کا ارادہ فرمالیا کہ وہاں کے لوگوں کے سامنے بھی دعوت کی صدا بلند کرنے کا موقع ہاتھ آئیگا۔

۲۴/جنوری ۱۹۶۲ء کو مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ، مولانا محمد رابع حسنی صاحب کی معیت میں یہ سفر ہوا۔ حضرتؒ کے اصل داعی ڈاکٹر عبداللطیف صاحب اپنے بعض عرب اہل تعلق کے ساتھ مطار پر موجود تھے۔ قیام ایک ہوٹل میں رہا۔ کھانے کا انتظام ڈاکٹر صاحب کے یہاں سے ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ وہاں کے ایک ممتاز عالم تاجر عبدالرزاق الصالح اور پرجوش داعی و فاضل شیخ عبدالرحمٰن الدوسری نے بڑی عقیدت ومحبت کا معاملہ کیا، اور تعاون میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

کویت کے قیام میں حضرت کی متعدد تقریریں ہوئیں، جن میں ایک ممتاز تقریر وہاں کی ایک بڑی مسجد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے ہوئی۔ ایمان ویقین کی قوت، حکمت وموعظت پھر زور خطابت کا اثر تھا کہ پورا مجمع مسحور تھا، لوگ بے اختیار ہوکر نعرہ لگاتے۔ دوران تقریر ایک صاحب شدت تأثر میں بے ہوش ہوگئے اور ان کو اٹھا کر لے جایا گیا۔ اس طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے وعظ کی یاد تازہ ہوگئی جن کی مجلس وعظ میں یہ واقعات بار بار پیش آتے تھے۔

ایک دن کویت ریڈیو سے بھی "إسمعي يا زهرة الصحراء" کے عنوان سے تقریر نشر ہوئی جس میں کویت کو اسکا مقام یاد دلایا گیا اور پھر اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا۔

حاکم کویت کے نام بھی حضرتؒ نے ایک یادداشت کے طور پر مکتوب تحریر فرمایا جس میں عربوں کی ترقی، وحدت وقیادت اور ان کی مشکلات کا حل بتایا اور آخر میں اس ملک میں غیر مسلم عبادت گاہوں کی تعمیر کے خطرہ سے آگاہ فرمایا جو کویت اور خلیج کی

www.abulhasanalinadwi.org

ریاستوں میں بننا شروع ہوگئی تھیں۔

تین ہفتہ کویت میں قیام کرکے رمضان کے دوسرے عشرہ میں یہ سفر تمام ہوا، اس سفر میں بھی حضرتؒ کا جو اعزاز و اکرام ہوا، حضرتؒ نے اپنے مزاج و مذاق کے مطابق جو حضرت کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اس کو حضرت رائپوریؒ کی طرف منسوب کیا، اور واپسی پر حضرت رائپوریؒ کو ایک مکتوب تحریر فرمایا جس میں اس کا اظہار کیا گیا تھا، اخیر میں یہ شعر بھی تحریر فرمایا جس سے حضرت کی تواضع وانکسار اور انکارِ ذات کی عکاسی ہوتی ہے ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا تھی

www.abulhasanalinadwi.org

دسواں باب

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا قیام، والدہ صاحبہ کی وفات، دینی تعلیمی کونسل اور پرسنل لابورڈ کی تاسیس، ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۵ء تک اہم اسفار، واقعات اور حوادث

جامعہ اسلامیہ ورابطہ عالم اسلامی کا قیام اور حضرت کا بحیثیت رکن تاسیسی کے انتخاب

۱۹۶۲ء کے اوائل میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا قیام عمل میں آیا۔ شاہ سعود نے بذات خود حضرتؒ کو ایک خط تحریر کیا اور ہندوستان میں سعودی سفارت خانہ کو ہدایت کی کہ وہ حضرت کو جامعہ میں تدریسی خدمات کے لئے تیار کرے، حضرت کا یہاں بھی وہی جواب تھا جو دمشق یونیورسٹی کی پیش کش کے موقع پر تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد حضرتؒ کو مجلس استشاری کا رکن اساسی منتخب کیا گیا، حضرتؒ نے اس کو منظور فرمالیا، اوراس کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لئے مئی ۱۹۶۲ء میں حجاز کا سفر کیا۔ اس سفر میں قصر ملکی میں ایک مؤتمر اسلامی منعقد ہوئی، جس میں حضرتؒ کو خصوصی طور سے مدعو کیا گیا، اور عالم اسلام کے اہم ترین لوگ شریک ہوئے۔ وہیں **رابطة العالم الاسلامی** کے نام سے ایک عالمی تنظیم کا قیام عمل میں آیا اور حضرتؒ کو اس کا

www.abulhasanalinadwi.org

رکن تاسیسی منتخب کیا گیا، اس کے اجلاس میں اس کے مستقل صدر شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ اگر کسی ضرورت سے اٹھ کر جاتے تو حضرت کو ہی صدر منتخب کیا جاتا۔ حضرت نے اس کے پہلے اجلاس میں ''الاخوۃ الاسلامیة فوق العصبیات'' کے عنوان سے ایک موثر مقالہ پڑھا۔

حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں جامعہ کی مجلس استشاری میں شرکت فرمائی اور اس میں ''خطوط عریضة لجامعة للدعوة والارشاد'' کے عنوان سے محاضرہ پیش فرمایا۔ اس مرتبہ مدینہ منورہ میں الحاج محمد نور نورولی صاحب کے اصرار وخواہش پر ''بستان نورولی'' میں قیام فرمایا، پھر یہ مستقل معمول بن گیا، حضرتؒ کو مدینہ منورہ میں کسی ہوٹل میں قیام کرنا گوارہ نہیں ہوتا تھا۔

اسی سفر میں حضرتؒ نے ایک حفلۂ تکریم (جس کا انعقاد مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحبؒ نے کیا تھا اور جس میں بڑے اہم لوگ شریک ہوئے تھے) میں کھل کر قومیت عربیہ پر تنقید کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عرب نوجوان ایک حرف بھی صدر ناصر کے خلاف سننا گوارہ نہیں کرتے تھے لیکن چونکہ بات دل سے کہی گئی تھی اور اس میں پوری جرأت ایمانی اور قوت وصداقت تھی اسلئے وہ اثر انداز ہوئی اور شیخ محمد محمود صواف نے جو شریک محفل تھے اس کا اعتراف کیا۔

سعودی ریڈیو کی فرمائش پر حضرت نے ''وفود الامة بين يدى نبيها'' کے عنوان سے ایک ولولہ انگیز، ایمان افروز تقریر تیار کی اور وہ کئی مرتبہ سعودی ریڈیو سے اور اس کا اردو ترجمہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔

حضرتؒ کا یہ سفر ایک طویل عرصہ کے بعد ہوا تھا، اس کے بعد ہر سال سفر کی سعادت حاصل ہوتی رہی اور اکثر کئی کئی مرتبہ اس کی نوبت آئی۔

جامعہ اسلامیہ میں محاضرات کا سلسلہ

اگلے ہی سال ۱۹۶۳ء میں جامعہ کی طرف سے حضرتؒ کو محاضرات کے لئے مدعو

www.abulhasanalinadwi.org

کیا گیا۔ حضرتؒ نے مدینہ منورہ کی مناسبت سے "**النبوۃ و الانبیاء فی ضوء القرآن**" کے موضوع کا انتخاب فرمایا، مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی رفاقت میں یہ سفر ہوا۔ محاضرات میں جامعہ کے اس وقت کے وائس چانسلر شیخ بن باز خود بھی شرکت فرماتے اور محاضرہ کے بعد کلمات تحسین فرماتے۔

اس سفر میں حضرتؒ نے پانچواں حج فرمایا۔ حج ہی کے ایام میں ایک روز حرم شریف میں بیت اللہ کے سامنے حجاج کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ حضرت فرماتے ہیں :

"یہ عجیب منظر تھا جو کبھی نہ بھولے گا کہ حج سے دو تین دن پہلے جبکہ حج کا مجمع اپنے عروج پر اور طواف کا مبارک عمل اپنے اوج پر تھا، تقریر کی سعادت اور بیت اللہ شریف کے دید کی لذت بیک وقت حاصل ہو رہی تھی۔" (۱)

حجاز مقدس میں مغربی تہذیب کے طوفان بلاخیز کو روکنے کی بڑی ضرورت تھی۔ حضرتؒ کو شروع سے اس کا احساس تھا، حضرتؒ نے اس کے لئے ابتدائی سفروں میں بڑی کوششیں فرمائی تھیں اور براہ راست شاہ سعود کو بھی بذریعہ مراسلت متوجہ کیا تھا۔ اس ۱۹۶۳ء کے سفر میں حضرت کو اس لئے اسکی اور زیادہ فکر ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک نیا فتنہ "قومیت عربیہ" کا (جس کو "فتنہ ناصریہ" سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے) تیزی سے ابھر رہا تھا، بالائے ستم یہ ہوا کہ وہاں کے ذمہ داران مملکت نے صدر ناصر اور مصر کے اس فتنہ اور وہاں کے ذرائع ابلاغ سے توجہ ہٹانے کا علاج یہ سمجھا کہ حجاز مقدس میں بھی وہ آزادی دے دی جائے جو مصر میں عریانیت تک پہنچی ہوئی تھی تا کہ کسی کو مصر جانے یا وہاں کے ریڈیو، ٹیلیویژن سے دل بہلانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اس صورت حال نے حضرتؒ کو مضطرب کر دیا اور حضرتؒ نے مدینہ منورہ کے قیام ہی میں ایک روز امیر فیصل سے (جو اس وقت ولی عہد مملکت تھے) خصوصی ملاقات کی، ان کو اس طرف توجہ دلائی اور ان سے صاف صاف بات کی۔ انھوں نے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۷۹

www.abulhasanalinadwi.org

حضرتؒ کواس سلسلہ میں اطمینان دلایا، اوراپنی کوششوں کا ذکر کیا، پھر جب انھوں نے زمامِ سلطنت سنبھالی تو حضرتؒ نے ان کو خطوط کے ذریعہ خطرات سے آگاہ کیا، انھوں نے اس کا جواب بھی دیا۔ اس کے علاوہ بھی بعد میں حضرتؒ نے دومرتبہ اوران سے ملاقات کر کے خدشات ظاہر کئے اور مشورے دیئے جن کو انھوں نے کھلے دل سے سنا اوراپنے موقف کی وضاحت کی۔ پہلی ملاقات میں حضرتؒ کے رفیق مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ اور بعد کی ملاقاتوں میں مولانا محمد واضح رشید ندوی صاحب تھے۔ ان ملاقاتوں میں قصر ملکی کے اندر بھی جانا ہوا اور دنیا کی آرائش وزیبائش کے آخری مظاہر بھی سامنے آئے لیکن حضرتؒ نے کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اور گفتگو کے دوران اشارہ و کنایہ سے بھی کسی ملی ادارے یا دارالعلوم کے لئے جو اس وقت مالی اعتبار سے بڑی آزمائش میں تھا اور حضرت ہی اس کے ذمہ دار تھے، کبھی کچھ نہیں فرمایا۔ حضرت کے اسی زہد و استغناء اور صاف گوئی کا نتیجہ تھا کہ حضرتؒ کی بات کا جو وزن تھا وہ کم کسی عالم یا داعی کا ہوگا۔

دو عظیم حادثے

۱۹۶۲ء اس طور پر حضرت کے لئے عام الحزن ثابت ہوا کہ اس میں چھ مہینہ کے وقفہ سے پہلے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ اور پھر حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوریؒ کی وفات ہوئی۔ حضرت رائپوری کی شدید علالت کی خبر سن کر حضرتؒ لاہور تشریف لے گئے۔ حضرت رائپوری علالت کے باوجود بار بار پوچھتے اور کھانے پینے کا خیال رہتا۔ بعض خدام کا کہنا ہے کہ حضرت رائپوری نے آخری کلام بھی حضرت سے متعلق ہی فرمایا اور خدام سے حضرت کی راحت کا خیال رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ بالآخر ۱۳؍ربیع الاول ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء کو یہ چراغ گل ہوگیا اور حضرتؒ کو ان آخری ایام میں ساتھ رہنے پھر نعش مبارک کے ساتھ وطن جا کر تدفین میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

یورپ کا پہلا سفر

ستمبر ۱۹۶۳ء میں حضرتؒ نے یورپ کا پہلا سفر کیا۔ اس سفر کا اصل محرک جنیوا میں اسلامک سنٹر کے جلسوں میں شرکت اور خطاب تھا۔ ڈاکٹر سعید رمضان حضرت کے قدیم دوست اور محبّ تھے، انھوں نے خاص طور پر حضرت کو اس سفر کی دعوت دی۔

حضرتؒ نے اس سفر میں رفاقت کے لئے جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کا انتخاب فرمایا جو حضرت سے محبانہ ومخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور اپنی طبی تعلیم کے سلسلہ میں یورپ میں طویل قیام کر چکے تھے۔

جنیوا کے علاوہ اس سفر میں حضرت نے یورپ کے مختلف علاقوں کا دورہ فرمایا اور وہاں خطاب کیا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی کے اسلامی مجلس میں تقریر ہوئی۔ لندن یونیورسٹی کے یونین ہال میں خطاب ہوا۔ اس کے علاوہ بی بی سی پر دو تقریریں نشر ہوئیں، ان میں سب سے اہم تقریر لندن یونیورسٹی کے ہال میں ہوئی، جس کا عنوان ”بین الشرق و الغرب“ تھا، اس کا انگریزی ترجمہ بھی اسی وقت ایک انگریز نو مسلم نے بڑے جوش و تاثر کے ساتھ پڑھا۔ اسی سفر میں حضرت مولانا اندلس بھی تشریف لے گئے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> ”اس سفر کا سب سے اہم اور عزیز حصہ اندلس مرحوم (اسپین) کی زیارت تھی۔ کوئی ایسا ملک یاد نہیں کہ جہاں مسلمان رہے ہوں پھر ان کا نام ونشان مٹ گیا ہو اور وہاں جا کر ایسا انس، ایسی محبت، ایسی دلکشی محسوس ہوئی ہو کہ معلوم ہوتا تھا کہ فضائیں لپٹ رہی ہیں اور ذرہ ذرہ انس کا پیغام دے رہا ہے جیسا اسپین میں محسوس ہوا، وہاں نمازوں اور ذکر میں بھی وہ رقت اور لذت محسوس ہوئی جو کم تر مقامات پر محسوس ہوئی تھی۔“ مزید فرماتے ہیں کہ ”اس سفر میں داغ کہن بلکہ زخم دل تازہ ہو گئے“۔(۱)

وہاں اسلامی آثار کی زیارت کے موقع پر گائیڈ تعارف کراتا تھا اور بار بار یہ جملہ

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۸۹

www.abulhasanalinadwi.org

کہتا تھا کہ ''جب ہم نے عربوں کو یہاں سے نکالا''۔ حضرتؒ کی ایمانی حمیت اس کو گوارہ نہ کرسکی اور حضرت نے صاف فرمایا کہ آپ یہ جملہ نہ دہرائیں اس سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے، اس نے معذرت کی۔

مسجد قرطبہ پہنچ کر حضرتؒ کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، خون حیدری جوش مارنے لگا، اسکی محراب میں (جس کے بارے میں گائیڈ نے بتایا تھا کہ اسکی آواز پوری مسجد میں گونجتی ہے) پہونچ کر حضرت کی زبان سے بے ساختہ یہ آیت جاری ہوگئی اور حضرتؒ نے بلند آواز سے اسکی تلاوت فرمائی ''قل جاء الحق و زهق الباطل إن الباطل كان زهوقا'' (کہہ دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل تو مٹنے ہی کے لئے تھا) حضرت نے مسجد میں ممانعت کے باوجود دوگانہ ادا فرمایا اور باہر نکل کر مسجد کے صحن میں اذان و جماعت کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی۔

غرناطہ قیام کے دوران جمعہ کا دن آ گیا، حضرتؒ نے عرب طلبہ کے ایک کمرہ میں سب کو جمع کر کے جمعہ کی نماز ادا فرمائی، صدیوں کے بعد اس سرزمین پر جو کسی زمانہ میں اولیاء اور علماء کی سرزمین تھی پہلا جمعہ پڑھا گیا۔ پھر اللہ نے راستہ کھول دیا اور کسی نہ کسی حد تک وہاں نمازوں کی آزادی ہوگئی اور جمعہ کا سلسلہ قائم ہوگیا۔

اس سفر سے مغربی تہذیب کی جو خامیاں اور بے اعتدالیاں نظریاتی طور پر حضرتؒ کو معلوم تھیں اور عرصہ سے حضرتؒ اس پر تبصرہ وتنقید فرماتے رہے تھے وہ نظروں کے سامنے آ گئیں۔ حضرتؒ نے اپنے اس سفر کے تاثرات اپنے عزیزوں کے نام خطوط میں تحریر فرمائے ہیں جن کا مجموعہ ''مکاتیب یورپ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اسی سفر میں حضرت نے ''الصراع بين الفكرة الاسلامية و الفكرة الغربية'' کا مقدمہ تحریر فرمایا، یہ کتاب حقیقت میں ماذا خسر العالم کی ایک تکمیلی کڑی ہے، جس میں حضرت نے اسلامیت ومغربیت کی مسلم ممالک میں کشمکش کی روداد اور اس کے نتائج اور اس معرکہ میں مسلم ممالک کے طرز عمل اور موقف کا وسیع جائزہ لیا ہے، جو ان ملکوں کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں

دارالفکر بیروت سے شائع ہوئی اوراس کے بار بار ایڈیشن نکلے۔

اس سفر کے اگلے ہی سال دوبارہ اسلامک سنٹر جنیوا کے جلسہ میں شرکت کے لئے یورپ کا دوسرا سفر ہوا، مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ رفیق سفر تھے۔ اس سفر میں فرانس کے بجائے جرمنی جانا ہوا اور وہاں اشترا کی نظام کے غیر فطری، مصنوعی اور جبریہ ہونے کا مشاہدہ ہوا۔ اس طرح دنیا کی دونوں بڑی طاقتوں کے نقائص ومعائب حضرتؒ کے سامنے آ گئے۔

اس سفر کی اہم تقریروں میں ''اسلامک سنٹر بیکر اسٹریٹ لندن'' کی تقریر ہے جو طلبہ اورنوجوانوں کے سامنے ہوئی۔ برلن میں انجینئرنگ یونیورسٹی میں جرمن قوم سے خطاب فرمایا، اور اسی وقت اس کا جرمن ترجمہ پیش کیا گیا۔ واپسی میں ایک روز استنبول میں قیام رہا اور وہاں بھی ایک اہم مجمع میں خطاب ہوا۔

الہ آباد کا ایک سفر اور شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خصوصی عنایت ومحبت

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے حضرتؒ کی پہلی ملاقات تو ۱۹۵۴ء ہی میں ہو چکی تھی، اسی ملاقات میں شاہ صاحبؒ نے بڑی محبت کا معاملہ فرمایا تھا، کھانے میں اپنے پاس بٹھاتے اور لقمہ بنا بنا کر اپنے ہاتھ سے حضرتؒ کے منھ میں دیتے تھے۔ اسکے بعد مختلف مناسبتوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور شاہ صاحبؒ کی محبت وشفقت بڑھتی گئی۔ ایک خط میں یہاں تک فرمایا کہ ''جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد ورفت فرماتے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے۔''

ایک ایسی مجلس میں جس میں حضرتؒ تشریف فرما نہیں تھے بلا کسی سابقہ تمہید کے اچانک بڑے جذب کے ساتھ فرمانے لگے ''بہت دل دیکھے لیکن جیسا شفاف علی میاں کا دل دیکھا کسی کا نہیں دیکھا۔''

شاہ صاحبؒ کی محبت وشفقت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت نے ایک مکتوب میں شیخ سعدی کا یہ مصرعہ بھی تحریر فرما دیا کہ

ع کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ "اسکا صحیح مصداق تو یہ تھا کہ میں پڑھتا کیونکہ ایک بادشاہ نے کسی دہقان کے یہاں نزول فرمایا تھا اس پر اس نے یہ کہا تھا تو آپ کی مثال شاہوں کی سی ہے کہ کبھی یہاں اور کبھی وہاں نزول فرماتے رہتے ہیں چنانچہ ایک دہقان کے یہاں بھی نزول فرما کر اسکو شرف بخشا اسی لئے اگر میں کہوں تو حق بجانب ہوں

ع کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

۲۰/۲۱ رجون ۱۹۶۴ء کو الہ آباد میں دینی تعلیمی کونسل کا جلسہ طے ہوا، حضرت اس میں شرکت کے لئے الہ آباد تشریف لے گئے۔ ۲۰ رجون کو صبح گاڑی الہ آباد اسٹیشن پر پہونچی تو استقبال کرنے والوں میں حضرت شاہ صاحب بھی موجود تھے، فرمانے لگے کہ میں ناشتہ بھی ساتھ لایا تھا کہ تاخیر نہ ہو لیکن اب تو وقت زیادہ ہو چکا ہے، گھر تشریف لے چلیں وہیں پر ناشتہ ہوگا۔ موٹر پر حضرتؒ کے بیٹھنے کے لئے اپنے دست مبارک سے گدا بچھانے لگے، اسی میں شاہ صاحبؒ کو گاڑی کے کسی حصہ سے سر مبارک میں کچھ ضرب بھی لگی لیکن انکے اعلیٰ ترین اخلاق اور حضرت سے قلبی محبت کا اثر تھا کہ محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ حضرتؒ کو ندامت نہ ہو۔(۱)

حضرتؒ کو مع رفقاء کے شاہ صاحبؒ نے اپنا ہی مہمان بنایا اور حضرت کی راحت کا مستقل خیال رکھا۔ حضرتؒ کو بھی حضرت شیخؒ کے بعد سب سے زیادہ شاہ صاحب ممدوح سے عقیدت و محبت تھی، ۲۴ رنومبر ۱۹۶۷ء کو شاہ صاحبؒ کی وفات ہوئی، اور قدرتی طور پر حضرتؒ کی طبیعت متاثر ہوئی، تعزیت کیلئے حضرتؒ الہ آباد تشریف لے گئے اور خانقاہ میں پسماندگان کی فرمائش پر بڑی موثر اور مفید تقریر فرمائی۔

"مسلم مجلس مشاورت" کا قیام

پورے عالم اسلام خاص طور پر عالم عربی سے پوری دلچسپی اور فکر و توجہ کے باوجود

(۱) یہ واقعہ مخدومی سید مسلم حسنی صاحب نے سنایا جو سفر میں ساتھ تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

حضرتؒ ملکی و ملی مسائل سے نہ صرف آشنا بلکہ اس کے لئے بھی فکرمند رہتے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں اکثریت ایک دوسرے فرقہ کی ہے، حضرتؒ کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ جب تک اس فرقہ میں مسلمانوں کے بارے میں اعتماد کی فضا نہیں قائم ہوگی اور مسلمان اپنی اخلاقی قدروں سے اپنی بالادستی نہیں ثابت کریں گے اس وقت تک اس ملک میں عزت اور اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی رہنا مشکل ہوگا۔ حضرتؒ نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہی سے اس کے لئے کوششیں شروع فرمادی تھیں، جن کا ذکر کتاب کے گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ پھر جب ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوا (جن میں سب سے بھیانک فساد وخوں ریزی جمشید پور اور راوڑ کیلا میں ہوئی تھی، جس میں تین ہزار سے زائد مسلمان مارے گئے تھے) تو حضرتؒ کی حساس طبیعت بے چین ہوگئی اور درد و فکر رکھنے والا دل مضطرب ہوا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں :

''اس واقعہ نے میرے اور میرے ساتھیوں کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ہر سوچنے والے اور سمجھنے والے کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ اگر اس طرح کے واقعات کا سلسلہ جاری رہا اور ان کے سدباب کی کوئی موثر کوشش نہیں کی گئی تو مسلمانوں کا ملی وجود بھی مشکوک ہو کر رہ جائے گا، اس لئے سب سے پہلے اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔''(۱)

حضرت کو یہ خیال بھی ہوا کہ اس تحریک میں کچھ فکر رکھنے والے غیر مسلم دانشوروں کو بھی شریک کیا جائے بلکہ ان ہی کو آگے کیا جائے تو بات زیادہ موثر ہوگی، حضرت اس سلسلہ میں جے پرکاش نرائن اور ونوبا بھاوے جی سے ملاقات کے لئے اپنے رفقاء مولانا نعمانیؒ اور مولانا عمران خاں صاحبؒ کے ساتھ دہلی اور ناگپور تشریف لے گئے لیکن دونوں سے ملاقات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ حضرتؒ نے خود ان فسادزدہ علاقوں کا دورہ فرمایا، پھر ڈاکٹر سید محمود صاحب (جو اس صورت حال سے زیادہ

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۹۹ باختصار

www.abulhasanalinadwi.org

فکرمند اور مغموم تھے) مولانا نعمانیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا ابواللیث صاحبؒ (امیر جماعت اسلامی ہند) کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ ایک کل ہند مسلم مشاورتی اجلاس بلایا جائے جس میں یہ صورت سامنے رکھی جائے اور کوئی لائحہ عمل طے ہو۔ ۸/۹ راگست ۱۹۶۴ء کی تاریخیں اس کے لئے طے کردی گئیں، لیکن اسی عرصہ میں حضرت کو آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں اچانک بمبئی جانا پڑا، مولانا سید مرتضٰی صاحب نقوی (سابق ناظر کتب خانہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء) بحیثیت رفیق کے ساتھ تھے۔ آپریشن سے فراغت کے بعد محمد بھائی (مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ) کے یہاں قیام رہا، اوراس کے بعد سے بمبئی میں ان ہی کا مکان حضرت کی مستقل قیام گاہ بن گیا۔ اگست کے پہلے ہفتہ میں وطن واپسی ہوئی، وہیں مولانا نعمانیؒ کا پیغام پہونچا کہ جلسۂ مشاورت کے لئے کوئی مضمون لکھوادیں تو مناسب ہے، حضرتؒ نے تکلیف کے باوجود مضمون لکھوادیا۔

۸راگست ۱۹۶۴ء کو لکھنؤ میں یہ اجتماع ہوا جس میں مکمل نمائندگی تھی۔ حضرت کا مضمون مولانا ابوالعرفان خاں صاحب نے پڑھ کرسنایا۔ اس میں مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل ہوئی اور حضرت کے اصرار پر ڈاکٹر سید محمود صاحب کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

حضرتؒ کا ایثار وقربانی

آپریشن کے بعد ڈاکٹروں نے آرام کرنے کی تاکید کی تھی، لیکن حضرت کے دل میں جو ملت کا درد تھا یہ تکلیفیں اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ جلسہ مشاورت کے لئے مضمون لکھانے کے دوران آنکھ میں شدید تکلیف ہوئی، کچھ دیر کے لئے آرام فرمایا لیکن پھر مضمون مکمل فرمادیا۔

جلسہ میں شرکت فرمائی، ڈاکٹروں نے زیادہ گفتگو کرنے یا زور سے بولنے سے پرہیز بتایا تھا لیکن جب جلسہ میں انتشار کی کیفیت پیدا ہونے لگی اور خطرہ ہوا کہ شیرازہ

www.abulhasanalinadwi.org

منتشر ہو جائے گا، تو حضرتؒ ضبط نہ فرما سکے، اتحاد ملت کا مسئلہ تھا، موثر و پر جوش تقریر فرمائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ تو کامیابی پر ختم ہوا لیکن حضرتؒ کی آنکھ محفوظ نہ رہ سکی او رحضرتؒ نے اس اہم ملی مسئلہ کے لئے اس کو صبر و عزیمت کے ساتھ برداشت فرمایا۔

مختلف علاقوں کے دورے

اسی مجلس میں یہ بھی طے ہوا کہ اس کے لئے ایک وفد مختلف علاقوں کے دورے کرے۔ وفد میں حضرت کا نام سرفہرست تھا، حضرت نے اس کو بھی قبول فرمایا اور اپنی مجروح آنکھ کے ساتھ رانچی، چکردھر پور، چائی باسا، جمشید پور کا دورہ فرمایا اور جا بجا ایسے مجمعوں میں تقریریں کیں جن میں بڑی تعداد غیر مسلموں کی بھی ہوتی تھی۔

دسمبر ۱۹۶۴ء میں اس وفد نے گجرات کا دورہ کیا۔ حضرتؒ کے ساتھ اس سفر میں برادر زادہ مولانا سید محمد الحسنی صاحب اور خادم خاص حاجی عبد الرزاق صاحب بھی شریک تھے جواب مستقل حضرتؒ کی راحت و آرام کیلئے ساتھ رہنے لگے تھے۔ اس سلسلہ کا سب سے اہم اور طویل دورہ ریاست میسور کا تھا جو نومبر ۱۹۶۶ء میں کیا گیا، یہ ساڑھے چار ہزار میل کا طویل دورہ تھا، جو اس وفد نے کیا، اس میں تمام ارکان اور مختلف جماعتوں کے نمائندے شریک تھے، ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بس سے طے کی گئی۔ ۱۵ بڑے شہروں میں عظیم الشان جلسے ہوئے۔ قدرتی طور پر تقریباً ہر جگہ حضرت کا بھی خطاب ہوتا۔ اسکی آخری منزل گلبرگہ تھی جہاں ایک عظیم الشان مخلوط اجتماع سے حضرتؒ نے پرزور پرتاثیر خطاب کیا۔

ان دوروں میں ہر جگہ وفد کا ایسا پر جوش استقبال ہوا اور ہر جگہ ایسے ایسے عظیم اجلاس منعقد کئے گئے کہ خلافت تحریک کی یاد تازہ ہوگئی۔ ہندو مسلم اتحاد کے ایسے مناظر سامنے آئے جس کی کوئی امید قریبی زمانہ میں بظاہر دشوار نظر آتی تھی۔ اس طرح حضرتؒ نے جس مقصد کی خاطر مشاورت کی تشکیل میں بنیادی کوشش فرمائی تھی وہ بڑی حد تک حاصل ہوا، مسلمانوں کے بارے میں غیر مسلموں کے ایک طبقہ کا ذہن صاف ہوا، اور اعتماد کی فضا بحال ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

حجاز مقدس کا سفر

رابطہ عالم اسلامی نے اپنی تجویز کے مطابق اپریل ۱۹۶۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ کو اپنی پہلی مؤتمر کا انعقاد کیا۔ حضرتؒ نے اس میں شرکت کے لئے مولانا معین اللہ صاحبؒ کی رفاقت میں سفر کیا۔ مؤتمر میں حضرتؒ نے اس بلد امین میں رہنے والوں کو ان کے فرائض یاد دلائے، حضرتؒ نے یہ مقالہ بحرین کے ہوائی اڈہ پر لکھوایا تھا جو ضعف بصارت کی وجہ سے استاذ عمر الداعوق (بانی جماعت عباد الرحمٰن لبنان) نے حضرتؒ کی طرف سے پڑھ کر سنایا۔ حج و موتمر سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ حاضری ہوئی اور وہاں جامعہ اسلامیہ کی مجلس استشاری میں شرکت فرمائی۔ اس سفر میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی کے اچانک حادثہ ارتحال کی خبر حضرت پر بجلی بن کر گری اور حضرت پر اس کا بڑا اثر ہوا۔

صبر و عزیمت کے دن

آنکھ کی تکلیف مستقل جاری تھی لیکن حضرتؒ اپنے جوش ایمانی اور قوت ارادی کے ساتھ دعوتی و تبلیغی سفروں میں مشغول تھے۔ ایسے ہی ایک دورہ میں جو دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے مغربی یوپی کا تھا سخت لو چل رہی تھی، گرمی اپنے شباب پر تھی، حضرت ایک شب تقریر سے فارغ ہو کر آرام فرمانے لگے، جب تہجد میں بیدار ہوئے تو محسوس ہوا کہ جس آنکھ میں کئی بار آپریشن ہو چکا ہے اس کی بصارت ختم ہو گئی ہے، قدرتی طور پر اس کا اثر پڑا۔ اور حضرت دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے پہلے دن کے اجلاس میں شرکت فرما کر حضرت شیخ کی ہدایت پر فوراً لکھنؤ تشریف لے آئے، اور سیتاپور کے مشہور آنکھ کے اسپتال میں داخل ہو گئے۔ ڈیڑھ مہینہ اسپتال میں رہنا پڑا، کسی طرح انجکشن وغیرہ کے ذریعہ اس پر قابو ہوا تو حضرت رائے بریلی تشریف لے آئے۔ چھ مہینہ کسی حد تک سکون سے گذرے، اس دوران حضرت علمی کاموں اور لکھانے میں مشغول رہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اسی زمانہ میں مشاورت کا ایک اہم اجلاس ڈاکٹر فریدی صاحب کے مکان پر طے ہوا، حضرت کو اس کے لئے مضمون قلمبند کروانا تھا، نزلہ کی شدت کی وجہ سے حضرت نے تیز دوائیں استعمال فمائیں تا کہ اس کا زور کم ہو اور مضمون لکھوایا جا سکے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون تو تیار ہو گیا لیکن اس کے دو تین روز کے اندر سنبل بائی کا شدید حملہ ہوا، اگلے ہی روز ۷؍دسمبر کو دوبارہ اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ آنکھ میں ایسی شدید تکلیف ہوتی تھی کہ دیکھنے والوں کے لئے اس کا برداشت کرنا مشکل تھا، اس دوران پانچ آپریشن ہوئے، بار بار انجکشن لگائے جاتے لیکن مستقل کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا، اس طرح تقریباً تین مہینے گذر گئے۔ حضرتؒ نے جس صبر و استقلال کے ساتھ وہ تکلیف برداشت کی اور یہ دن جس عزیت و استقامت کے ساتھ گذارے توفیق الٰہی کے سوا اس کو کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اہل سیتا پور نے بڑی محبت وعقیدت کا معاملہ کیا۔ خدام نے خدمت وراحت رسانی کا پورا اہتمام رکھا۔(۱)

والدہ صاحبہ کو اسکی اطلاع ہوتی تھی، وہ سراپا دعا تھیں۔ انکے علاوہ حضرت شیخ، حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ بھی اس کے لئے بے قرار تھے اور دعاؤں میں مصروف۔

اخیر میں شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی ہدایت ومشورہ پر ۲۰؍فروری کو لکھنؤ واپس تشریف لاکر ہومیو پیتھک علاج شروع کیا جس سے الحمدللہ وہ تکلیف دور ہوئی۔

بعض اہم کتابوں کی تصنیف

شروع ہی سے حضرت کی زندگی بڑی منظّم اور مشغول گذر رہی تھی۔ وقت کی قدر

(۱) سیتا پور کے تعلق والوں میں جناب ظفر احمد صاحب صدیقی، حاجی محمد حسین صاحب بسوانی، جناب تفضّل حسین صاحب، جناب مجتبیٰ حسین صاحب ایوبی اور شیخ بنیاد حسین صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، خدمت کرنے والوں میں حاجی عبدالرزاق صاحب کے علاوہ مولانا علی آدم صاحب ندوی افریقی اور مولانا سعید بنو ندوی افریقی نے بڑی دلسوزی کے ساتھ خدمت کی۔

www.abulhasanalinadwi.org

و قیمت کا احساس اور اسکا صحیح استعمال، حضرت کی ایک نمایاں صفت تھی۔ خاندان میں تصنیف و تالیف کا ذوق نسل در نسل چلا آ رہا تھا۔ حضرتؒ کا بھی اصلی ذوق تصنیف و تالیف کا تھا، بقیہ دوسرے کام وہ دینی ضرورت اور وقت کا تقاضا سمجھ کر انجام دیتے تھے، تصنیف و تالیف کے مقررہ وقت میں دوسرا کام حضرتؒ پر بار ہوتا تھا۔

سیتاپور اسپتال میں قیام کے دوران حضرتؒ کو شدت سے یہ احساس ہوا کہ اسلام کے بنیادی ارکان (نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج) کی روح، ان کی حکمتوں، حقیقتوں اور مقاصد کے سمجھنے اور بیان کرنے میں اس دور کے مصنفین و اہل قلم کے یہاں بڑی بے اعتدالی نظر آ رہی ہے، اور یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اس سے متاثر ہونے والے کہیں ان ارکان کی حقیقت اور اسکی طاقت سے محروم نہ ہو جائیں، اور جدید مادی تعبیر اور عصری تشریح کے دائرۂ اثر میں آ کر ایمان و احتساب کا مفہوم ہی ان کے ذہنوں سے نہ نکل جائے کہ یہ بات امت کے لئے ایک بڑا خطرہ اور تحریف معنوی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا شدید تقاضا پیدا ہوا کہ اسپتال سے فارغ ہوتے ہی اسلام کے ان عملی ارکان اربعہ پر ایک مکمل کتاب تیار کی جائے۔ حضرت فرماتے ہیں :

''یہ خیال قلب و ذہن پر ایسا مستولی ہوا کہ اس کو اسپتال کا بیمار و سوگوار ماحول اور آنکھ کی بار بار تکلیف بھی نہ ہٹا سکی۔''(۱)

اسپتال سے فارغ ہو کر رائے بریلی تشریف لائے، اس موضوع پر مواد جمع فرمایا اور دائرہ شاہ علم اللہ کی مبارک مسجد میں بیٹھ کر اس کا املا شروع کرایا، حضرتؒ کے کاتب خاص مولانا نثارالحق صاحبؒ لکھتے جاتے تھے۔ حضرت فرماتے ہیں :

''ذہن و دماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح طاری ہو گیا کہ دوسرے اوقات میں بھی وہ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ یہ عرصہ سے میری زندگی میں ہر اہم تصنیف کا خاصہ بن گیا ہے۔ یہ ایک طرح کا ایک تصنیفی اعتکاف ہوتا ہے، جس سے نکلنا اسی وقت ہوتا ہے جب کتاب کی تائے تمت ہلال عید بن کر نمودار ہوتی

---

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۶

www.abulhasanalinadwi.org

ہے۔''(۱)

۱۸/اپریل ۱۹۶۶ء کو یہ کام شروع ہوا تھا، ۱۳/فروری کو اس کی تکمیل ہوئی، اور اسی سال دارالقلم کویت سے یہ کتاب "الارکان الاربعة" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ حضرت کے برادرزادہ مولانا سید محمد الحسنی نے بڑی خوبی سے فرمایا کہ کتاب کی اصل روح اور طاقت اس میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ علماء، مفکرین اور ادباء نے اس کو بڑی قدر و وقعت کے ساتھ قبول کیا۔ حضرت شیخؒ نے دیکھ کر فرمایا کہ اگر میری جوانی ہوتی تو میں اس کتاب کا درس دیتا۔

حضرتؒ نے سیرت کے موضوع پر بیش قیمت و موثر مقالات لکھے اور تقریریں فرمائیں، اس کی ضرورت تھی کہ ان محاضرات کو یکجا شائع کر دیا جائے۔ عالم عربی کا جو تعلق ذات رسول ﷺ سے ہونا چاہئے تھا، اور عشق و محبت کی جو آگ ان کے سینوں میں بھڑکنی چاہئے تھی اسکی کمی حضرتؒ کو صاف محسوس ہوتی تھی، اس میں بڑا دخل مغربی تہذیب کے عام ہونے اور پھر قومیت عربیہ کے فتنہ کا تھا، اسلئے حضرت کو اس مجموعہ کی اشاعت کی مزید ضرورت محسوس ہوئی، اور حضرت نے بعض اردو مضامین جو اس موضوع سے خاص تعلق رکھتے تھے، عربی ترجمہ کے ساتھ کتاب میں شامل فرمائے، اور "الطريق إلىٰ المدينة" کے نام سے پہلی مرتبہ کتاب مدینہ منورہ ہی سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ شیخ علی طنطاوی کتاب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''جب میں نے آپکی کتاب پڑھی تو میں نے محسوس کیا کہ شوق میرے اندر انگڑائی لینے لگا، اور میرے سینے میں پھر وہی تپش ہے، اسطرح مجھے اطمینان ہوا کہ میرا دل جوہر محبت سے بالکل خالی نہیں ہوا۔ لیکن افکارِ زمانہ اور وقت نے اس جوہر کو گرد آلود کر دیا تھا، آپکی کتاب نے اس گرد کو ایک بار پھر صاف کر دیا۔''(۲)

اسی زمانہ میں حضرت نے والد نامدار مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنیؒ کی

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۸ (۲) کاروان مدینہ مقدمہ شیخ علی طنطاویؒ

www.abulhasanalinadwi.org

سوانح مرتب فرمائی، جس میں ضمیمہ کے طور پر اخیر میں برادر معظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے حالات بھی درج فرمائے، یہ کتاب ''حیات عبدالحی'' کے نام سے ۱۹۷۰ء میں ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بامعنی فقرہ بھی تحریر فرمایا: ''حیات عبدالحی کا مصنف زندہ باد!''

والدمرحوم کی تصنیفات کی تکمیل واشاعت

''إن من ابر البر بر الرجل أهل ود أبيه'' (آدمی کی بڑی نیکیوں میں سے یہ ہے کہ والد کے تعلق والوں کے ساتھ سلوک کرے) کے فرمان نبویؐ میں والد کے آثار وباقیات اور وہ تصنیفات وتالیفات جو اس کو دل وجان سے عزیز ہوں، بدرجہ اولیٰ شامل ہیں۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ کی اچانک وفات ہوئی، حضرت کی عمر کم تھی، ڈاکٹر صاحب سفر پر تھے، لیکن اللہ مخلصین کے عمل کو ضائع نہیں فرماتا۔ ان کی ساری تصنیفات جو مخطوطہ تھیں محفوظ رہیں، اور شروع میں ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کی نگہداشت رکھی پھر حضرتؒ نے ان کی اشاعت کی فکر وسعی کی، ''عوارف المعارف'' ''الثقافة الاسلامية في الهند'' کے نام سے دمشق سے شائع ہوئی۔ ''جنة المشرق'' ''الهند في العهد الاسلامي'' کے نام سے دائرۃ المعارف سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعض جغرافیائی مقامات کی نئی تقسیم کے اعتبار سے تصحیح فرمائی تھی دیمک خوردہ مقامات کی تکمیل بھی کی تھی لیکن اس کی اشاعت سے پہلے دوبارہ اس پر دیمک کا حملہ ہوا، پھر حضرتؒ نے اس کی تکمیل فرمائی اور قابل اشاعت بنایا۔

''نزهة الخواطر'' کے سات حصہ حضرت ہی کی فکر وسعی سے دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکے تھے، آٹھویں حصہ میں ساڑھے تین سو شخصیات ایسی تھیں جن کے تراجم مصنف کی اچانک وفات کی وجہ سے ناقص رہ گئے تھے، حضرتؒ نے بڑی عرق ریزی سے ان کی تکمیل فرمائی، اور قلم سے قلم ملا دیا، لیکن ادباً اپنی عبارت قوسین

میں رکھی۔اس سلسلہ میں اللہ نے خصوصی مدد فرمائی جو عام طور سے مخلصین کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔اس کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ پائلی کا سن وفات نہیں مل رہا تھا، اچانک رائے بریلی میں ایک صاحب آئے، باتوں باتوں میں ان سے اسکا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ عجیب بات ہے کہ میں نے سفر میں ایک جگہ ''شحنۂ ہند'' کا ایک پرانا فائل فروخت ہوتے ہوئے دیکھا، مجھے اسکی ضرورت نہ تھی مگر میں نے لے لیا، اس میں انکے انتقال کی پوری تفصیل اور تاریخ موجود ہے۔

۱۹۹۲ء میں حضرت نے دوبارہ پوری کتاب کا مقابلہ اور تصحیح فرمائی اور دار عرفات سے "**الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام**" کے نام سے اسکو اپنے ذاتی خرچ پر شائع فرمایا۔ پھر حضرت ہی کی توجہ سے ۱۹۹۹ء میں یہ کتاب عالم عربی میں بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوئی۔

قومیت عربیہ کا فتنہ اور اس کی سرکوبی

قومیت عربیہ کا فتنہ جس کی قیادت مصری صدر جمال عبد الناصر کر رہے تھے، اس زور سے اٹھا کہ اچھے اچھے صاحب فکر و صاحب قلم اس کی رو میں بہہ گئے۔اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ فلسطین کی جنگ میں سات عرب ملکوں نے جس طرح شکست کھائی تھی، وہ زخم بڑا کاری تھا، پھر جب جمال عبد الناصر نے نہر سوئز کے قومیانے کا کام کیا اور اتحاد ثلاثہ (برطانیہ، فرانس اور اسرائیل) کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا تو اس نے عرب نوجوانوں میں ایسا نشہ پیدا کر دیا کہ نوجوان ہی نہیں عرب صحافی، اہل قلم، ادیب ان کی ''عصمت و تقدیس'' کے گن گانے لگے، اور اس کا اثر عقائد و اعمال پر بھی پڑنے لگا اور یہ جادو ایسا سر چڑھا کہ ۱۹۶۷ء کی ہزیمت کے باوجود ان کی اس مقتدائیت و محبوبیت میں کوئی بڑا فرق نہیں آیا۔ یہ فکر صرف یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی سیادت و امامت کا عقیدہ اور آپکے دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل ہونے کا اعتقاد بھی کمزور ہونے لگا، اور اس کے آثار و شواہد بعض سنجیدہ

www.abulhasanalinadwi.org

ادیبوں اور اہل قلم کی تحریروں میں نظر آنے لگے اور صاف محسوس ہونے لگا کہ مسئلہ صرف قومیت عربیہ کا نہیں، اور ناصر صرف قومیت عربیہ کے علمبردار نہیں بلکہ وہ عالم عربی میں ایک بنیادی ہمہ گیر اور دور رس تبدیلی کے علمبردار ہیں اور وہ اسکو ہمہ گیر مادیت اور نامذہبیت کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔

حضرت نے اس خطرہ کو جو پورے عالم عربی پر منڈلا رہا تھا نہ صرف یہ کہ محسوس کیا بلکہ اس وقت اپنی زبان و بیان کی پوری طاقت اور زور تحریر کو صدر ناصر کی مخالفت و تنقید پر مرکوز کر دیا، اور ایسے کرب و اذیت اور قلب و ضمیر کے ایسے احتجاج و اضطراب کا اظہار فرمایا جو بہت سے لوگوں کے لئے باعث تعجب بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ لیکن بقول حضرت کے واقعہ یہ تھا ؎

دل عبث لب بہ شکوہ وانہ کند
شیشہ تا نہ شکند صدا نہ کند

یہ حضرت کی بصیرت ایمانی، حقیقت شناسی کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ حضرتؒ کے عالم عربی سے (جو عالم اسلام کے دل کی حیثیت رکھتا ہے) قلبی لگاؤ اور تعلق کا بھی اثر تھا۔ جب حضرتؒ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ عالم عربی کا اپنا مسئلہ ہے، مولانا کو اس سے کیوں اتنی دلچسپی ہے تو اس کے جواب میں حضرتؒ نے قلم برداشتہ ایک مضمون تحریر فرمایا جس میں عربوں سے اپنی گہری وابستگی ظاہر فرمائی۔ تحریر فرماتے ہیں :

"میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں، نہ میری معلومات سکنڈ ہینڈ ہیں، اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ، ان کے مصائب اور ان کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب و اسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا ہے، اور نہ میں اچانک و بے وقت اس میدان میں آ گیا ہوں، میں اپنے کو ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطے سے بھی اس وسیع و عظیم عرب خاندان کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے، ایک فرد سمجھتا ہوں، میں ان کے دکھ سکھ

www.abulhasanalinadwi.org

میں شریک ہوں، میری قسمت ان کی قسمت سے وابستہ ہے، ان کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے، میری تخیلات کی دنیا میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان و ادب اور اس کی تہذیب و ثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر میرا حق کسی طٰہٰ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا خمیر اور میرا آب و گل ہندوستان کی سرزمین سے ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے، اس پر فخر بھی لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے اور مجھے اقبال کے الفاظ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ

میرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخم ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی(۱)

البعث الاسلامی نے (جو حضرتؒ کی سرپرستی میں حضرتؒ کے برادرزادہ مولانا سید محمد الحسنیؒ نکالتے تھے) اس سلسلہ میں بہت اہم کردار ادا کیا اور اس فتنہ کے خلاف ایک محاذ کھول دیا، اسکی گونج پورے عالم اسلام میں سنی گئی، مصری سفارت خانہ نے حکومت ہند سے اس کے بارے میں احتجاج بھی کیا، اور یہ خطرہ بھی ہوا کہ حضرت اور مولانا محمد الحسنی کو اس سلسلہ میں زیادہ پریشانی اٹھانی پڑے۔(۲) لیکن یہ حضرات کلمۂ حق بلند فرماتے رہے۔ حضرتؒ کے اس طرز فکر اور طرز عمل نے اس فتنہ پر کاری ضرب لگائی، یہاں تک کہ خود علماء عرب نے اس کا اعتراف کیا۔ ایک مشہور عرب مجاہد و رہنما شیخ محمد محمود صواف نے کہا کہ ’’البعث نے ناصر کو بے نقاب کرنے کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی سے نہ ہوسکا‘‘۔(۳)

---

(۱) عالم عربی کا المیہ ص ۱۵۹
(۲) اس سلسلہ میں حضرت کا پاسپورٹ بھی ضبط کیا گیا اور وزارت خارجہ کی طرف بلا کر باز پرس بھی کی گئی۔
(۳) پرانے چراغ دوم ص ۳۹۵

www.abulhasanalinadwi.org

بعض اہم بیرونی اسفار

۱۹۶۶ء میں چونکہ حضرتؒ کا پاسپورٹ حکومت کی تحویل میں تھا اسلئے کوئی بیرونی سفر نہیں ہوسکا۔ ۱۹۶۷ء میں پھر اس کا سلسلہ شروع ہوا۔ شعبان میں رابطہ کا اجلاس طے ہوا۔

حضرتؒ نے اس سفر میں مولانا محمد الحسنیؒ کو ساتھ لیا، اور رابطہ کے اجلاس کی تاریخوں سے کئی روز پیشتر حجاز مقدس پہنچ گئے۔ اسی دوران ایک سنگین حادثہ پیش آیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے بال بال حفاظت فرمائی۔ ہوا یہ کہ شیخ محمد محمود صواف (جو وزارت تعلیم میں مشیر بھی تھے) نے ان حضرات کو وزیر تعلیم شیخ حسن بن عبداللہ سے ملنے کی دعوت دی۔ اس کے لئے یہ حضرات طائف تشریف لے گئے، وہاں وزیر موصوف بڑی محبت وعقیدت اور گرمجوشی سے ملے۔ واپسی میں جب کہ یہ حضرات احرام میں تھے، ڈرائیور کی آنکھ جھپک جانے کی وجہ سے گاڑی الٹ گئی، چھت زمین پر تھی اور چاروں پہیئے اوپر، دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ اس گاڑی کے سب مسافر جاں بحق ہو چکے، لیکن محض قدرت الٰہی کا کرشمہ تھا، اللہ نے مدد فرمائی اور پوری حفاظت کی، حضرتؒ کو معمولی خراش آئی تھی لیکن نہ وضو شکست ہوا تھا نہ ہاتھ سے تسبیح چھوٹی تھی۔ مفتی امین الحسینی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مبارک باد دی اور کہا کہ ''آپ گاڑی سے ایسے نکلے جیسے حضرت یونسؑ شکم ماہی سے نکلے تھے''۔

اسی قیام مکہ معظّمہ میں ''نادی الوحدۃ الریاضی'' کے ذمہ داروں کی خواہش پر سر برآوردہ حضرات، ادیبوں، صحافیوں اور کالجوں کے اساتذہ اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے سامنے خطاب فرمایا اور کھل کر صدر ناصر کی ناکامیوں کے اسباب بیان فرمائے اور از سر نو اسلام کی طرف بازگشت کرنے اور اسکا نمونہ بننے کی دعوت دی۔

اگلے ہی سال شعبان ۱۳۸۸ھ نومبر ۱۹۶۸ء میں پھر حجاز کا سفر ہوا اور مدرسہ ثانویہ طیبہ مدینہ منورہ میں اسی موضوع پر خطاب ہوا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرت

www.abulhasanalinadwi.org

کے استاذ شیخ تقی الدین ہلالیؒ بھی اس میں شریک تھے۔ واپسی میں دو روز کویت میں قیام فرمایا، اور وہاں بھی "جمعیة الاصلاح الاجتماعی" کے ہال میں اسی موضوع پر تقریر فرمائی۔

اپریل ۱۹۶۹ء میں جامعہ اسلامیہ کی مجلس استشاری میں شرکت کے لئے سفر ہوا، اسکی خصوصیت یہ تھی کہ یہ سفر حضرت شیخ الحدیثؒ کی ہمرکابی میں ہوا تھا۔ پورے سفر اور پھر حرمین شریفین کے قیام میں حضرت شیخ نے خصوصی محبت وشفقت فرمائی اور حضرتؒ کی راحت وآرام کا خیال رکھا۔

اسی سال شعبان میں رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے سفر ہوا، اس سفر میں دوبارہ مدینہ منورہ کے مدرسہ ثانویہ میں "المیۂ فلسطین کے تین سبق" کے عنوان سے خطاب ہوا۔ جلسہ میں رابطہ کے اہم ارکان، جامعہ کے اساتذہ وطلبہ اور شہر کے معزز افراد موجود تھے۔

مستقل ان تنقیدی، احتسابی خطبات ومضامین کے بعد حضرتؒ نے "الفتح للعرب المسلمین" کے عنوان سے ایک طاقتور اور پرزور مضمون تحریر فرمایا تاکہ مایوسی کے بادل چھٹیں اور عربوں میں نیا اعتماد، ولولہ اور جوش پیدا ہو۔ یہ رسالہ بار بار شائع ہوا اور اس کے بڑے گہرے اور مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ مفتی امین الحسینی صاحب نے اس کو "العاقبة للمتقين" کے عنوان سے بیروت سے شائع کیا۔

انگلستان کا ایک طویل سفر

اپریل ۱۹۶۹ء کے سفر حجاز ہی میں مفتی امین الحسینی صاحب نے جو حضرت سے بڑی محبت رکھتے تھے باصرار ایک رقم خدمت میں پیش کی اور اصرار کیا کہ حضرتؒ اپنی آنکھ کے علاج کے سلسلہ میں انگلستان کا سفر کریں۔ حضرتؒ نے ان کے تعلق اور اصرار کی وجہ سے شیخ سے مشورہ کر کے رقم قبول فرمالی۔ انہیں دنوں میں جنیوا سے ڈاکٹر سعید رمضان صاحب کا دعوت نامہ پہونچا۔ انھوں نے اس میں اسلامک سنٹر کے جلسہ

www.abulhasanalinadwi.org

میں شرکت پر اصرار کیا تھا۔ حضرتؒ نے مولانا معین اللہ صاحبؒ کو ساتھ لیا اور ۶/جون کو جدہ سے جنیوا کے لئے روانہ ہوگئے، چند روز ٹھہر کر انگلستان تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب نے بھی حضرتؒ کی تشریف آوری کی خبر سن کر وہاں مزید قیام کرلیا۔ ڈاکٹر مظہر علی خاں صاحب کے ذریعہ سے دو ماہر سرجنوں سے وقت لیا گیا، ڈاکٹر فریدی صاحب نے ڈاکٹروں کو پوری تفصیلات سے آگاہ کیا، معائنہ کے بعد ڈاکٹروں نے کسی آپریشن کے ذریعہ سے نظر واپس ہونے کی امید ظاہر نہیں کی۔ البتہ انھوں نے ایسی دوا تجویز کی جس کے ڈالنے سے ٹینشن بند ہوجائے اور فوری سکون مل جائے۔

اس سفر میں انگلستان کا طویل دورہ ہوا اور متعدد مقامات پر جانا ہوا۔ جن میں برمنگھم، مانچسٹر، بلیک برن، شیفیلڈ، ڈیوز بری، لیڈس اور گلاسگو خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ہر جگہ حضرت کے خطابات ہوئے اور اس طرح یہ سفر طبی سے زیادہ دعوتی و تحریکی سفر بن گیا۔

سفر حیدرآباد

جنوری ۱۹۶۸ء میں جامعہ نظامیہ کے نصاب و نظام کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ، مولانا صبغت اللہ صاحب بختیاریؒ جیسے سر برآوردہ علماء شامل تھے۔ حضرتؒ کو اس کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا حضرت اس میں شرکت کے لئے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حضرتؒ کے خادم اور مجاز طریقت مولانا علی آدم ندوی صاحب اور نواسہ مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی صاحب (حال ناظر عام دارالعلوم ندوۃ العلماء) ساتھ تھے۔ اس کمیٹی نے ضروری اور فوری اصلاحات کا مشورہ دیا اور اس کی مفصل رپورٹ پیش کردی گئی۔ مولانا ابوالوفاء افغانی حیدرآبادی نے اس کو پسند فرمایا لیکن بعض رکاوٹوں کی وجہ سے اس پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔

www.abulhasanalinadwi.org

قدرِ جوہر شاہ داند

سفر حیدرآباد سے واپسی پر حضرتؒ نے ایک رات بھوپال رہ کر صبح روانگی کا ارادہ فرمالیا اور اس کی اطلاع بھی مولانا محمد عمران خاں صاحبؒ کو دیدی، اتفاق سے گاڑی رات آٹھ بجے پہنچنے کے بجائے نصف شب میں ۲-۳ بجے پہنچی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں :

''مجھے خیال تھا کہ مولانا عمران خاں صاحبؒ نے ٹیلیفون سے دریافت کرلیا ہوگا اور جب معلوم ہوا ہوگا کہ گاڑی غیر معمولی طریقہ پر لیٹ ہے تو اسٹیشن آنے کا ارادہ ملتوی کردیا ہوگا۔ جب بھوپال کا اسٹیشن آیا تو میں احتیاطاً اٹھ کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ ان کا کوئی قاصد پیغام لیکر تو نہیں آیا۔ میری نظر مولانا کے صاحبزادہ رضوان سلّمہ پر پڑی، میں نے گھبرا کر پوچھا کہ مولانا تو نہیں آئے؟ انھوں نے کہا مولانا تو کیا حضرت صاحبؒ (حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی پیر ننھے میاں صاحب) بھی تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت پیر صاحب؟ کہنے لگے کہ ہاں۔ جب گاڑی لیٹ ہوئی تو لوگوں نے بہت کہا کہ آپ تشریف لے جائیں لیکن انکار کردیا اور فرمایا کہ جس کو جانا ہے، چلا جائے میں تو رہوں گا۔ اتفاق سے ژالہ باری یا کسی اور وجہ سے ان دنوں سردی بھی تیز ہوگئی تھی، حضرتؒ اسی طرح پلیٹ فارم پر رہے، اتنے میں میں نے دیکھا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں، کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑے ہوگئے، دو خادم سہارا دیئے ہوئے تھے، میں شرم و ندامت سے پانی پانی ہوگیا۔ میں نے کہا کہ حضرت نے کیوں تکلیف فرمائی؟ فرمایا کہ میری رات تو ایسی مبارک گذری کہ کم راتیں ایسی گذری ہوں گی (او کما قال)۔ اتنے میں اور مجمع بھی آ گیا۔ مجھے حکم دیا کہ میں اپنی سیٹ سے نہ اتروں۔ فرمایا کہ آپ سفر کرکے آ رہے ہیں اور خود بدولت کھڑے رہے۔ اللہ اللہ کرکے

www.abulhasanalinadwi.org

گاڑی چلی اور میں ان بزرگوں کے اخلاق عالیہ، تواضع وایثار، خوردنوازی کو یاد کرکے ورطۂ حیرت میں ڈوبا رہا۔ اور آج بھی جب خیال آتا ہے تو حیران رہ جاتا ہوں۔"(۱)

والدہ صاحبہؒ کی وفات

۶ر جمادی الآخر ۱۳۸۸ھ مطابق ۳۰ر اگست ۱۹۶۸ء میں حضرت کی والدہ صاحبہؒ نے ترانوے (۹۳) سال کی عمر میں وفات پائی اور وہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی جو ہمہ وقت دعا ومناجات میں مشغول رہتی تھی، ساری عمر انھوں نے حضرتؒ کی مقبولیت، محبوبیت، امامت وقیادت کی جو دعائیں کی تھیں اس کے مظاہر دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور وہ مزید ترقیات باطنی وظاہری کے لئے دعاگو رہتیں، حضرت کے لئے انھوں نے ہمیشہ خوب سے خوب تر چاہا اور دل کی گہرائیوں سے اس کے لئے دعا کرتی رہتیں۔ حضرت کو ابتداء ہی میں انھوں نے یہ تعلیم دی تھی کہ جب بھی کوئی مضمون لکھیں تو سرورق پر یہ دعا ضرور لکھا کریں۔

اللھم آتني بفضلك أفضل ما تؤتي عبادك الصالحين

(اے اللہ تو اپنے نیک بندوں کو افضل سے افضل ترین جو کچھ عطا فرماتا ہے، وہ مجھے بھی عطا فرما)

اللہ نے اس دعا کو بھی جس طرح حضرتؒ کے حق میں قبول فرمایا، وہ ہر صاحب نظر جانتا ہے۔ یہ ایک نہایت جامع دعا ہے، اس کے علاوہ بھی انھوں نے حضرتؒ کے لئے جو جو مانگا اللہ تعالیٰ نے ان کی ہر دعا قبول فرمائی۔ ان کا وجود سارے خاندان کے لئے نہیں حضرتؒ کے واسطہ سے سارے عالم کیلئے باعث رحمت تھا۔

اس کتاب کے باب دوم میں تفصیل سے انکے حالات و واقعات گذر چکے ہیں۔ حضرتؒ کی جس طرح انھوں نے تربیت ونگہداشت کی اور ساری عمر دعا کرتی رہیں اسکی تفصیل بھی گذر چکی ہے، روزآنہ وہ استخارہ کی نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۵۴-۵۵

www.abulhasanalinadwi.org

سے حضرت کی صحیح رہنمائی کی دعا کرتیں، اور ہمیشہ یہ بھی دعا کرتیں کہ ان سے کوئی غلط کام نہ ہو۔

حضرت بیان فرماتے ہیں :

''انتقال کے بعد والی رات عجیب رحمت و برکت کی رات معلوم ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سکینت کا شامیانہ سروں پر تنا ہوا ہے، کوئی وحشت اور بے رونقی نہیں تھی، میں سحر کے وقت ذکر و دعا کے ساتھ انہیں کے اشعار پڑھتا رہا، جو حسب ذیل ہیں ؎

تیرا شیوہ کرم ہے، اور میری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولیٰ تیرے در کے فقیروں کی
ادھر بھی ابر رحمت آئے اور جم جم کے یوں برسے
کہ ہو سرسبز کھیتی ہم غریبوں بد نصیبوں کی
خزاں میں بھی شجر سرسبز ہوکر پھول پھل لائیں
ہو شہرت باغباں کی باغ کی غنچوں کی پھولوں کی''(۱)

دارالعلوم میں قیام

تبلیغی ودعوتی انہماک کی وجہ سے حضرتؒ کا ۱۹۵۳ء کے بعد سے مستقل تبلیغی مرکز ہی میں قیام رہتا تھا، دونوں وقت گھر سے کھانا وہیں جاتا تھا۔ مولانا نعمانی صاحبؒ بھی قریب ہی مکان میں رہتے تھے۔ دعوتی دوروں اور ملی کاموں میں دونوں حضرات شریک رہتے۔ مرکز کے قیام کے دوران سید مسعود علی آزاد فتحپوری (جو حضرت رائپوریؒ کے خواص اصحاب میں سے ہوئے اور حضرت کی آخری نماز جنازہ بھی انھوں نے پڑھائی) سے بڑی یکجائی رہی۔ وہ حضرتؒ سے بڑی محبت فرماتے اور خیال رکھتے۔ خدمت وراحت کا خیال رکھنے والوں میں مسجد کے خادم ومنتظم مولوی محمد سلیم صاحب مرحوم، بھائی عبدالسلام صاحب اور مولوی ڈاکٹر اشرف علی ندوی لکھنوی صاحب خاص

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۴۹

www.abulhasanalinadwi.org

طور پر قابل ذکر ہیں۔

مرکز ہی کے قیام میں ڈاکٹر محمد آصف قدوائی مرحوم سے ربط وتعلق ہوا اور انھوں نے حضرتؒ کی اہم کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

تقریباً ۱۵-۱۶ سال مرکز میں رہنے کے بعد حضرتؒ دارالعلوم کے مہمان خانہ میں منتقل ہو گئے اور اخیر وقت تک لکھنؤ میں دارالعلوم کا مہمان خانہ ہی حضرتؒ کی قیام گاہ رہا۔

تحریک ''پیام انسانیت''

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا لیکن جس تیزی کے ساتھ اخلاقی گراوٹ، انسانی پستی اور انسانی قدروں کی پامالی کا سلسلہ شروع ہوا، اس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ملک تو آزاد ہو گیا لیکن ضمیر اندر سے غلام ہے، برطانیہ یا کسی غیر ملکی طاقت کا نہیں بلکہ ہوا وہوس، دولت وقوت، عزت واقتدار اور تنگ نظری وتنگ دلی کا۔ اتنے وسیع وعریض ملک میں ڈھونڈنے سے ایسے افراد نہیں ملتے تھے جن کو دل وضمیر کو بیدار کرنے کی فکر ہو، جو لوگوں کو ان چیزوں سے آگاہ کریں، جو ملک کے لئے حقیقی خطرہ ہیں۔

حضرتؒ کے وسیع ذہن اور دردمند دل نے ملک کے آزاد ہونے کے بعد ہی اسکو محسوس کر لیا کہ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو نہ ملک بچے گا اور نہ اس کے رہنے والے بچیں گے، نہ مدارس محفوظ رہ سکیں گے، نہ مساجد، نہ ادارے بچ سکیں گے نہ کتب خانے، کشتی ڈوبے گی تو سب ڈوبیں گے۔ حضرتؒ نے صاف محسوس فرما لیا کہ اگر اکثریتی فرقہ کے لوگ اس کام کے لئے آگے نہیں بڑھتے تو مسلمانوں کو اس کے لئے آگے آنا چاہئے اور اس خلاء کو پر کرنا چاہئے، مسلمانوں کے پاس جو نبوی تعلیمات اور اخلاقی قدریں ہیں، ہر مذہب اس سے خالی ہے اور اس ملک کے مسلمانوں کے باعزت رہنے کا راستہ یہی ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں اور اخلاقی قیادت کے اس خلاء کو پر کریں جو عرصہ دراز سے اس ملک میں چلا آ رہا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

حضرتؒ نے اس ضرورت کے پیش نظر تقسیم اور ملک کے آزاد ہونے کے بعد ہی سے اپنے ان خیالات اور ملک کی اخلاقی گراوٹ اور بگڑتی ہوئی صورتحال پر اپنی گہری تشویش کا اظہار اپنے بعض مضامین و رسائل میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کوشش کا با قاعدہ آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا، اور اس کی پہلی تقریر گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ہوئی، اس کے علاوہ تبلیغی دوروں کے ساتھ اس جز کو شامل کرلیا گیا تھا، اس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

حضرت کو کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ محسوس ہوا کہ تبلیغی دوروں کے ساتھ اس کا ملانا بعض غلط فہمیوں کا موجب ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف مستقل بیرونی ممالک کے سفروں کی وجہ سے بھی یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر ۱۹۷۴ء کو الٰہ آباد سے با قاعدہ ''پیام انسانیت'' (Message of Humanity) کے نام سے اس تحریک کا آغاز کیا گیا۔

اس کے بعد سے پورے ملک میں اس کے چھوٹے بڑے پروگرام ہوتے رہے، بعض بڑے شہروں میں عظیم اجلاس بھی منعقد ہوئے اور الحمدللہ یہ سلسلہ جاری ہے۔

اس میدان میں نمایاں طور پر مولانا اسحاق جلیس ندوی صاحبؒ نے حصہ لیا، اللہ نے ان کو اس کی بڑی صلاحیت دی تھی اور انھوں نے اس کام کے لئے اپنے وقت کے بڑے حصہ کو فارغ کرلیا تھا۔ حضرتؒ کو خاص طور سے اس کام میں ان سے بڑی تقویت ملتی تھی۔

مولانا محمد الحسنیؒ حضرت ہی کے فکر کے حامل اور ترجمان تھے، انھوں نے اور مولانا اسحاق صاحبؒ نے مل کر اس تحریک کا وہ حلف نامہ تیار کیا جو ہر طبقہ پر حاوی ہے تحریک کا تعارف کرانے کے لئے دونوں کا قلم یکساں رواں دواں تھا۔ ان دونوں حضرات کے بعد تیسری شخصیت مرحوم مولانا الحاج عبد الکریم پاریکھ صاحبؒ کی تھی جنھوں نے اس تحریک میں پوری طرح حصہ لیا اور اس میدان میں حضرتؒ کی ترجمانی کی۔ حضرتؒ نے ان کو اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

حضرتؒ نے اس سلسلہ میں بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ، پنجاب اور یوپی کے طویل طویل دورے فرمائے اور مخلوط اجتماعات کو خطاب فرمایا۔

۲۲/مئی ۱۹۷۵ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں ہزاروں مسلم وغیر مسلم تعلیم یافتہ عوام وخواص نے شرکت کی۔ حضرتؒ نے اس میں بڑی تاریخی تقریر کی جو بعد میں ''اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے'' کے عنوان سے بار بار شائع ہوئی۔ ۱۶/اپریل ۱۹۷۸ء کو سیوان میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں بڑے اہم اور تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اسی سال دسمبر میں مرادآباد کے ٹاؤن ہال میں جلسہ ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب علیگڑھ میں فسادات ہو رہے تھے اور کشیدگی تھی۔

نومبر کی آخری تاریخوں اور دسمبر ۱۹۷۷ء کی ابتدائی تاریخوں میں مدھیہ پردیش کا دورہ ہوا، اس میں بھ
اجین، دھار، دیپال پور اور مہو میں بڑے بڑے جلسے ہوئے اور اس تحریک کا زبردست استقبال کیا گیا

۳۱/مارچ ۱۹۷۸ء کو ہریانہ اور پنجاب کا اس سلسلہ میں بڑا کامیاب دورہ ہوا اور چندی گڑھ میں عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں غیر مسلموں کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔

۲۷/۲۸/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو قیصر باغ کی بارہ دری میں پیام انسانیت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حضرتؒ نے بڑی پراثر، پرجوش اور الہامی تقریر فرمائی۔

ان جلسوں اور دوروں سے ملک کی فضا پر گہرا اثر پڑا، غیر مسلم دانشوروں کے دلوں میں مسلمانوں کی وقعت پیدا ہوئی اور ان کی افادیت کا احساس ہوا اور خود مسلمانوں کو آزاد فضا میں کام کرنے کا موقع ملا۔

آج ملک کی بگڑتی ہوئی صورتحال میں اس تحریک کی افادیت وضرورت بہت بڑھ گئی ہے اور حضرتؒ کی وسعت ذہنی، بالغ نظری اور حقیقت شناسی کا ہر صاحب نظر معترف ہے کہ حضرتؒ نے ان حالات میں اسکی ابتداء فرمائی تھی جب عام طور پر لوگوں کو اسکی افادیت کا احساس بھی نہ تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

ہتھورا اور ناگور کا ایک سفر

مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ زمانہ طالب علمی ہی سے حضرت مولانا سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے، ۲۵/مارچ ۱۹۷۱ء کو حضرت ان ہی کی دعوت پر ہتھورا تشریف لے گئے، رفقاء سفر میں مولانا محمد ثانی حسنیؒ بھی تھے جو قاری صاحب کے رفیق درس اور بڑے محبّ و محبوب تھے، مولانا نے اس پورے سفر کی روداد بھی قلمبند فرمائی ہے جو خاندانی ذخیرہ میں محفوظ ہے، جس میں حضرت مولانا کی مجالس کے قیمتی افادات اور فکر انگیز اور ولولہ خیز تقریروں کے بعض اقتباسات بھی ہیں۔ سفرنامے میں حضرت مولانا سے قاری صاحبؒ کی عقیدت و محبت اور حضرت کے راحت و آرام کے لئے قاری صاحب کی فکر و اہتمام کا جا بجا اظہار ہوتا ہے۔ اس سفر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں حضرت مولانا ناگور بھی تشریف لے گئے جو حضرت کے پردادا حضرت میر عبدالعلی صاحبؒ کا مدفن ہے۔ انہوں نے وہاں کئی سال گزارے تھے اور ان ہی کی توجہ سے وہاں پہلی مسجد تعمیر ہوئی۔ کم عمری ہی میں ان کی وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ حضرت مولانا ان کی مسجد تشریف لے گئے، حاضرین سے کچھ خطاب بھی فرمایا اور قبور پر فاتحہ پڑھ کر واپس ہوئے۔

اسی سفر کے دوران حضرت مولانا کو مشرقی پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ کا علم ہوا جس کا نتیجہ تقسیم ملک کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس خبر سے حضرت مولانا کے حساس دل پر چوٹ لگی۔

مشرقی پاکستان میں لسانی وتہذیبی تعصب کا طوفان

اور حضرتؒ کی ایک اہم تقریر

دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہندوستان اور پاکستان جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان الگ ہوا اور وہاں لسانی تہذیبی تعصب کا وہ مظاہرہ کیا گیا جو صرف جارحیت

www.abulhasanalinadwi.org

ہی نہیں بلکہ جاہلیت پر مبنی تھا، اور جس کا اس اسلامی ملک میں کوئی جواز نہیں تھا۔ حضرتؒ کا دل اس کے زخموں سے چور چور ہوگیا، اس سے متاثر ہوکر حضرتؒ نے ۲۳؍مئی ۱۹۷۲ء کو کلکتہ کے ایک عظیم جلسہ میں اس المیہ پر اپنے درد دل کا اظہار کیا اور سخت زبان میں کھل کر اس جاہلیت پر تنقید کی۔ یہ تقریر بعد میں ''لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

''مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کی تاسیس

ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی تشخص کے تحفظ و بقاء کا مسئلہ اس وقت پھر خطرہ میں پڑتا نظر آنے لگا جب حکومت ہند اور خود نام نہاد مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقہ میں یہ رجحان پیدا ہونے لگا کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا ایک مشترک عائلی قانون ہو، پھر یہ خطرہ واقعات کی شکل میں سامنے آنے لگا۔ جن مسلمان علماء وقائدین نے اس خطرہ کو محسوس کیا ان میں مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ (سابق امیر شریعت بہار واڑیسہ) پیش پیش تھے، ان ہی کی تحریک اور تمام مسلمان جماعتوں، اداروں اور مدرسوں کی تائید سے ۲۷، ۲۸؍دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں ''پرسنل لا کنونشن'' بلایا گیا۔ حضرتؒ اس زمانہ میں حجاز مقدس کے سفر پر تھے اور حج کے ایام قریب تھے لیکن مسئلہ کی حساسیت ونزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے اور یہاں کے تعلق رکھنے والے علماء وقائدین کے اصرار پر حضرتؒ نے کنونشن میں شرکت فرمائی۔ اس کنونشن میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل ہوئی اور بالاتفاق حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کو اس کا صدر اور مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

حضرتؒ کو مسلم یونیورسٹی سے اس حیثیت سے ہمیشہ دلچسپی اور فکر رہی کہ وہ ملت کی ایک امانت ہے۔ یکم جون ۱۹۷۲ء کو جب لوک سبھا میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ پاس کردیا گیا اور اسکی آزادی خطرہ میں پڑ گئی تو یونیورسٹی کے بہی خواہوں نے اسکے احتجاج میں دہلی میں ۱۰، ۱۱؍مارچ کو ایک کنونشن منعقد کیا اور حضرتؒ کو اسی تعلق وفکر کی

www.abulhasanalinadwi.org

وجہ سے اس کے افتتاح کے لئے مدعو کیا؛ حضرتؒ نے اس میں اپنا افتتاحی خطبہ پڑھا جس میں صاف صاف کمیونسٹ ملکوں کی روایت کے مطابق دانش گاہوں کو اپنے انتظام میں لینے کے خلاف آگاہی دی اور واضح طریقہ پر فرمایا :

''تاریخ کا شاید سب سے بڑا سانحہ اور سیاست کی انسانیت کے حق میں سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ ذہن و اخلاق کے سرچشمہ، شخصیت و کردار کی کارگاہیں اور زندگی کی رہنمائی کرنے والے مرکز، بے رحم، بے ضمیر سیاسی مقاصد اور انتخابی مصالح کے تابع ہو جائیں۔''(۱)

افغانستان و ایران کا ایک سفر

۱۹۷۳ء میں ۴؍جون سے ۲۰؍اگست تک حضرتؒ نے رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر مشرق وسطیٰ کے چھ مسلم ممالک کا طویل دورہ فرمایا جن میں افغانستان، ایران، لبنان، شرق اردن، شام اور عراق شامل تھے۔ استاد احمد محمد جمال (سابق رکن مجلس شوریٰ سعودی عرب) اور مولانا عبداللہ عباس صاحب ندویؒ کو رابطہ ہی کی طرف سے رفاقت کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

اس زمانہ میں حضرت کو نقرس (Gout) کی شدید تکلیف تھی۔(۲)

لیکن حضرتؒ نے سفر منظور فرمالیا، اور خود حضرتؒ کے الفاظ میں ''احساس فرض احساس مرض پر غالب آیا''۔ اس سفر کی پہلی منزل افغانستان تھی، وہاں تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا۔ یہ اس ملک کا حضرت کا پہلا سفر تھا حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ ''سب

---

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۴۱

(۲) اس مرض کی ابتداء ۱۹۶۰ء ہی سے ہوگئی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کا حملہ ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی زندگی میں ہوا، حضرت اس کی وجہ سے تکلف سے چل رہے تھے، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا تو فرمایا کہ پاؤں میں تکلیف ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میاں (مولانا حکیم عبدالحی صاحب حسنی) کو بھی تھی۔ حضرت فرماتے تھے کہ بھائی صاحب نے اسی وقت کہا محمد جاؤ مطب سے فلاں دوا لے آؤ۔ میں نے دوا استعمال کی، درد زائل ہوگیا۔ پھر بھائی صاحب کی زندگی میں نہیں ہوا۔ بعد میں اس کے حملے شروع ہوئے تو دوا یاد نہیں رہی تھی۔

سے زیادہ جی افغانستان میں لگا، شاید اس وجہ سے بھی کہ یہ افغانستان کے اس دور کا جو اسلام کے داخلہ کے بعد وہاں قائم ہوا تھا دم واپسیں تھا۔'' (۱) اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد وہاں انقلاب آیا اور کمیونسٹ اقتدار قائم ہوگیا۔

حضرتؒ نے انقلاب سے پہلے ہی اس خطرہ کا احساس فرما لیا تھا اور اپنے سفرنامہ میں سردار محمد داؤد خاں کے متعلق اندیشے ظاہر کئے تھے جو بعد میں حقائق کی شکل میں سامنے آئے۔

کابل کے قیام میں دو اہم تقریریں ہوئیں؛ ایک کابل یونیورسٹی کی تقریر جو یونیورسٹی کے ہال میں ۶/جون ۱۹۷۳ء کو طلبا اساتذہ اور دانشور طبقہ کے ایک مجمع میں ہوئی۔ دوسری تقریر سعودی سفارت خانہ کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں کی گئی۔

افغانستان کے قیام میں صرف کابل اور غزنی دو ہی مقامات پر جانا ہوا۔ حکیم سنائی اور سلطان محمود غزنوی پر تشریف لے گئے۔ محمود غزنوی کی قبر پر پہنچ کر قلم سے بے اختیار یہ سطریں نکلیں :

''ہم مزار شاہی پر تصویر حیرت بنے کھڑے رہے، یہاں وہ شیر سو رہا ہے جسکی ہیبت سے افغانستان و ہندوستان کے بادشاہوں کی نیند اڑ جاتی تھی۔ آج وہ خود محو خواب ہے۔

بادشاہوں کے جاہ و حشم کے اس انجام کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب بچوں کا کھیل اور اسٹیج کی ہے ۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے بس وہی باقی بتان آزری'' (۲)

افغانستان کے پورے قیام میں پروفیسر عبد الرسول سیاف صاحب (سابق وزیر اعظم افغانستان) وفد کے رفیق و ترجمان رہے۔ شیخ صبغۃ اللہ مجددی (سابق صدر افغانستان) بھی حضرت سے بڑی محبت و عقیدت سے ملتے رہے۔

---

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۴۹
(۲) کاروان زندگی دوم ص ۱۵۳

www.abulhasanalinadwi.org

اس سفر کی دوسری منزل ایران تھی، وہاں دس روز قیام رہا۔ طہران، قم، مشہد، اصفہان، طوس اور شیراز جانا ہوا، وزراء وعلماء سے ملاقاتیں رہیں، دینی وتاریخی مقامات دیکھے۔ مجالس مذاکرہ اور استقبالیہ جلسوں میں شرکت رہی، امام غزالی شیخ سعدی، حافظ شیرازی، امام علی رضا اور خلیفہ ہارون رشید کے مزارات وقبور پر بھی حاضری ہوئی۔

لکھنؤ میں رہنے کی وجہ سے حضرتؒ اہل تشیع اوران میں خاص طور پر ''فرقہ اثنا عشریہ'' کے عقائد وخیالات سے بخوبی واقف تھے کہ وہ ذات نبوی کے مقابلہ میں اہل بیت کو اپنا مقتدا و پیشوا مانتے ہیں۔ آیت اللہ العظمٰی مرزا محمد خلیل کمرئی کی طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیہ میں حضرتؒ نے صاف صاف اس پر نقد فرمایا اور کھل کر کہا کہ :

''محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی، بنی آدم میں سے جس کو بھی سعادت وخیر کا کوئی ذرہ ملا، خواہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ کے مرتبہ کا ہی کوئی شخص کیوں نہ ہو، سیدنا محمد بن عبد اللہ ﷺ کے واسطہ ہی سے نصیب ہوا۔''(۱)

یہ واضح رہے کہ حضرت کا یہ سفر ایرانی انقلاب سے آٹھ نو سال قبل ہوا تھا اور اس وقت ظاہری طور پر اسکے آثار وشواہد نہیں تھے۔

۲۱؍جون کو یہ وفد مکہ معظمہ واپس ہوا اور وہاں پانچ ہفتہ قیام کے بعد ۲۹؍جولائی کو بیروت روانگی ہوگئی۔ اس سفر میں مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندویؒ کی جگہ پر حضرت کی معاونت ورفاقت کے لئے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کا انتخاب ہوا۔

لبنان میں

لبنان میں بیروت کے علاوہ طرابلس، سیر، صیدا تشریف لے گئے اور استقبالیہ جلسوں کو خطاب فرمایا۔ لبنان کے دارالافتاء میں مفتی لبنان شیخ حسن خالد نے

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۵۶

استقبالیہ دیا۔ اس میں مفتی امین الحسینی صاحب کے علاوہ وزیر اعظم، سابق وزیر اعظم، وزراء و عمائدین مملکت علماء و ادباء کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ حضرتؒ نے اس تقریب میں ''مسلم قوم کے کردار'' کے عنوان سے بڑی مؤثر تقریر کی اور علماء و ماہرین فقہ کو بھی ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔

عجیب واقعہ

۳/ اگست کو یہ وفد دمشق پہنچا، شام کا یہ حضرت کا چوتھا سفر تھا(۱)، وہاں کچھ روز قیام کرنے اور قدیم دوستوں اور اہل تعلق سے ملاقاتوں کا پروگرام تھا۔ سفر کی ترتیب میں حمص، حماۃ اور حلب کا بھی پروگرام تھا، اتوار کو سعودی سفارت خانہ نے استقبالیہ کا بھی اہتمام کیا تھا کہ اچانک سنیچر اور اتوار کی درمیانی شب میں عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ نصف شب میں مخابرات (سی آئی ڈی) کے لوگ ''فندق امیہ'' میں داخل ہوئے، جہاں یہ حضرات آرام فرما رہے تھے، اور حکم دیا کہ سامان باندھئے اور روانہ ہو جایئے۔ موٹر روانہ ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ لبنانی سرحد کی طرف جا رہے ہیں۔

دوسرے دن ریڈیو اخبارات میں یہ خبر نشر ہوئی اور اس پر عمومی طور پر ناپسندیدگی ظاہر کی گئی۔ بیروت میں لوگ آتے، خیریت دریافت کرتے، حیرت کرتے اور واقعہ سے دلچسپی کا اظہار کرتے۔

بغداد میں

۷/ اگست کو یہ وفد بغداد میں داخل ہوا، وہاں حکومت عراق کے مہمان کی حیثیت سے قیام ہوا۔ اس وقت عراق بھی انقلاب کی زد میں آ چکا تھا، ہر چیز پر سخت پہرے داری تھی، لوگ بھی الفاظ تول تول کر بولتے تھے۔

حکومت نے جمعہ پڑھنے کے لئے ''جامعہ شہداء'' کا انتخاب کیا تھا، جو بغداد سے کئی کلومیٹر دور ہے۔ اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ لوگ زیادہ نہ پہنچ سکیں۔ لیکن حضرتؒ

(۱) یہ وہ زمانہ تھا کہ وہاں فوجی انقلاب آ چکا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

کی آمد کی خبر لوگوں کو ہوگئی اور لوگ جوق در جوق پہونچنے لگے۔ حاضرین نے خطاب کی درخواست کی۔ ذمہ داروں کو لوگوں کی شدید خواہش کے پیش نظر اجازت دینی پڑی۔ حضرتؒ نے آیت قرآنی "لقد أنزلنا إليكم كتاباً فيه ذكركم أفلا تعقلون" (ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے، تم غور کیوں نہیں کرتے؟) کو موضوع بنا کر صاف صاف تقریر کی۔ تقریر کے بعد لوگ مصافحہ، معانقہ کے لئے ٹوٹ پڑے۔ حضرتؒ کے کان میں کسی نے چپکے سے کہا کہ "ہجوم دس گنا ہوتا اور پورا بغداد امنڈ آتا اگر حالات معمول پر ہوتے"۔ امام ابوحنیفہؒ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزارات پر بھی حاضری ہوئی۔

سفر کی آخری منزل

سفر کی آخری منزل اُردن تھی۔ ۱۳؍اگست کو وفد عمان میں داخل ہوا۔ ۱۴؍اگست کو شاہ حسین سے ملاقات ہوئی، وہ حضرت سے بڑے احترام وعقیدت سے ملے، خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا، رخصت کرنے بھی کچھ دور آئے۔ حضرت نے خطاب کرتے ہوئے پوری جرأت کے ساتھ ان سے فرمایا:

"ان معصوم روحوں کے بارے میں خدا سے ڈریئے، جنھوں نے ابھی عالم اجسام میں قدم نہیں رکھا، اگر آپ نے ان کی مقدس اور قابل احترام چیزوں کی حفاظت کی اور انہیں ایک تابناک ماضی عطا کیا، تو وہ آپ کی ممنون ہوں گی اور اگر آپ نے ان مقامات مقدسہ کو کھو دیا اور ان کے لئے ذلت و رسوائی کا ترکہ چھوڑا تو وہ بارگاہ خداوندی میں فریاد کریں گی۔"(۱)

مختلف مقامات پر حضرتؒ کے خطابات ہوئے۔ عمان کے قریب اس غار کو بھی دیکھا جس کے بارے میں آثار قدیمہ کے ماہر رفیق وفا دجانی کی تحقیق ہے کہ وہ اصحاب کہف کا غار ہے۔ شہدائے موتہ کے مزارات پر بھی حاضری ہوئی۔

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۲۶

www.abulhasanalinadwi.org

اس سفر کا سب سے اہم واقعہ یہ ہوا کہ حضرتؒ کو سرحد پر سعودی فوجی مرکز کا معائنہ کرنے اور خطاب کرنے کی دعوت دی گئی، اس کو حضرت ہی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے۔

زندگی کا ایک پراثر منظر

''میری زندگی کا بڑا اہم واقعہ اور دل پر گہرا اثر ڈالنے والا وہ منظر تھا جو ۱۹؍اگست ۱۹۷۳ء کو پیش آیا؛ ہمیں موقعہ دیا گیا کہ اس سعودی فوجی مرکز کا معائنہ کریں جو سرحد کی حفاظت کے لئے متعین ہے اور ان فوجیوں سے خطاب بھی کریں، جب یہ مسلح نوجوان صف بستہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق ہم کو سلامی دی تو جسم میں عزم و ایمان اور سرخوشی اور سرشاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور طرب و اہتزاز کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی، آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے زبان دہن کے بجائے زبان دل سے گفتگو کی۔'' (۱)

اس طویل دورہ کا سفر نامہ حضرتؒ نے عربی میں تیار فرمایا اور اس کا نام ''من نهر كابل إلىٰ نهر يرموك'' رکھا۔ اردو میں ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' کے عنوان سے اس کا ترجمہ شائع ہو کر مقبول ہوا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی خاص طور پر اسکے بڑے معترف و مداح تھے اور اپنے اہل تعلق کو اس کے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ''اس کتاب کو واشنگ کے ساتھ پڑھنا چاہئے''۔

خلیج کے دو سفر

جنوری ۱۹۷۴ء کو حضرت نے رابطہ کے اجلاس میں شرکت فرمائی اور اس مرتبہ بھی حج سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں حاکم شارقہ شیخ سلطان القاسمی کی خصوصی دعوت پر شارقہ، دبئی اور ابوظبی کا ایک مختصر سفر ہوا۔ حضرتؒ کے بھانجے مولانا واضح رشید ندوی

---

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۶۶

www.abulhasanalinadwi.org

صاحب اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) ساتھ تھے۔ اس سفر میں خاص طور پر دو تقریریں اہم ہیں؛ ایک مسجد علی بن ابی طالب میں "خليج بين الاسلام و المسلمين" کے عنوان سے ہوئی اور دوسری دبئی کی پبلک لائبریری میں "كيف دخل العرب التاريخ" کے موضوع پر کی گئی، اوراس میں عمائدین شہر اور علماء وفضلاء کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔

۱۹۷۶ء میں پھر ان ہی دونوں رفیقوں کے ساتھ خلیج کا سفر ہوا۔ ابوظبی کے دیوان امیری میں ۲۳/دسمبر ۱۹۷۶ء کو ایک اہم اور یادگار تقریر ہوئی جس کا عنوان تھا "نظرة مومن واع إلىٰ المدنيات المعاصرة" (ایک صاحب شعور مسلمان موجودہ تہذیبوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے)۔

شاہ فیصل کی شہادت اور حضرت کا تأثر

سعودی حکومت کے فرمانروا شاہ فیصل مرحوم حضرت سے اسی وقت سے محبت و عقیدت رکھتے تھے جب وہ ولی عہد تھے۔ انہوں نے حضرت کے دعوتی رسائل اور بعض اہم تصانیف کا مطالعہ بھی کیا تھا، حضرت کو بھی ان کی حمیت دینی اور بصیرت پر اعتماد تھا۔ مختلف ملاقاتوں اور مکاتیب میں حضرت نے ان کے سامنے صحیح اسلامی حکومت کا نقشہ پیش کیا تھا، عالمی سطح پر اسلامی بیداری پیدا کرنے کی تدابیر انکو بتائی تھیں اور حرمین شریفین کی تولیت کی نسبت سے ان کی ذمہ داریاں ان کو یاد دلاتے رہتے تھے، حضرت کو ان سے بڑی امیدیں تھیں کہ ۲۵/مارچ ۱۹۷۵ء کو اچانک ان کو شہید کر دیا گیا، حضرتؒ پر اس خبر سے وہ اثر پڑا جو کسی قریبی عزیز کے حادثہ وفات پر نہ پڑا ہوگا۔

www.abulhasanalinadwi.org